اردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

# ارمغانِ ابتسام

جنوری ۲۰۱۶ء تا مارچ ۲۰۱۶ء

مدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

جنوری ۲۰۱۶ء تا مارچ ۲۰۱۶ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد
روبینہ شاہین
محمد امین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت
mudeer_ai@yahoo.com

# کیا کیا کہاں کہاں


## اداریہ

سرگوشیاں ۹
نوید ظفر کیانی

## پرانے چاول

سوری رانگ نمبر ۱۰
عزیز ذوالفقار

## قندِ شیریں

تصویر کے ہر رنگ میں ۱۷
نادر خان سرگروہ

ادھورا خواب ۲۱
وسیم شہزاد

اُس بازار میں ۲۳
فہد خان

میں، پشاور اور رکشہ ڈرائیور ۲۷
سکندر حیات بابا

مہمانِ خصوصی ۲۹
سید عارف مصطفیٰ

شعریت ۳۵
مزمل حسین چیمہ

لندن میں سالِ نو کی شب ۳۷
ارمان یوسف

پندرہ منٹ کی اہمیت ۳۹
حماد احمد

احمق آباد ۴۱
ذہین احمق آبادی

خوشی کی مٹھائی ۴۶
نعیم طارق

بابائے شادیات ۴۸
شوکت علی مظفر

شادی کیے بغیر ۵۰
میم سین بٹ


وہ دل میں گھس رہے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں
کہ سنگاپور میں جاپان داخل ہوتا جاتا ہے
(ظریف دہلوی)

سرگودھا ۵۲
عثمانی بلوچ

واٹر پمپ مارکیٹ ۵۴
پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

شیخ جی کی موٹر سائیکل ۵۷
محمد ایوب صابر

گجب کہانی ۵۹
کے ایم خالد

ڈائری کے دو ورق ۶۱
شفیق زادہ ایس احمد


## غزلیات


**ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی**
جو آئیں سسرالی گھر زیادہ ۶۴
جب گھر میں نہ ہو کھانے کا سامان وغیرہ ۶۴

**تنویر الدین احمد پھول**
اب ادب کی محفلوں میں دل لگی ہونے لگی ۶۵
دیکھ کر یار مجھ کو ہوا ہو گیا ۶۵

**عبدالحکیم ناصف**
انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا ۶۶
جو بیٹھے لوگ ہیں مستانے تھوڑی ہوتے ہیں ۶۶

**عرفان قادر**
شہروں میں چار سمت نہ گرد و غبار دیکھ ۶۷
کیا غم ہے اگر بے تکے دیوان بہت ہیں ۶۷

**ڈاکٹر عزیز فیصل**
کیوں میں اُن اہلِ قلم کے بھی لکھوں نام ابھی ۶۸
ملی دانش جنہیں دانشوروں سے ۶۸

**نور جمشید پوری**
دے کے دعوت بلا کے دیکھ لیا ۶۹
حالانکہ سر کھپاتے رہے تھے کتاب میں ۶۹

**نوید صدیقی**
شعر جس نے بھی کہہ دیا یونہی ۷۰
بیویوں کی نگہ خام سے جل جاتے ہیں ۷۰

**اعظم نصر**
عشق بیچارہ سوالی، العجب ۷۱
یہ جو وعدہ خلافی ہے ۷۱

**شاہین فصیح ربانی**
وہم تھا، بات کی ضرورت ہے ۷۲
مار سکتے نہیں ہیں بلی آپ ۷۲

**نوید ظفر کیانی**
شاعر بنے تو ساتھ ہی نقاد ہم ہوئے ۷۳
کب کسی کو رہنما درکار ہے ۷۳

**روبینہ شاہین بینا**
کہنے کو تو آفس میں وہ ذیشان بہت ہے ۷۴
وہ بلائیں تو کیا تماشہ ہو ۷۴

**سید فہیم الدین**
کبھی اقرار منٹوں میں، کبھی انکار منٹوں میں ۷۵
مزاج اُن کا ذرا سا مضمحل ہونے ہی والا ہے ۷۵

**اقبال شانہ**
چلو گی گرمی جانِ جگر آہستہ آہستہ ۷۶
محبت میں حد سے گزرنے لگے ہیں ۷۶

محمد ظہیر قندیل
پہلے تو وہاں آگ لگا اُن کی گلی میں ۷۷
باس جن کے قریب ہوتے ہیں ۷۷
عاجز سجاد
جس کی صورت لگے جواری ہے ۷۸
ہاشم علی خان ہمدم
نہ روٹی یاد رہتی ہے نہ کھانے یاد رہتے ہیں ۷۸
محمد شہزاد قیس
چائے میں بسکٹ گرا تو دل کا دورہ پڑ گیا ۷۹
عثمانی بلوچ
نکل کے آئی ہو وردی کباڑ خانے سے ۷۹
مزمل حسین چیمہ
ہٹا کے پردے بھی کہتا ہے کہ پردہ ہے ۸۰
منیر انور
میں شاگرد تھا بھولا بھالا وہ چالاک استانی تھی ۸۰
خاورؔ
فیس بک پر اُس سے یاری ہوگئی ۸۱
اسلام الدین
جب تلک جسم میرا چھو نہ گیا ۸۱
شوکت جمال
پیارا ہے مجھے دل، یہ مری جان غلط ہے ۸۲
شہباز چوہان
گر سب سوچیں سچی ہوتیں تو پھر رنگ نرالے ہوتے ۸۲
نسیم سحر
محبت میں نہ کچھ ایسی پریشانی نکل آئے ۸۳
طاہر محمود
جو تو نے پتھر اُٹھا کے مجھ کو کبھی بھی مارا، تو میں تمھارا ۸۴
ریاض احمد قادری
ملی ہے لیلیٰ کو ساری طاقت ہوا ہے بے اختیار مجنوں ۸۴
عتیق الرحمٰن صفی
اب ہیں نادم سا ہر تقصیر پر ۸۵
نشتر امروہوی
ایسی آفت گلے میں پڑی خواہ مخواہ ۸۵
احمد علوی
ہوئی خستہ بیگم سیم تن، تیری شان جل جلالہٗ ۸۶
ڈاکٹر جاوید پنجابی
پھولتی جا رہی ہو سر تا پا ۸۶

## ولائتی زعفران

نوید ظفر کیانی
اس طرح تو ہوتا ہے (پہلا ایکٹ) ۸۷

## سفرنامہ

محمد خلیل الرحمٰن
جیون میں اِک بار آنا سنگاپور (دوسری قسط) ۱۰۶

## نظمیں

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی
بچپن کے دن ۱۱۰
اسی گھر میں ۱۱۱
عبدالحکیم ناصف
ماڈرن الیکٹرلیس وائف ۱۱۲
اُدھیڑ عمر کا خواب ۱۱۳

دو سیر باجرے کا ملیدہ اُڑا گئے لالہ کا پیٹ کیا ہوا گودام ہوگیا (بیڈھب بدایونی)

**محمد عارف**
اے کی فریاد ۱۱۵
**ڈاکٹر نشتر امروہوی**
نان گوشت ۱۱۶
**شوکت جمال**
یہ سارے ایک جیسے ہیں ۱۱۷
**شاہد عدیلی**
حساب برابر ۱۱۸
تین بڑوں کا خواب ۱۱۹
**شہباز چوہان**
تحفہ ۱۲۰
**روبینہ شاہین بینا**
دسمبر آ گیا ہے ۱۲۱
**ڈاکٹر سعید اقبال سعدی**
نایاب مولوی اور وکیل ۱۲۲
ساس اور بہو کی ڈیمانڈ ۱۲۳
**اعظم نصر**
محبت اور زندگی کی تین نظمیں ۱۲۴
**ڈاکٹر عزیز فیصل**
منتشر نگار ۱۲۵
**نوید ظفر کیانی**
ڈاکٹر عزیز فیصل ۱۲۶
**غضنفر علی**
جب لاد چلے گا بنجارہ ۱۲۷
**انجینئر عتیق الرحمٰن**
سیاست کی کہانی ۱۲۸

## افسانچے

**اسد قریشی**
مجموعۂ کلام ۱۲۹
**ارشاد العصر جعفری**
زمانہ ظالم ہے ۱۳۲
**کائنات بشیر**
انوکھا لاڈلا ۱۳۴
**خادم حسین مجاہد**
مزید شوخیاں ۱۳۸

## قلم اور کالم

**میم سین بٹ**
مونچھوں کے فائدے اور نقصانات ۱۴۷
**سلیم فاروقی**
وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ ۱۴۹

## لمرکے

**نوید ظفر کیانی**
ہوشیار باش ۱۲
عجلت ۱۸
خراٹے ۳۴

## قطعات

**نوید ظفر کیانی**
اپنا موبائل ۱۹
نقطہ ۲۶
طبی مشورہ ۶۰

رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی    بلاحجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو    (عنایت اللہ حجام)

سیاستدان ۸۸
شجر ۹۷
آج کل کی دوستی ۱۰۳
ہمارے ہوٹل ۱۵۶
پی آر ۱۵۶

**محمد عارف**

سندیسہ ۱۵۱
نقطہ ۱۵۱
پریس کانفرنس ۱۵۱
خوش فہمی ۱۵۱

**ڈاکٹر عزیز فیصل**

واردات ۱۵۲
لیپ کا سال ۱۵۲
خانگی مصلحت ۱۵۲
صدرِ تقریب ۱۵۲

**ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی**

غلط تشخیص ۱۵۲
آشوبِ چشم ۱۵۲
انٹرنیٹ ۱۵۳
خوش قسمت ۱۵۳
آسان نسخہ ۱۵۳
پری ۱۵۳

**سید فہیم الدین**

کرلوگل ۱۵۳
مرـ دانگی ۱۵۳
لڑکھڑاہٹ ۱۵۴
UN ـ جام ۱۵۴

**تنویر پھول**

میٹھا پان ۱۵۴

ساس اور داماد ۱۵۴
شیر کی داڑھی ۱۵۴

**محمد ظہیر قندیل**

شکر ۱۵۴
الیکشن میں ۱۵۵
چھوٹے میاں ۱۵۵

**عبدالحکیم ناصف**

مشتری ہوشیار باش! ۱۵۵
شادی مبارک ۱۵۵

**حماد حسن**

المیہ ۱۵۶
امرِ حقیقی ۱۵۶

**مرزا عاصی اختر**

جیسی کرنی ویسی بھرنی ۱۵۶
حقِ ہمسائیگی ۱۵۶

**روبینہ شاہین بینا**

نظر لگتا ہے ۱۵۶
خان ۱۵۶


## سہ ماہی کی کتاب


**نوید ظفر کیانی**

مزاح کے سر پر ۱۵۷


## خاکے


**سید ممتاز علی بخاری**

بت در دسعید ۱۶۱

**سید بدر سعید**

منٹو جیسے باباجی ۱۶۴

## شکر پارے

**سید ظفر کاظمی**

گدھا ۱۶۶

**راشد حمزہ**

قیامت کا نامہ ۱۶۷

**وسیم گل**

اور گالیاں دو! ۱۶۹

**عامر راہداری**

کھوتی ۱۷۰

**طاہر محمود**

روداد محبت کیا کہیے ۱۷۱

**اعظم نصر**

دانشور ۱۷۲

**محمد خلیل الرحمٰن**

پاکستان اور امریکہ ۱۷۳

**پرنس زریاب شیخ**

خواب اور انسان کی اوقات ۱۷۴

## یہ نامے

انجینئر عتیق الرحمٰن ۱۷۵

احمد علی برقی اعظمی ۱۷۵


اُس کا ابا رشتہ دینے سے انکاری ہے پھر بھی اُس نے کھڑکی سے منہ کڈا ہوتا ہے (ڈاکٹر اسامہ اسد)

# شر گوشیاں

وقت ایک ایسا اسپ سرمست ہے جو اپنی دلکی سے سرپٹ دوڑے جاتا ہے، اس سے ''موڑ مہاراں'' کی فرمائش عبث ہے لیکن پھر بھی انسانی فطرت ہے کہ ''کھیلن کو مانگے چاند''، اور انسان بھی وہ مخلوق جسے شاعر ہونے کا عارضہ بھی لاحق ہو، گویا جلتی پر تیل چھڑکنا ہوا چنانچہ اکثر شعراء نظامِ فطرت سے آشنائی رکھنے کے باوجود ایسی ایسی خیالات کا اظہار فرما دیتے ہیں کہ بس دیکھا کیجئے۔

اب دسمبر کو ہی لے لیجئے۔ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہ JULIAN اور GREGORIAN کلنڈر کے حساب سے ہر سال کا آخری یعنی بارھواں مہینہ ہوتا ہے اور سال کے اُن سات مہینوں میں شامل ہے جس میں ملازمین کو ایک دن زیادہ کام کرنا پڑتا ہے یعنی یہ اکتیس دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعروں کے لئے اس مہینے میں کوئی پراسراریت نہ تھی اور اُن کی صحت پر اس مہینے کے آنے جانے سے کوئی خاص اثرات مرتب نہ ہوتے تھے لیکن جب سے ''اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' نامی نظم شائع ہوئی ہے، تب سے کچھ ایمرجنسی سی نافذ ہو گئی ہے۔ تمام شاعروں پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ اِس مہینے صفِ ماتم بچھا دیں، ایسا رونا دھونا کریں کہ بادل بھی اپنی کم مائیگی پر شرما جائیں۔ دنیا میں طوفانِ بادو باراں کے بہت سے مراکز سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں، شاعری کے ساتھ ساتھ عزت یعنی ''ناک'' سے بھی اشک فشاں ہونے لگتی ہے جس کا خمیازہ محض شعراء پر ہی نہیں گرتا بلکہ مہاترّ (تیرے میرے جیسے) بھی اس کے صید بنے پھرتے ہیں۔

''اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' اُردو شاعری کا ایک تاریخ ساز موڑ ہے جب عرش صدیقی (مرحوم) نے اپنی بیٹی کی وفات سے مغلوب ہو کر یہ نظم لکھی تھی جو دسمبر کی یخ بستگی کا شکار ہو گئی تھی۔ عرش صدیقی (مرحوم) ملتان میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ بہت ہی نفیس وضع قطع کے انتہائی ملنسار انسان تھے۔ خدا اُنہیں غریقِ رحمت کرے۔ اُن کی اس نظم کے ساتھ ہی شاعروں نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا کہ دسمبر جدائی کی علامت ہے اور اگر اس ماہ فرقت کو سوکھا گزر جانے دیا جائے تو تف ہے ہماری شاعری پر، چنانچہ دسمبر کے آتے ہی سب کی شاعری دھواں چھوڑنے لگتی ہے۔ کسی نے اگر دسمبر پر طبع آزمائی نہیں کی تو گویا زیاں کار رہا۔

خدا جانے دسمبر کا محض یہی حوالہ کیوں رہ گیا ہے۔ اسے وقت کے دو برسوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ کیوں تصور نہیں کیا جاتا۔ اس ماہ کو اپنے اعمال نامے کے مطالعے کا مہینہ کیوں نہیں جانا جاتا۔ ویسے اگر دسمبر کے ماخذ کی بات کی جائے تو یہ لاطینی لفظ DECEM سے اخذ شدہ ہے جس کا مطلب ''دسواں'' ہوتا ہے۔ رومن کلنڈر کے مطابق یہ سال کا دسواں مہینہ ہے۔ رومن کلنڈر کا مہینہ مارچ سے شروع ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم پر اور شاعروں پر عموماً جبکہ دسمبر پر خصوصاً رحم فرمائے، آمین۔

احقر

نوید ظفر کیانی

عزیز ذوالفقار

# سوری رانگ نمبر

جن لوگوں کے دفتر یا گھر میں بدقسمتی سے فون لگا ہوا ہے انہیں اِن جادو بھرے الفاظ سے روزانہ کئی مرتبہ واسطہ پڑتا ہے۔ بعض حرماں نصیب تو سارا دن'' سوری، رانگ نمبر'' کی گردان ہی کرتے رہتے ہیں۔ محکمہ ٹیلیفون بھی اُن پر خاص طور پر مہربان ہوتا ہے۔ ایک دو مرتبہ تو معمولی بات ہے، صحیح نمبر ملانے کے لئے کئی دفعہ ڈائل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب مہینے کے بعد فون کا بل آتا ہے تو تمام رانگ نمبروں کا جرمانہ بھی اُس بل میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اُن مغلظ گالیوں کے علاوہ ہوتا ہے جو شرفاء کو تنگ کرنے کے عوض پڑتی ہیں۔ ٹیلیفون گوناگوں دلچسپیوں کا حامل ہے۔ مثلاً فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اُٹھایا تو آواز آئی -- آپ ۲۲۲۲ سے بول رہے ہیں!؟

سوری رانگ نمبر۔۔۔

ایک صاحبہ کا فون آیا۔ پوچھنے لگیں! آپ ۴۳۱۰ سے بول رہے ہیں؟

نہیں محترمہ! یہ ۴۳۱۱ ہے!!

پھر ذرا تکلیف کریں۔۔۔ اپنے پڑوسیوں میں سے کسی کو بلا دیں۔

ایک روز ڈاکٹر کو فون کیا اور پوچھا ڈاکٹر صاحب ہیں؟ جواب ملا۔۔۔ معاف کرنا ہم سبزی منڈی سے بول رہے ہیں، پھر سوری رانگ نمبر کہہ کر جان چھڑائی۔

آپ اپنے بچے کے اسکول فون کرتے ہیں مگر نمبر شفاخانہ حیوانات سے جا ملتا ہے۔ سول لائن میں ایک عزیز سے بات کرنا چاہی تو بار ہا پولیس لائن ہی ملتی رہی۔ ایک دن اپنی بیگم کو اُس کی خالہ کی وفات کی اطلاع دینے کے لئے گھر فون کیا تو ایک اجنبی نسوانی آواز سُنائی دی۔ ہم نے اپنی بیگم کے متعلق استفسار کیا تو جواب میں ''سوری رانگ نمبر'' سنائی دیا اور فون بند ہو گیا۔

دوبارہ کوشش کی تو وہی محترمہ بولیں۔۔۔ اس دفعہ اُن کی آواز میں خاصی خفگی تھی پھر سوری رانگ نمبر کہتے ہوئے غصے سے فون کا ریسیور پٹخ دیا۔ تیسری مرتبہ جو ڈائل کیا تو کافی دیر کے بعد وہی تلخ آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے معذرت کرنا چاہی تو اُن معزز خاتون نے بے نقط سُنانی شروع کر دیں۔

تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے ؟ ''کمینے ذلیل'' وغیرہ۔۔۔ میں نے انتہائی صبر کے ساتھ تمام خرافات سُنیں۔ پھر جب اُس نے سانس لینے کے لئے گفتگو ایک لمحے کے لئے بند کی میں نے نہایت انکساری سے عرض کیا۔۔

''اے محترم خاتون! میں ایک عزت دار آدمی ہوں، اپنی بیگم کو اُس کی اکلوتی خالہ کے انتقال پُر ملال کی خبر سُنانا تھی مگر محکمہ ٹیلیفون کی ستم ظریفی کی بدولت آپ سے گالیاں بھی کھائیں، بے عزت بھی ہوا، مگر اپنی بیگم کو یہ منحوس خبر نہ سُنا سکا۔ آپ بے شک اور گالیاں دے لیں لیکن خدا کے لئے ذرا میری بیوی کو فلاں نمبر پر

فون کر کے یہ اطلاع دے دیں۔ میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں گا۔" یہ سُن کر وہ محترمہ پسیج گئیں اور پھر معذرت کرتے ہوئے میری بیگم کو مطلع کرنے کی حامی بھر لی۔

تھوڑی دیر بعد میرے فون کی گھنٹی بجی تو ہماری بیگم انتہائی غصیلی آواز میں بولیں میں پوچھتی ہوں وہ گشتی کون تھی جس کے ذریعے اب پیام بازی ہو رہی ہے؟

"میری خالہ فوت ہوگئی تھی مگر تمہاری زبان تو سلامت تھی۔۔اُس اپنی کچھ لگتی کو کیوں زحمت دی؟"

میں یہ سُن کر سکتے میں آگیا۔اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اُس نیک سیرت عورت نے تو مجھ پر احسان کر کے میری مشکل آسان کی تھی اور بجائے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے ہماری بیگم نے اُسے بھی ضرور کچھ نہ کچھ کہہ ڈالا ہوگا۔ آخر ہم نے گھر جا کر بڑی مشکل کے بعد بیگم کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کر کے اُس کی غلط فہمی دور کی۔

ایک روز ہمارے ایک دوست کی دوکان میں آگ لگ گئی۔فوراً فائر بریگیڈ کو فون کیا اور آگ بجھانے کی درخواست کی۔جواب ملا۔۔۔"اگر ناراض نہ ہوں تو دوبارہ فون کریں کیونکہ یہ پٹرول پمپ ہے، یہاں آگ بجھانے کا نہیں آگ لگانے کا بندوبست ہے۔"

کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نمبر ملانے کے لئے فون اُٹھایا اور پہلا نمبر گھمایا تو فون پر لوگوں کی گفتگو سُنائی دینے لگی۔پھر کوشش بسیار کے باوجود اس گفتگو سے چھٹکارا نہ حاصل کیا جا سکا۔بعض اوقات تو کئی کئی روز تک یہ تماشا چلتا رہتا ہے اور مختلف قسم کی باتیں فون پر سُنائی دیتی رہتی ہیں۔ہم آپ کو اُن باتوں کے چند نہایت دلچسپ نمونے سنا سکتے ہیں لیکن سنائیں گے نہیں کیونکہ یہ باتیں راز کی ہیں۔کوئی بیوی اپنے خاوند کو کھری کھری سُنا رہی ہے،کوئی بولنے والی کسی بولنے والے سے راز و نیاز اور کہیں دور ملنے کے وعدوں پر دل پرچا رہی ہے،کوئی آڑھتی کسی دوسرے آڑھتی کو بلیک کے نرخ بتا رہا ہے اور یہ سب لوگ محکمہ فون کے اعتماد پر راز کی باتیں کرتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ اُن کے فون کی تاروں کے کہیں پیچ لڑ گئے ہیں اور اُن کی راز کی باتیں سارا زمانہ سُن رہا ہے۔

اس کا سب سے افسوسناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ چند لوگوں کو مغلظ اور گندی گالیاں سنا کر ایک خاص قسم کی فرحت محسوس ہوتی ہے۔اور وہ فون پر بڑی فراخدلی سے فحش اور لچر گفتگو ایسی عورتوں سے کرتے ہیں جنہیں وہ جانتے تک نہیں۔ایسے بے حیا اور بدکردار لوگوں کو محکمہ فون کے انجینئر بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔

اِس معاملے میں صفِ نازک بھی کسی سے پیچھے نہیں ،بعض آزاد خیال اور شریر لڑکیاں دن کے وقت مختلف لوگوں کو فون کر کے پریشان کرتی رہتی ہیں۔لڑکیاں اپنی مرضی کے بھولے بھالے شکار کو ڈھونڈ کر اُن پر دلچسپ فقرے چست کرتی ہیں۔پھر بڑے رومانٹک لہجے میں جھوٹی محبت کا دم بھرتی ہیں اور شرفاء سے دل لگی کر کے یا پھر اُن کا مذاق اُڑا کر روحانی تسکین حاصل کرتی ہیں۔ اگر بھولے پنچھی کے بجائے کوئی منجھا ہوا شکاری مل جائے تو پھر یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا ہے اور بعض اوقات دل لگی کی حدود سے نکل کر سنجیدگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے نتائج اکثر عبرتناک ہوتے ہیں۔

ایسی بیٹیوں کے باپ ہمیشہ محکمۂ فون کو کوستے رہتے ہیں کہ بل اتنا ہوشربا بھیج دیا ایسے مظلوم باپوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بل اُس وقت اُن کے گھر میں بنتے ہیں جب وہ دفتر جا چکے ہوتے ہیں۔خرافات اکثر اُن فونز پر چلتی ہے جن کے بل سرکارِ پاکستان ادا کرتی ہے۔

ہمارے ایک دوست اقبال صاحب بی-اے فائنل کی تیاریاں بڑے زور وشور سے کر رہے تھے،وہ اپنی کوٹھی واقع لارنس روڈ لاہور کے لان میں بیٹھ کر ہر روز صبح سے شام تک پڑھائی میں منہمک رہتے۔ایک دن وہ حسبِ معمول پڑھائی میں محو تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ملازم اُس وقت موجود نہ تھا لہٰذا اقبال کو خود ہی ریسور اُٹھانا پڑا،فون اُٹھا کے کہا۔۔۔ہیلو۔۔۔دوسری جانب سے بڑی ہی سُریلی آواز میں کوئی لڑکی بولی۔۔۔۔مس شہناز کو بلا دیجئے۔

"سوری رانگ نمبر" کہہ کر فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجنے لگی۔فون اُٹھایا تو وہی محترمہ بولیں۔۔"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"جہنم سے"۔۔۔اقبال نے اُس کی آواز پہچانتے ہوئے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"وہاں کیسے پہنچ گئے"۔۔۔نسوانی آواز نے پوچھا۔

"فرمایئے بندہ کیا خدمت کرسکتا ہے؟"

"آپ کا نمبر کیا ہے؟"

"میں کوئی بس یا ٹرک نہیں جس کا کوئی نمبر ہو۔۔۔"

"آپ بڑے بدتمیز ہیں۔۔۔"

"اوہو۔۔۔تو آپ میرے نام سے بھی واقف ہیں۔۔۔"

"اب میں سمجھ گئی کہ آپ جہنم کیوں گئے تھے؟"

"جی ہاں صحیح سمجھا ہے آپ نے۔۔۔اب اجازت دیں شکریہ"۔۔۔اور فون بند کردیا۔

اگلے روز تین بجے پھر فون کی گھنٹی بجی، اقبال نے فون اُٹھایا تو وہی نسوانی آواز سنائی دی (مسکراہٹ کے لہجے میں ) آداب عرض۔۔۔کہا۔

"سوری رانگ نمبر۔۔۔"

"ٹھہریئے سوری رانگ نمبر، فون بند نہ کریں۔۔۔"

"فرمایئے۔۔۔"

"اگر بارِ خاطر نہ گزرے تو ایک سوال پوچھوں۔۔۔"

"پوچھیئے۔۔۔۔۔۔"

"جہنم میں کب تک ٹھہرنے کے ارادے ہیں؟"

"جب تک کوئی پیاری سی حور الاٹ نہیں ہو جاتی۔۔۔"

"حور کب الاٹ ہوگی؟"

"سروے تو ہو چکا ہے اُمید ہے کام جلد ہی بن جائے گا۔"

"آپ تو بڑے رنگین مزاج ہیں۔۔۔"

"یہ سب حضور کی سحر کاریوں کا اثر ہے۔۔۔بہت بہت شکریہ اب اجازت دیں۔"

آدھا گھنٹے کے بعد پھر اُسی نازنین کا فون آیا۔۔کہنے لگی۔۔۔"دوبارہ تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں۔"

قہرِ درویش بر جانِ درویش۔۔۔"فرمائیں؟"

"بی-اے کے بعد کیا ارادے ہیں؟"

"کوئلوں کی دلالی کا پروگرام بنا رہا ہوں۔"

"جہنم میں رہ کر آپ کو اس کا خاصہ تجربہ ہو چکا ہوگا۔"

"جی ہاں اسی لئے تو یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"اگر آپ کسی سینما کے باہر ٹکٹیں بلیک کریں تو زیادہ فائدہ

ہوسکتا ہے۔"

"آپ کی تجویز تو خوب ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ پولیس والا واقف نہیں، اور پھر باکسنگ کے فن سے بھی ناآشنا ہوں۔"

"تو پھر انارکلی میں دانتوں کا منجن یا مولی نمک فروخت کریں، نفع بخش رہے گا۔"

"دیکھیے محترمہ۔۔۔ میری سمجھ نہیں آتی کہ آپ میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہی ہیں۔"

"میں حیران ہوں آپ میری تجاویز کو ٹانگ اڑانا کیوں خیال کرتے ہیں۔"

"باز آئے ایسی محبت سے اُٹھالو پاندان اپنا۔۔۔"

"تو ہماری بلا سے۔۔۔ آپ جہنم میں ہی سڑتے رہیں۔"

"بہت بہتر۔۔۔"

"اور ہاں آئندہ بھی اس ناچیز کو درگزر ہی فرمایا جائے" اور فون بند ہوا۔

تیسرے روز میرا دوست اُس شریر لڑکی کے فون آنے کی وجہ سے سخت عاجز آچکا تھا اور سوچنے لگا کہ آئندہ کیسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی وہ سخت غصّے کے عالم میں گیا اور فون اُٹھا کر کہنے لگا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔۔۔ میں یہ بے ہودگی برداشت نہیں کرسکتا۔"

دوسری طرف سے بے حد کھردری مردانہ آواز سُن کر وہ بدحواس ہوگیا، وہ صاحب اُس کے والد کے دوست تھے اور اُنہی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ میرے دوست نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں سوری رانگ نمبر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

گھنٹی دوبارہ ہوئی تو اُس کو اپنی حماقت کا خیال آیا۔ ملازم کو فون سُننے کا کہہ کر خود لان میں چلا گیا۔ اُس کے بعد اُس لڑکی کا فون بھی کبھی نہیں آیا۔

ایک صاحب کے گھر فون آیا اور ایک غیر مانوس آواز سُنائی دی "دیکھیے صاحب میں قاضی فخر اسلام بول رہا ہوں، کل بعد دوپہر آپ کی بیگم صاحبہ خود کار چلا رہی تھیں۔ وہ سمن آباد مین روڈ پر جاتے ہوئے کار کا کنٹرول نہ سنبھال سکیں اور میری گاڑی جو وہاں ایک جانب کھڑی تھی اُس سے آٹکرائیں۔ اس سے میری گاڑی کی بیک سائیڈ بری طرح پچک گئی، دونوں بتیاں اور پچھلا شیشہ بھی ٹوٹ گیا اور بمپر کو بھی شدید نقصان پہنچا۔"

"آپ کیسے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میری ہی بیگم تھیں؟"

"آپ کا فون نمبر اُنہوں نے ہی دیا تھا اور اُنہوں نے اپنی غلطی تسلیم بھی کرلی تھی۔"

اُس بیگم کے خاوند نے حیران ہوکر پوچھا۔۔۔ "کیا میری بیگم نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔"

بیگم کے خاوند بولے۔۔۔ "اوہو، پھر تو سوری رانگ نمبر"۔۔۔ اور فون بند ہوگیا۔

ایک سِکھ فون آپریٹر ڈیوٹی پر تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ سِکھ نے فون اُٹھایا اور "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔۔۔ "کرنل جان سپیکنگ دس سائیڈ۔ ہو از سپیکنگ دیٹ سائیڈ۔"

یہ انگریزی سُن کر سِکھ گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اب انگریزی میں ہی نام بتانا پڑے گا۔

چنانچہ وہ بولا۔۔۔ "تھوزینڈ اسنگھ شارپ دس سائیڈ۔۔۔"

سکھ کا نام ہزارہ سنگھ تیکھا تھا۔

ایک صاحب نے رات کے وقت کسی عزیز کو فون کیا۔۔

اُدھر سے آواز آئی "ہیلو!"

"کون صاحب ہیں؟"

"ہیلو۔۔۔"

"بھائی کون بول رہے ہیں؟"

"آواز نہیں آرہی ذرا اونچا بولیں۔۔۔"

"کیا شمسی صاحب موجود ہیں؟"

"اجی حضرت۔۔۔ ذرا اونچا بولیں۔۔۔۔۔"

(اور بلند آواز سے) کہا گیا۔۔۔ "شمسی صاحب سے

## شاعروں کی کالونی

شاعروں کی نمائندہ ایک تنظیم کی طرف سے شاعر کالونی کی تجویز یا مطالبہ فیس بک پر نظر سے گزرا۔ خود بھی کرائے کے مکان میں رہتا ہوں اس لئے پہلی نظر میں یہ مطالبہ اچھا لگا۔ پھر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا۔۔۔ "یار، کم از کم دانشور طبقے کے مطالبات تو ذاتیات سے آگے بڑھتے ہوئے قومی اور اجتماعی ضروریات کے مطابق ہونے چاہئیں۔" یوں بھی شاعروں کی تعداد دیکھتا ہوں تو یہ مطالبہ پورا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ حکومت شاعروں کی اِتنی بڑی آبادی کو ایک جگہ اکٹھا بسنے کا موقع فراہم کرے گی کہ کل کو شاعروں کی الگ کالونی کا بظاہر معمولی مطالبہ کہیں شاعروں کے الگ صوبے کے غیر معمولی مطالبے میں نہ بدل جائے۔

اعظم نصر

بات کرائیں۔۔۔"

بڑی دھیمی آواز سُنائی دے رہی ہے۔۔۔" کیا آپ اونچا نہیں بول سکتے؟"

(پھر چیختے ہوئے) "میاں میں اس سے اونچا بول سکتا تو فون استعمال کیوں کرتا۔۔۔"

"سوری رانگ نمبر"۔۔۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

گوجرانوالہ کے ایک معروف صنعت کار کو اُس کے بھائی کا فون کراچی سے آیا۔ اتفاق سے اُس روز یکم اپریل تھی۔ کارخانہ دار کو پہلے بھی کئی رانگ نمبر مل چکے تھے اور اب وہ بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ اس دفعہ آپریٹر نے کہا کراچی سے فون ہے بات کریں۔ تو وہ سمجھ گئے یہ کوئی نیا چکر ہے اور اپریل فول بنایا جا رہا ہے۔ اُن کے بھائی بیچارے کو اس کا علم بھی نہ تھا۔ چنانچہ بات اِس طرح ہوئی۔

"مجید صاحب ہیں؟"

"جی وہ باہر گئے ہیں۔۔۔"

"سعید صاحب سے بات کرائیں۔۔۔"

"وہ بھی نہیں ہیں۔۔۔"

"منیجر محمد رفیع سے ملا دیں۔۔۔"

"وہ آج بیمار ہیں فیکٹری نہیں آئے۔۔۔"

"اچھا اکاونٹنٹ کو بُلا دیں۔۔۔"

"وہ بھی چھٹی پر ہیں۔۔۔"

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں تو گاہک ہوں۔۔۔"

"کیا دفتر میں کوئی صاحب ہیں؟"

"جی نہیں۔۔۔ دفتر میں تو تالا لگا ہے۔۔۔"

"پھر آپ کو کیسے پتہ لگا کہ اکاونٹنٹ بیمار ہے اور منیجر چھٹی پر ہے؟"

"چوکیدار نے بتایا تھا۔۔۔"

"اچھا چوکیدار کو بلا دیں۔۔۔"

"وہ کھانا لینے چلا گیا ہے۔۔۔"

"بھئی میں کراچی سے حمید بول رہا ہوں۔۔۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔"

"کیا بکواس ہے۔۔۔"

"بکواس آپ کرتے ہیں!"۔۔۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

مجید صاحب بڑے خوش تھے کہ وہ اپریل فول نہیں بنے۔

ایک بزرگ ناشتہ کرنے لگے تو فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔۔۔ اُنہوں نے اپنی بیٹی سے کہا۔۔۔ "نازلی بیٹا ذرا دیکھنا کس کا فون ہے۔" نازلی چلی گئی۔۔ بوڑھے میاں جب ناشتے سے فارغ ہوئے تو بیٹی ابھی فون پر مصروف گفتگو تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد نازلی فون سُن کر واپس آئی تو باپ نے پوچھا۔۔۔۔۔ "بیٹا کس کا فون تھا؟"

نازلی نے جواب دیا۔۔۔ "ڈیڈی رانگ نمبر تھا۔"

میں ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے گھر بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔۔ آس پاس اہلِ خانہ میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔۔ ہیلو چودھری امتیاز صاحب ہیں۔؟

"سوری رانگ نمبر" اور سلسلہ ختم ہو گیا۔

ہمارے ایک رشتہ دار جب فون کرتے ہیں تو چند مخصوص رٹے

ہوئے فقرے ضرور ادا کرتے ہیں، مثلاً "السلام و علیکم!"
"کون صاحب ہیں۔۔۔؟"
"جی میں عزیز ذوالفقار بول رہا ہوں!"
"کیا حال ہے برخوردار۔۔۔"
"اللہ کا شکر ہے۔۔۔"
"طبیعت ٹھیک ہے۔۔۔"
"آپ کی دعا ہے۔۔۔"
"مزاج کیسے ہیں؟"
"اچھے ہیں۔۔۔"
"بھائی صاحب یعنی میرے والد صاحب کا کیا حال ہے؟"
"خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔۔۔"
"بہن کیسی ہیں؟"
"وہ بھی راضی ہیں۔۔۔"
"اور کیا حال ہے؟"
"جناب پہلے سے بہت افاقہ ہے۔۔۔"
"کیوں کیا ہوا تھا؟"
"کچھ نہیں ہوا تھا۔۔۔"
"دوسرے اہلِ خانہ کیسے ہیں؟"
"آپ کی درازی عمر کے لئے دعا گو ہیں۔۔۔"
"کاروبار کیسا چل رہا ہے؟؟"
"رب العزت کی مہربانی ہے۔۔۔"
"اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔۔۔"
"بہت بہتر گزر رہی ہے۔۔۔"
"ہمارے لائق کوئی خدمت!!"
"بس آپ کی شفقت درکار ہے۔۔۔"
"میں نے سوچا کئی روز سے خیریت معلوم نہیں کی فون پر ہی پتہ کرلوں۔۔۔"
"آپ کی عنایت ہے۔۔۔"
"بھائی ہمیں تو خیال ہوتا ہی ہے، اور سب خیریت ہے؟"
"پروردگار کا فضل ہے۔۔۔"

"اچھا پھر خدا حافظ۔۔۔"
"خدا حافظ۔"
دیکھیے کیسے کیسے مہرباں ہیں ہمارے۔۔۔
میرے ایک عزیز دوست کو فون آیا جب اُٹھایا تو آواز

### لاہور کا گردہ

جگر مراد آبادی لاہور تشریف لے گئے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ جگر نہایت اخلاص اور تپاک سے ہر ایک کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ اتنے میں سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ''قبلہ، اگر آپ مراد آباد کے جگر ہیں، تو یہ خاکسار لاہور کا گردہ ہے۔''

آئی۔۔۔''ذرا حاجی صاحب کو بلا دیں۔''

''کون صاحب ہیں؟''

''میں امجد بول رہا ہوں۔۔۔''

اچھا ہولڈ کریں۔۔۔کہہ کر اپنے والد کو بلا لائے۔۔اُنہوں نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔۔۔''سناؤ برخوردار مزاج کیسے ہیں؟''

''اللہ کا کرم ہے جناب۔۔۔''

''کب آئے لاہور سے؟''

''کل شام کو ہی آگیا تھا۔۔۔''

''تمام اہلِ خانہ تو اچھے ہیں؟''

''جی سب راضی ہیں۔۔۔''

''آج کیسے یاد کیا؟''

''حاجی صاحب آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جمعرات کو شنیل اور جارجٹ بھجوا دیں گے، مگر ابھی تک کچھ بھی نہیں پہنچا۔۔۔''

''کیا بات کرتے ہو میاں۔۔۔کیسی شنیل اور کون سی جارجٹ؟؟''

''آپ اتنی جلدی بھول گئے ابھی تو ایک ہفتہ نہیں ہوا۔ میں کل رقم ایڈوانس دے گیا تھا۔ آپ نے وعدہ فرمایا تھا جمعرات کو مال بھجوا دیں گے۔''

''ارے بھائی ہوش کرو۔۔۔میرا شنیل سے کیا واسطہ؟؟؟''

''کیا آپ حاجی محمد شفیع نہیں ہیں؟''

''نہیں تو۔۔۔میں حاجی محمد اسماعیل بول رہا ہوں۔''

''سوری رانگ نمبر۔۔۔''

میر صاحب اور شیخ صاحب دونوں بڑے زندہ دل، خوش مزاج اور بے تکلف دوست ہیں۔ دونوں سخت سردی کے دنوں میں کمبل وغیرہ اوڑھے کمرے میں حقہ پی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔۔میر صاحب نے فون اُٹھایا تو ایک لڑکا فحش گالیاں بکنے لگا میر صاحب کو شرارت سوجھی اور کہنے لگے۔۔۔''اچھا آپ کو شیخ سے ملنا ہے وہ میرے پاس ہی بیٹھے ہیں''۔۔۔اور اُنہوں نے ریسیور شیخ صاحب کو دے کر کہا ''لیجئے بات کریں۔''

اور جب شیخ صاحب حقہ منہ سے نکال کر ریسیور کان سے لگایا اور بڑے شفقت آمیز لہجے میں کہا ''ہیلو'' دوسری طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ شیخ صاحب سخت بوکھلا گئے اور پھر اُسی زبان میں جواب دینے لگے۔ اسی دوران غصّے کی حالت میں شیخ صاحب کا ایک پاؤں حقّے کو جا لگا حقہ گرا اور چلم ٹوٹ گئی شیخ صاحب خود بھی گالیاں دیتے ہوئے اپنا توازن کھو بیٹھے اور کرسی سمیت زمین پر آرہے۔ میر صاحب کا مارے ہنسی کے برا حال تھا، اب شیخ صاحب فون کرنے والے کے ساتھ ساتھ میر صاحب کو بھی صلواتیں سنا رہے تھے۔ شیخ صاحب کو گرنے سے گھٹنے پر شدید چوٹ آئی کہ وہ اگلے دس روز تک چارپائی سے اُٹھ نہ سکے۔

اپنے ایک کرم فرما تو ''سوری رانگ نمبر'' کے شیدائی ہیں۔ وہ ہر وقت ان طلسمی الفاظ کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ بازار یا گلی سے گزرتے ہوئے اُنہیں اگر کہیں ٹھوکر لگ جائے تو بے ساختہ اُن کے منہ سے ''سوری رانگ نمبر'' نکل جاتا ہے۔ کئی مرتبہ راہ چلتے ہوئے بدحواسی میں کسی دوست کے خیال سے اجنبی سے ہمکلام ہو جاتے ہیں اور پھر سوری رانگ نمبر کہہ کر آگے چل دیتے ہیں۔

وہ دفتر میں اپنی سیکریٹری کو لیٹر لکھواتے ہوئے اگر کوئی غلط لفظ لکھوا دیں تو ''سوری رانگ نمبر'' کہہ کر فوراً کٹوا دیتے ہیں۔ اِنہی خوبیوں کی بدولت وہ دوستوں اور دفتر کے عملہ میں ''سوری رانگ نمبر'' کے نام سے مشہور ہیں۔

''سوری رانگ نمبر'' کا اُن کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے بلکہ یہ پیارے اور دلآویز الفاظ اُن کے لئے خوش قسمتی کی علامت ہیں۔ اُن کی حسین اور وفادار بیوی قابلِ رشک گھریلو زندگی بھی ''سوری رانگ نمبر'' کی مرہونِ منت ہے۔

نادر خان سر گروہ

# تصویر کے ہر رنگ میں

تصویریں یوں تو خموش ہوتی ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تصویریں بہت کچھ بیاں کرتی ہیں، عیاں کرتی ہیں۔ بس دیکھنے والی 'آنکھیں' ہونی چاہئیں۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہوتا ہے۔ ہم نے زندگی میں کئی تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن کبھی ہمیں تصویر کا دوسرا رُخ نظر نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ اِس کے دیکھنے کے لیے بھی وہ نظر ہونی چاہیے۔

یہ تصویریں بھی عجب تماشے دِکھاتی ہیں۔ کسی بھی اجتماعی تصویر کے دونوں سِروں پر جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وہ تصویر کے فریم میں قدرے اندر کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ شاید اُنہیں فوٹو گرافر کی 'نیت' اور 'مہارت' پر شک ہوتا ہے کہ وہ کہیں اُن کا سَر قلم نہ کر دے یا کوئی بازُو نہ کاٹ دے، جب کہ فریم میں اِتنی گنجائش ہوتی ہے کہ دونوں سِروں پر کھڑے لوگ اگر لیٹ بھی جائیں تب بھی اِتنی جگہ ہوگی کہ فوٹو گرافر خود بھی آ کر 'انگڑائی' لے سکے۔ اور جو لوگ تصویر میں بیچوں بیچ کھڑے ہوتے ہیں وہ پورے فریم کا احاطہ کرنے کی کوشش میں کچھ اِس طرح چوڑے ہو ہو کر کھڑے ہوتے ہیں کہ دونوں سِروں پر کھڑے لوگوں کو لیٹنے کا موقع نہ مل سکے۔

گروپ فوٹو میں ہر کوئی اپنے آپ کو نمایاں سمجھتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ سب چہرے دُھندلے ہیں اور وہی ایک اُجلا اُجلا ہے۔ ہمارے دوست پُر جوش پُوری نے ایک مرتبہ اپنے کالج کے زمانے کی ایک اجتماعی تصویر دِکھا کر پوچھا، ''بتاؤ نادر خان! اِس میں۔۔۔ مَیں کہاں ہوں؟''

ہم نے تمام شکلوں پر اُنگلی رکھ کر پوچھا، ''یہ؟''۔۔۔ ''یہ؟''

اُنہوں نے کہا، ''نہیں، یہ بھی نہیں۔''

ہم نے تصویر کو خوب آڑا ترچھا کر کے دیکھا، یہاں تک کہ کوئی صورت نہیں بچی۔ ہم نے چڑ کر تصویر میں موجود ایک بے چارے گُتے پر اُنگلی رکھی اور ڈرتے ڈرتے آہستہ سے پوچھا، ''یہ۔۔۔؟''

وہ چراغ پا ہو گئے۔ ہم نے صفائی پیش کی کہ کُتے کی توہین ہمارا مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے ہمیں خوب آڑی ترچھی سنائیں اور وہ مُعما خود ہی حل کر دیا کہ ''اِس تصویر میں۔۔۔ مَیں تصویر کھینچ رہا ہوں!''

کسی انعامی تقریب کی تصویر دیکھ کر یہ پتا نہیں چلتا کہ تصویر میں کون انعام دے رہا ہے اور کون لے رہا ہے۔ دونوں ہی کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ

محلے بھر کی دیواروں پہ سر ہی سر نظر آئے
مرے بچوں نے جس دم لوٹ لی طرزِ فغاں میری
(محمد طہٰ خان)

لگانا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون انعام دے کر مسکرا رہا ہے اور کون لے کر۔

تصویر کشی (Photography) اب ہر اہم کام سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ ایک مرتبہ وزیرِ صحت، پولیو بچاؤ مہم کا آغاز بچوں کو خود اپنے ہاتھ سے دوا پلا کر کر رہے تھے۔ ذرا سچویشن ملاحظہ ہو۔۔۔ بچے کو ایک نرس نے تھاما ہے۔ اُس کے ایک طرف وزیر اور دوسری طرف بچے کی ماں کھڑی ہے۔ نرس اور ماں کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور وزیر مسکرانے والوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ بچہ؛ وزیر کی طرف غصیلی آنکھ سے دیکھ کر رونے کی تیاری کر رہا ہے اور دَوا اُس کی ناک میں جارہی ہے۔ بعد میں وزیر سے جب اُن کے سیکریٹری نے کہا، "صاحب! دوا تو بچے کی ناک میں جارہی تھی۔ وزیر نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا، "دوا چاہے کہیں بھی جائے، ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔"

شادی کا جب قصد کیا جاتا ہے، تب تصویروں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ لڑکا قصداً اپنی جوانی کی تصویر بھیجتا ہے اور لڑکی والوں کو مجبوراً گوری رنگت والی تصویر بھیجنی پڑتی ہے۔ ہمارے دفتر کے چپراسی نے اپنی شادی کے لیے (خود کو پسند کروانے کے لیے) جو تصویر بھیجی تھی اُس میں وہ اپنے باس (BOSS) کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ آرام کرسی پر ٹیک لگائے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ "میں کام...... وام نہیں کرتا۔" لیکن اُس سے ایک بھول یہ ہوگئی کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے جھاڑن نہیں چھوڑی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ اُس کا رشتہ اُسی جھاڑن کی وجہ سے پکا ہوگیا۔ لڑکی والوں نے کہا، "دیکھو! کتنی سادگی ہے اِس لڑکے میں، اپنے دفتر کی صفائی خود کرتا ہے!"

فوٹوگرافر اپنی زندگی میں جو لفظ سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، وہ ہے 'اِسمائل' (smile)۔ مسکراہٹ کے یہ طلب گار یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مسکراہٹ کے بنا 'خطا کا پُتلا' محض ایک 'پُتلا' نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ لوگ حد کر دیتے ہیں، موقع دیکھتے ہیں نہ محل، شادی کی تقریب میں دُلہن کے ساتھ کھڑے دُولہے سے کہتے ہیں۔۔۔ "مسکراؤ!"

پُر جوش پُوری نے اپنی شادی میں ایک فوٹوگرافر کے کیمرے کے ساتھ اُس کا 'منہ' بھی توڑا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فوٹوگرافر اُنہیں بار بار سہرے کے پیچھے مسکرانے کو کہہ رہا تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ پُوری نے کسی کو منہ توڑ جواب دیا ہو۔

شادی کی تقریب میں سب سے اہم مہمان، کیمرا مین ہوتا ہے، سب کی توجہ کا مرکز، لیکن اُس کی توجہ کا کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا۔ شادی میں تصویریں اِس لیے بنوائی جاتی ہیں کہ میزبانوں کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ کون آیا، کون گیا؟ وہ سب تو انتظامی اُمور میں مصروف ہونے کی اداکاری میں مصروف رہتے ہیں۔ شادی کے

بعد سب کمر سیدھی کر آرام سے ریکارڈنگ دیکھتے ہیں کہ کون کون 'نہیں' آیا تھا اور کس نے کیا نہیں دیا۔ عورتیں یہ دیکھتی ہیں کہ کس نے کیا پہنا تھا اور اپنے منہ پر کیسا میک اَپ تھوپا تھا۔ ہمیں تو تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں میک اَپ کے باوجود ایک دوسرے کے چہرے کیسے پہچان لیتی ہیں!

پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''ایک زمانے میں مجھے تصویر اُتارنے کا بے حد شوق تھا۔ میں تصویریں اُتار۔۔۔ اُتار کر دیوار پر ٹانگتا تھا اور میرے ابو دیوار پر ٹنگی تصویریں اُتار۔۔۔ اُتار دیتے تھے۔''

ہم نے کہا، ''گویا دونوں کو ایک ہی شوق تھا۔ دونوں ہی تصویریں اُتارتے تھے۔''

وہ منہ بسور کر بولے، ''جی ہاں! ہم دونوں ہی تصویریں اُتارنے پر اُتارُو تھے۔''

ایک روز پُوری صاحب نے ہمیں اپنے گھر مہمان کیا۔ ابھی ہم اُن کے کتب خانے میں طنز و مزاح کے گوشے میں رکھی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ابن انشا، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور دیگر مزاح نگاروں کی کتابوں پر نظر ڈال ہی رہے تھے کہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر کے بولے'' اِن کتابوں سے دُور ہی رہو تو اچھا ہے، تم اِس معاملے میں قابلِ اعتماد نہیں۔ کتاب لے کر بیٹھ جاؤ گے یا دَبا بیٹھو گے۔ یہ سب انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، مکمل کتاب نہ سہی، اِکا دُکا مضامین تو ہر ایک کے مل ہی جائیں گے۔ 'بزمِ اردو لائبریری' پر بھی بہت کچھ ہے۔ آؤ! اِدھر دیکھو! یہ ہمارے دادا جان ہُوا کرتے تھے۔'' اُنہوں نے دیوار پر ٹنگے فریم میں، بندوق کے سہارے بمشکل کھڑے، لٹکی ہوئی مونچھوں والے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''اُن کا نشانہ اِتنا پکا تھا کہ وہ اُڑتی چڑیا کو گرا کر اُس کے پَر گِنتے تھے۔ اِس تصویر میں اُن کے پیر تلے جو شیر نظر آ رہا ہے، جس کے ساتھ دادا جان کی تصویر گاؤں والوں نے زبردستی اُتروائی تھی۔ اُس غریب کو مارنے کا اُن کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔ وہ تو فقط شیر کی ناک پر بیٹھی ظالم مکھی پر اپنا نشانہ آزما رہے تھے۔''

اِسی سے کھیلتی رہتی ہیں انگلیاں میری
کہ سوتے جاگتے ہمدم ہے اپنا موبائیل

گلے کسی سے ملیں اس کا ساتھ نہ چھوٹے
معانقوں سے مقدم ہے اپنا موبائیل

ہم نے کہا، ''واہ! کیا کمال کا نشانہ پایا تھا۔''

بولے، ''دوست! نشانہ ہی نہیں، بندوق بھی کمال کی پائی تھی، جس کی دھاک سے اچھی اچھی 'قابض' فوجیں دست بردار ہو جائیں۔

ہم نے بندوق کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا، "بڑی 'قبضہ گشا' بندوق ہے۔"

"اور نہیں تو کیا!" اُنہوں نے تائید کی، "تم جیسوں کو تو اِس کا دَستہ دیکھ کر ہی افاقہ ہو۔"

پتا نہیں سب سے پہلی تصویر کس نے کھینچی تھی اور کس کی کھینچی تھی۔ پہلے جب کیمرا نہیں تھا، تب سامنے بٹھا کر تصویر بنوائی جاتی تھی۔ نواب ہو یا نواب زادی، اپنا سارا کام کاج (جو ہوتا نہیں تھا) چھوڑ کر مصور کے سامنے تصویر بنے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کی ناک پر بیٹھی مکھی بھی مصور ہی اُڑاتا تھا۔ باقی وقتوں میں وہ خود مکھیاں اُڑایا کرتے تھے۔

غالب کو بھی مصوری سیکھنے کا شوق چَرایا تھا۔ اسی لیے تو اُنہوں نے یہ شعر کہا:

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

پتا نہیں، غالب نے مصوری سیکھ کر مصوری کی بھی یا نہیں۔ اور اگر کی بھی ہو تو ممکن ہے فارسی کے ہزاروں اَشعار کی طرح اُن کی مصوری کے فن پارے بھی زمانہ در زمانہ، عصرِ جدید کی پرت تلے کہیں دب کر رہ گئے ہوں گے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیشتر اَدیب، شاعر اور صحافی اپنی ہر تازہ تحریر کے ساتھ اپنی باسی تصویر چسپاں کرتے ہیں۔ لوگوں کو تحریر کے ساتھ ساتھ تصویر بھی جھیلنی پڑتی ہے۔ مضمون کے ساتھ تصویر کے ہونے سے تبصرہ نگار کے لیے فرار کی راہ بآسانی کُھل جاتی ہے۔ وہ فقط تصویر کی تعریف کر کے صاف بچ نکلتا ہے۔

تصویر اُتروانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس بہانے بندے کو مسکرانے کا ایک بہانہ مل جاتا ہے۔ یوں بھی تصویر اب ایک اہم دستاویز میں شمار ہونے لگی ہے۔ برتھ سرٹیفکیٹ سے لے کر ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک کا سفر تصویر کے بغیر طے کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مرنے کے بعد بھی انسان تصویروں میں مسکراتے ہوئے زندہ رہتا ہے۔

تصویروں کی نمائش بھی ہوتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں۔ مقابلے میں ایسی تصویر کو پہلا انعام ملتا ہے، جس میں ہڈیوں کا شکا ریچہ نظر آتا ہے۔ جس کا پیٹ اُس کی پیٹھ سے لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں ہر طرف سے پچکا ہوا خالی برتن اور کیمرے کی طرف خالی خالی تکتی اُس کی حلقوں میں دھنسی آنکھیں۔ ایسی تصویر کو دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں، "واہ! مصور نے تصویر میں حقیقت کے رنگ بھر دیے ہیں!" ظاہر ہے، حقیقت میں تو اُس منظر میں کوئی رنگ نہ تھا۔ اِس پر مصور کو انعام واِکرام سے نوازا جاتا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والے ایسے بھوکے ننگے بچے نہ جانے کتنے آسودہ حال لوگوں کا پیٹ اور اُن کی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔ کاش! کوئی اُس حقیقت میں بھی رنگ بھر دے۔

وطن سے دُور ...... پردیس میں رہنے والے کا گزارہ تصویروں پر ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو تصویر میں 'ڈھلتے' دیکھتا ہے۔ ہر بار تصویر میں نیا رُوپ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر تصویر میں پتھرائی اُن آنکھوں میں 'وہ' انتظار دیکھ نہیں پاتا۔ دوسری طرف بیوی...... تصویر کے ایک رُخ پر ہی اپنے شب وروز گزار دیتی ہے۔ کتنے ہی سُہانے پل اُس کے احساس کو چھوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اُس کے بچے تصویروں میں ہی بڑے ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں۔ باپ کی شفقت اُن تصویروں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ اُس کی بیٹی تصویر میں دُلہن بن کر تصویر ہی میں رُخصت ہوتی ہے۔ اور باپ...... آنسو کے چند قطرے تصویر پر بہا کر، محرومی اور اُداسی کی تصویر بن جاتا ہے۔ یوں تصویروں کی کڑیاں

جوڑتے جوڑتے اُس خاندان کے ہر فرد کی زندگی ایک با تصویر کہانی بن جاتی ہے۔

کچھ تصویریں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں تو کچھ مجبوری کی تصویر ہوتی ہیں۔ تصویر میں کئی رنگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ میں کئی تصویریں ہوتی ہیں۔ تصویریں بہت کچھ بیاں کرتی ہیں، عیاں کرتی ہیں، مگر دیکھنے والی وہ آنکھیں ہونی چاہئیں۔ تصویر کے کئی رُخ بھی ہوتے ہیں، پر دیکھنے والی وہ نظر ہونی چاہیے۔

وسیم شہزاد

# ادھورا خواب

پڑھ لکھ کر بڑا افسر بننے کا خواب آنکھوں میں سجائے جب دسویں کلاس کا امتحان قریب آیا تو ہمارے ہر دل عزیز استاد جی کریم بخش صاحب نے ٹی پارٹی کا انتظام کیا۔ استاد جی کی تقریر کے دوران بھرائی ہوئی آواز سن کر دل تڑپ اٹھا۔ میں اور میرا لنگوٹیا فیقا خون کے آنسو رونے لگے ہم استاد جی کا غم سمجھ سکتے تھے۔ قوم کی خوراک بروقت نہ پہنچے کا صدمہ استاد جی کو نمدیدہ کیئے ہوئے تھا۔ عین گندم کی کٹائی کے موسم میں ہم سکول چھوڑ کر جا رہے تھے، تقریب کے اختتام پر میں اور فیقا اٹھے اور استاد جی کو گلے لگا کر انہیں دلاسا دیا، اگلے سال پھر سے استاد جی اور سکول کی خدمت کا تہیہ کر لیا۔ اس کا فائدہ ہمارے والدین کو بھی ہونا تھا کہ نئے سال کی کتابیں خریدنا آسان کام نہیں ہے "آخر ان کی فرمانبرداری میں ان کے مال کی حفاظت بھی تو ہماری ہی ذمہ داری تھی۔"

رزلٹ آنے تک استاد جی کی خدمت اور والدین کی مالی بچت کا خواب لیے دل شاد ماں تھا لیکن رزلٹ کے روز منظر یکسر بدل گیا جب دانش، اور کامران کے والدین بیٹوں کے لئے پھولوں کے ہار لئے اور طاہر کے والد محترم کسی جلاد کی طرح ہاتھ میں مولا بخش (ڈنڈا) اٹھائے اس کی یوں دُھنائی کر رہے تھے جیسے رضائی کے ہر حصے میں برابر روئی سموئی جا رہی ہو۔ ہم طاہر کا درد سمجھ سکتے تھے کیونکہ اس سٹوری کا "ری پلے" شام کو میرے اور فیقے کے گھر چلنے والا تھا۔

ابا جی کی چھتر ول سے بچنے کی خاطر اماں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا سو گھر میں داخل ہوتے ہی اماں کو روتے ہوئے اپنے اوپر ہونے والے ظلمِ عظیم کی داستان سنائی اور اتنے نیر بہائے کہ گلی کی نالی کا پانی نالی سے باہر نکل مؤدب کھڑا ہو گیا اور ہمارے آنسوؤں کو رستہ دے کر ان سے یوں مخاطب ہوا!

"جناب پہلے تسی لنگ جاؤ اسیں بعد وچ جاواں گے" (پہلے تم گزر جاؤ ہم بعد میں چلے جائیں گے)۔

میرے دکھ سکھ کے ساتھی فیقے نے اِس غم کی گھڑی میں میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ ساتھ والے گھر سے فیقے کے آنسو بھی خراماں خراماں ہمارے آنسوؤں کے ہمسفر ہو گئے۔ چھپن چھپائی کھیلتے جب بڑے تالاب میں پہنچے تو سارے مینڈکوں کو اپنے غم میں شریک کر لیا۔ ساری رات تمام مینڈک ٹراں ٹراں کی آواز سے ہمارے غم میں برابر شریک ہو کر نوحہ کناں رہے۔

تعلیمی نظام کی تاریخ میں ہم سب سے مظلوم طالب علم تھے" جن کے 100 میں سے صرف 95 نمبر ہی کم تھے" پھر بھی فیل کردیئے گئے۔ہم کلاس کے مانیٹر تھے جب مانیٹر بنائے گئے تو اماں نے ابا کے منع کرنے کے باوجود پورے محلے میں ہماری ہونہاری کے اعزاز میں دیسی گھی کی مٹھائی بانٹی اباجی کا مؤقف بھی بڑا واضع تھا اور اماں سے کہتے تھے!

"اِناں خوش ناں ہو۔۔ سکولاں دے وچ مانیٹر اونہوں بناوندے نے جیہڑا ساریاں توں نالائق ہونداا ے یا فر پچھلے سال دا فیل"۔۔(اتنی خوش نہ ہو۔۔۔سکول میں مانیٹر اسے بنایا جاتا ہے جو سب سے نالائق ہو یا پچھلے سال کا فیل ہو)

ہم نے پوری جانفشانی،محنت اور لگن سے کریم بخش استاد کی گندم اور مونگ پھلی کی فصل اٹھانے میں مدد کی تھی۔ ذوقِ مطالعہ تو ہمارا اِتنا بلند تھا کہ مارکیٹ میں آنی والی ہر نئی کہانی ہمیں ازبر ہوا کرتی تھی۔جرنل نالج کے تو کیا ہی کہنے، ہر نئی فلم اور محلے میں طفیل کوکڑی (کوکڑی۔۔۔مرغی فروش) اور سودے بھانڈ کے درمیان ہونے والے تمام تاریخی معرکوں کے حالات ومحرکات سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی خوشبو سے عاری گفتگو بھی ہمیں خوب یاد تھی۔ کبھی کبھی جب ہم ان کے اقوال نقل کر لیتے تو اباجی کی جوتی کسی ڈرون کی طرح ہمارا نشانہ لے لیتی۔ محلے میں کسی کی مرغی گم ہوجاتی تو سارے محلے والے انسپکٹر کھوجی کی طرح ہمارے قدموں کے نشان ڈھونڈتے تے ایک بار شیدے پکوڑے والے کی دوکان پر ضرور چکر لگاتے ، جہاں محلے کی کتنی ہی مرغیاں اپنی جان دے کر ہمارے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر چکی تھیں۔

شیدا پکوڑے والا بھی ہمارے ممتحن سے کم نہ تھا وہ پانچ روپے کے پکوڑے دینے سے اسی طرح انکاری ہوجاتا جیسے ممتحن نے ہمارے حاصل کردہ قیمتی 05 نمبروں کو نظر انداز کردیا تھا ویسے تو ہم شیدے کے محسن تھے جس کو ہم پکوڑے بیچنے کے لیے نفیس اور نئی کاپیوں کے دستے بہم مہیا کرتے تھے۔۔۔غزالہ آپا جب بھی اماں یا ابا سے کاپی میں سے اوراق کے غائب ہونے کی بابت شکایت کرتی تو ہم پورے دلائل کیساتھ یہ بات ثابت کرتے کے آپ کا فرزندِار جمند اتنا ہونہار ہے کہ اس کے ہوم ورک کی کاپی استاد جی کی نظروں کو خیرہ کئے دیتی ہے اور وہ کاپی کے اوراق ہی نکال لیتے ہیں، تب ہماری اماں فخر سے ہمارا ماتھا چومتی اور کہتی "میرا لعل کناں لائق ہوگیا کاپیاں بڑیاں نے توں صرف محنت کردا جاتے وڈا افسر ابن کے دنیا نوں ویکھانا ایں۔" (میرا بیٹا کتنا لائق ہوگیا ہے کاپیاں بہت ہیں بس تم محنت کرتے جاؤ اور بڑے افسر بن کر دنیا کو دکھانا ہے۔) ہم بھی اماں کی محبت کے جواب میں بڑا افسر بننے کا دعویٰ ایسے کردیتے جیسے کچھ ہی دیر بعد ہم افسر بننے والے ہیں اور کوئی گریڈ 17 کا افسر ہمارے لئے بس سیٹ چھوڑنے ہی والا ہے۔

لیکن اماں کا ہمیں بڑا افسر دیکھنے کا خواب اس وقت پاش پاش ہو گیا جب اباجی شام کو شیدے کی دوکان سے پکوڑے لے کر گھر آئے۔ جس کاغذ کے لفافے میں پکوڑے لائے گئے اس کے اوپر ہمارا خوبصورت نام کندہ تھا اور غزالہ آپا نے اپنے دستِ مبارک کی لکھائی کو فوراً پہچان لیا،ساتھ ہی ہمارے فیل ہونے کی خبر ایسے سناڈالی جیسے کوئی نیوز چینل کسی کی بکری چوری ہونے کی خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلا دیتا ہے۔پھر کیا تھا اماں کو اعتماد میں لینے کے لئے بہائے جانے والے مصنوعی آنسو حقیقت کا روپ دھار گئے تھے اور کچھ روز کے لیے ہمارے اٹھنے بیٹھنے کے انداز بدل گئے۔

اب ہم شیدے کے ساتھ اپنے سابقہ سکول کے سامنے پکوڑے بیچتے ہیں ساتھ ہی میرا لنگوٹیا فیقا گول گپے کی ریڑھی لگاتا ہے کریم بخش استاد جی سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے کریم بخش استاد کو بھی ہماری فرمانبرداری پر فخر ہے۔۔۔کل تو استاد جی بہت گرم جوشی سے ملے اور اپنے گھر لسی پینے کی دعوت دے ڈالی جس پر میں فوراً فیقے کی طرف دیکھنے لگا۔ فیقا مجھے کاٹ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ کل سے استاد جی کے کھیتوں میں گندم کی کٹائی شروع ہے۔

فہد خان

# اُس بازار میں

جس نے لاہور کے دلفریب نظاروں سے اپنے نینوں کی تشنگی نہیں مٹائی، اپنے ذوقِ جمالیات کی سیرابی کا سامان نہیں کیا، وہ گویا کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔"

۔۔۔"لاہور۔۔لاہور ہے۔"

یہ اور لاہور سے عشق کے لافانی جذبات سے معمور بیسیوں جملے بچپن اور لڑکپن میں سلیم کے پردۂ سماعت سے گذرے تھے۔ دماغ سوال کرتا کہ بھلا لاہور میں وہ کون سے سرخاب کے پر ہیں ہے جو اسے دیگر شہروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ چلو اپنوں کو تو چھوڑو۔ بھلا جان ملٹن نے "پیراڈائز لاسٹ" میں عظیم مغلوں کے لاہور کا تذکرہ کیوں کیا؟

لڑکپن گزرا، شباب کے دن آئے اور سلیم کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور آنا پڑا۔ بچپن کی سنی باتیں اور لڑکپن میں بنے خواب کبھی نہیں بھولتے۔ لاہور کو ایکسپلور کرنے کا جذبہ اسے اندر ہی اندر اُکساتا رہا۔ اور اس نے لاہور کے قابلِ دید مقامات کے بارے میں تفصیل جمع کرنا شروع کی۔ ہر اک تجربہ کار سے پوچھا، بزرگوں کے "گوڈے" تھامے، اٹلس خریدا، دنیائے انٹرنیٹ کو کنگھال ڈالا۔ سلیم کا کہنا تھا کہ لاہور میں قدم رکھ کر اس کی پیدائش تو وقوع پذیر ہوئی ہی ہے، کیوں نہ پیدائش کے اس عمل کو یادگار بلکہ شاندار بنایا جائے! قانونِ فطرت ہے کے ہر اک بشر کا ذوق ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مرغیوں کی رانیں چیر کر اپنی حسِ خوش ذائقگی کو طمانیت مہیا کرتا ہے اور کوئی بوٹی ایک طرف کر کے شوربے سے روحانی سکون کا آرزومند ہوتا ہے۔ لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف مقامات کا ذکر کیا، کسی نے پنجاب اسمبلی کا تو کسی نے چڑیا گھر کا، کسی نے مقبرۂ نور جہاں کا تو کسی نے مزارِ علی بن عثمان الہجویری کا، کسی نے پنجاب یونی ورسٹی کا تو کسی نے جامعہ اشرفیہ کا۔ مگر ایک بزرگ نے نام نہ بتانے کی شرط پر (سلیم کے کان میں) ایک ایسے مقام کا بتایا کہ جہاں کا ذکر تک شرفاء کے ہاں ممنوع ہے (صرف ذکر، افادہ قطعی ممنوع نہیں) اُف مالک! سلیم کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

یہ وہ مقام حیرت تھا کہ جہاں دو شناسا قدرت کی ستم ظریفی کے باعث اِک دوجے کے سامنے بھی آجائیں تو نظریں چرالیں اور پھر تا عمر باہم ملا نہ پائیں۔ ایک مکانِ طمانیت جہاں پر جانے والا ہر سفید پوش کسی پوشیدہ آنکھ سے دیکھ لیے جانے کے خطرے سے دوچار ہو۔ ایک ایسا مقامِ بدنام جہاں غریب غرباء بھی اپنی ان حسرتوں کو پورا کرتے ہیں، جو بھینس کے پایوں کی مانند جانے کب سے ان کی آتشِ دل میں ہلکی آنچ پر پک رہی ہوتی ہیں۔ اور وہاں امراء بھی پیچھے نہیں رہتے ہیں، بلکہ پیسوں کے بل پر

اعلیٰ سے اعلیٰ شے مول لیتے ہیں۔ ایک آتش خانہ کہیے کہ جہاں برودت میں حرارت کے طالب جوق در جوق جاتے اور اپنے اپنے ابدان کے لیے تابش اور حدت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ کہ جن کا کھیسہ ان کے نصیب کی طرح خالی ہوتی ہے وہ صرف ''چشمِ ماروشن، دلِ ماشاد'' پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ باالفاظِ دگر ''ونڈو شاپنگ'' کرتے ہیں۔ جی ہاں آپ بالکل درست سمجھے یہ ذکر ہے ''اس بازار'' کا۔

سلیم، ایک اوسط نوجوان جس کی دلچسپی اپنی خواہشات مکمل کرنے اور اپنے ارادوں کی تکمیل تک ہوتی ہے کے دل میں ''اس بازار'' جانے کی خواہش تب سے موجود تھی جب کہ اس کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں اور آتش ابھی بچہ تھا! ایسا نہیں کہ وہ کوئی کریکٹر لیس اور بے کردار نوجوان تھا، مگر دل کی حسرتین اور یہ شیطان کی چالیں! غرض یہ کہ یہ حسرت اس کے دل و دماغ پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ دوستوں کی ایک بے تکلف محفل میں کہ جہاں سب اپنی ٹوپیاں اور شلواریں اتار کر بیٹھتے ہیں سلیم کی زبان سے اس کی یہ خواہش پھسل پڑی! ایک لمحے کو تو سلیم کھٹکا اور اسے لگا کہ غالباً دوستوں سے اس طرح کی بات درست نہ تھی مگر پھر محسوس ہوا کہ باقی بھی متفق الخیال لوگ تھے۔ یعنی ان سب کے سینوں میں بھی وہی آتش جل رہی تھی جو سلیم کو کئی سالوں سے بے چین کیے ہوئے تھی اور جس کو بجھانے کے لئے وہ اس لئے زور آور ثابت نہ ہوا کیوں کہ یہ فطرت اور اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ وہ سمجھتا رہا کہ یہ اشرف المخلوقات کے شرف کے خلاف ہے! مگر یار بیلی اس مشکل راہ میں ہمراہی بننے کو تیار تھے۔ تو پھر شرم کاہے کی؟

کجا یہ عالم کوئی اس موضوع پر لب کشائی کرنے سے ڈرتا تھا اور کجا یہ عالمِ تعجب کہ ہر ایک کی زبان پر وہیں کا تذکرہ تھا۔ سب وہاں جانے کے لئے بے تاب، ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ سو طے پایا کہ پڑھائی سے ذرا فرصت ملتے ہی ''اس بازار'' کا رخ کیا جائے۔ بقولِ یوسفی سردی روئی یا دوئی سے ہی دور کی جا سکتی ہے، اور ان سب دوستوں کو اِسی کی تلاش تھی۔ صرف چند سو روپوں میں وہ اپنے سینے میں دبی خواہشات پوری کر سکتے تھے! صرف چند سو روپوں میں۔۔۔

کہتے ہیں الانتظار اشد من الموت۔۔۔ سو اب یہی موت سے بھی شدید شے کے جام کی چسکیاں سب لیتے بیٹھے تھے۔ مگر انسان بے صبرا ہے!

اگلے روز ہی سلیم کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے دلاور کا پیغام پڑھا:

"یار آج ''اس بازار'' چلے چلو۔۔۔ اب مجھ سے رہا نہیں جا رہا'' اور مزید تاکیداً لکھا تھا۔ ''تم نہیں جاتے تو میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔''

بھلا ''ی'' کے اس کام سے کون کافر انکاری ہو سکتا تھا۔ دلاور نے گویا سب کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

نہا دھو، کپڑے بدل، ہاسٹل سے سب ساتھ ہی چل نکلے۔

عالم یہ تھا کہ سب کے چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ تھی اور ان کی

### مرغا بننے کی فضیلت

جب سے لڑکوں کو مُرغا بنانا بند ہوا ہے، تعلیمی اور اخلاقی معیار گر گیا ہے۔ ویسے تو میں اپنے شاگردوں کی ہر نالائقی برداشت کر لیتا ہوں، لیکن غلط تلفظ پر آج بھی کھٹ سے مُرغا بنا دیتا ہوں۔ جسم سے چپکی ہوئی جینز پہننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اس سے فارسی الفاظ کے تلفظ، آبدست اور مُرغا بننے میں دقت ہوتی ہے۔ مگر آج کل کے لونڈوں کی ٹانگیں پانچ منٹ میں ہی ناطاقتی سے لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ میں اپنے زمانے کے ایسے لڑکوں کو جانتا ہوں جو بیس بیس بید کھانے پر ''سی'' تک نہیں کہتے تھے۔ ایک تو ایس پی ہو کے ریٹائر ہوا۔ دوسرا دیہات سدھار کے محکمے میں ڈائریکٹر ہو گیا تھا۔ اب ویسے شرارتی اور جی دار لڑکے کہاں، دراصل اس زمانے میں کیریکٹر بہت مضبوط ہوا کرتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے کیمیا بنانے میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی، اسی طرح آج کل کی تعلیم میں ایک بید کی کسر رہ جاتی ہے۔

آبِ گم از مشتاق احمد یوسفی

## گدھے

مجھے گدھے پر رشک آتا ہے۔اس عقلمند جانور نے اپنی بیوقوفی کا پرچار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ہر مشکل کام اور ذمہ داری سے محفوظ کر لیا ہے۔اب وہ بڑی سے بڑی چالاکی کرے تو بھی آپ اسے حماقت پر محمول کر کے ہنس دیں گے اور پیار سے کہیں گے، گدھا ہے گدھا۔ چونکہ آپ اسے خالص بے وقوف تسلیم کر چکے ہیں اور حماقت کے سوا اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے اور گھوڑا۔۔۔۔۔۔ بے وقوف! اپنی ذہانت کا ڈھونگ رچا کر ہمیشہ کے لیے غلام بن چکا ہے۔ ہر کام جس میں ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے ذمے ہو چکا ہیمسٹلا بھرے بازاروں میں میں تانگہ لیے پھرنا، لڑائیوں میں سواروں اور توپوں کو لے کر آگے بڑھنا، شادی میں دلہا کو اٹھائے پھرنا۔اس کے برعکس گدھا ،زیادہ سے زیادہ مٹی کا بورا اٹھایا اور بس۔

ممتاز مفتی کی کتاب "غبارے" سے ایک اقتباس

بدن بولی ان کی دلی کیفیت کی عکاس تھی۔اِک سرشاری کا سا عالم تھا۔علی نے چند قدم دوڑ کر یوں ہاتھ گھمایا جیسے اے بی ڈیویلیئرز کو باؤنسر مارا ہو جس سے وکٹیں پارہ پارہ ہو گئیں ہوں۔دلاور کو گالی دے کر سلیم نے گلے لگایا اور یوں ہنسی اور خوشی کی تصویر بنے یونیورسٹی کے گیٹ کے باہر رکشے والے کو روک کر سلیم نے جھجکتے ہوئے "اُس بازار" جانے کو کہا۔

"اُس بازار؟"

"صاحبِ رکشہ" نے رکشہ سے اپنی زرافے کی مانند لمبی گردن باہر نکال کر پان کی پیک پھینکی اور باقی پان کو کلے میں دبا کر رس حلق میں اتارتے ہوئے ایک عجیب سی نظر ڈالی۔اس نظر میں استہزاء اور تمسخر صاف جھلک رہا تھا۔

سلیم کو لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔۔۔

"اچھا جناب! آپ سے نفیس، ارمانی کی شرٹ اور باس کی پینٹ میں ملبوس لوگ بھی وہاں جاتے ہیں؟"

سلیم کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔وہ اس قسم کا لڑکا نہ تھا کہ ایسے بازاروں میں جاتا۔اس کے خاندان میں کبھی کوئی ایسے بازار کبھی نہ گیا تھا اسے اپنی پیشانی پر اس سردی میں بھی چند پسینے کی بوندیں محسوس ہوئیں۔۔۔رکشہ چل پڑا۔رکشے والا کمبخت رکشہ چلاتے چلاتے بار بار شیشے اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔سلیم نے اپنی توجہ رکشے سے باہر کے مناظر پر کر لی۔

بازار کے آثار دکھائی دینے لگے۔دور سے ہی پتلی پتلی تاریک گلیاں نظر آ رہی تھیں، جس میں کئی طرح کے لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔۔ گاہک، خریدار اور گاہک پھانسنے والے ایجنٹس۔۔۔سلیم کی نظریں دیکھ رہی تھیں کہ کس خوبی سے "گلشن" کا کاروبار چل رہا تھا۔

رکشے والے نے ایک دم سے بریک لگائی تھی۔اور وہ سب رکشے سے اتر آئے۔سلیم کی نظریں تیزی سے ماحول کا تجزیہ کر رہی تھیں۔اس نے شناخت چھپانے کے لئے ایک "زِپر" جرسی زیب تن کی ہوئی تھی جس کی زپ گردن تک بند تھی اور اوپر ایک چترالی ٹوپی ماتھے اور کانوں تک ڈھلکی ہوئی، ساتھ ہی تاریک اور بڑے بڑے شیشوں والی رے بین عینک۔مگر اس کا دل تھا کہ دھڑکے ہی چلا جا رہا تھا۔اس کی انا اس رستے میں کسی سپیڈ بریکر کی طرح بار بار اس کے سامنے آ رہی تھی۔

"اگر کوئی شناسا مل گیا تو؟" دل نے سوال کیا۔

مگر وہ "جواب لیس" تھا۔

کانوں میں ابا جان کی آواز گونج رہی تھی۔

"خوب میاں! آ گئے خاندان کی عزت مٹی میں ملا کر؟ مل گیا سکون آپ کو۔۔۔۔۔۔۔قرار آ گیا آپ کی تڑپتی ہوئی روح کو؟۔۔۔نکل جاؤ اس گھر کو چھوڑ کر، آئندہ اپنی شکل مت دکھانا، مر گئے ہم تمہارے لئے!"

سلیم کو لگا کہ سارے لوگوں کی توجہ جیسے اس کی ہی طرف ہو اور اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

سامنے گلی میں پہنچنے کو اُسے چند قدم درکار تھے، اور یہی چند قدم دیوار تھے۔

اسے لگا کہ وہاں موجود ہر شخص دوسرے کے کانوں میں یہی

سرگوشی کر رہا ہے کہ
"ارے نواب معظم علی کا پوتا، حشمت علی کی اکلوتی اولاد اور "اِس بازار" میں؟"
"ارے بھیا، قیامت کی نشانیاں ہیں۔۔۔قیامت کی۔"
نہ جانے سلیم نے خود کو کیسے سنبھال رکھا تھا! بدن پر لرزہ طاری تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ سلیم ضمیر کی عدالت میں خود کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنا آپ ننگِ خاندان لگ رہا تھا۔
اس مشکل وقت میں ماسوائے خدا کون سا در تھا جس سے بھیک ملنے کا یقین ہوتا؟
"اے میرے مولا! میں کہاں آ گیا؟۔۔۔کس کوچۂ خرابات میں آ گیا۔۔۔کس علاقۂ ظلمات میں آج میں قدم رکھے ہوئے ہوں۔۔۔" وہ بلبلایا۔
"اے میرے مالک، آج میں اپنے خاندان کی عزت مٹی میں ملانے کو ہوں۔ میرا ہاتھ تھام لے، میرے مالک۔ اس علاقے سے مجھے دور لے جا۔ میرے مالک مجھے تھام لے۔ میرے لئے آسانی کر۔ مجھے یہاں سے بچالے جا۔۔۔۔"
اور معجزہ ہونے لگا۔
"ابے تو رو کیوں رہا ہے؟ کیا ہوا؟" دلاور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر گھبرا گیا۔
سلیم کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔
"اسے رات کہا بھی تھا کہ ڈراؤنی فلم ہے، تو نہ دیکھ!" تفضل نے ڈانٹا۔
"طبیعت خراب ہے کیا؟" علی نے نرمی دے پوچھا۔
"طبیعت خراب تھی تو نہیں آنا تھا یار!" دلاور نے قدرے خفگی سے کہا۔ اسے اپنا پروگرام ضائع ہوتے دکھ رہا تھا "چل میں تجھے واپس لیے چلتا ہوں۔ تم لوگ مزے کرو۔"
اس نے سلیم کو سہارا دے کر ایک رکشے میں بٹھایا۔
رکشہ "اس بازار" سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سلیم کی آنکھیں بند تھیں اور وہ پرسکون دکھتا تھا۔ اس کے خاندان کی عزت بچ گئی تھی۔ اُس کی حرمت رہ گئی تھی۔ سانس میں سانس آنے لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا بننے سے بچالیا۔
"میرے مولا" اُس نے بڑے دل سے کہا۔ "تیرا صد شکر کہ تو نے مجھے آج اس بازار سے بچالیا۔ میرے خاندان کی عزت حرمت بچائی۔ مجھے منہ کالا کرنے سے بچایا۔
میرے مالک میں بھی آج تجھ سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی لنڈے بازار جانے کا سوچوں گا بھی نہیں!!"

# پشاور میں رکشہ اور ڈرائیور

سکندر حیات بابا

کسی جگہ کے بارے میں سننا یا پڑھنا اور بذاتِ خود جا کر وہاں کا مشاہدہ کرنا دو بالکل الگ باتیں ہیں بعض اوقات لکھنے یا سنانے والے کا اندازِ بیاں اس قدر دلچسپ اور دلپذیر ہوتا ہے کہ ملتان کی گرمی کا سن کر وہاں کی تپتی دھوپ میں جلنا بھی سعادت لگتا ہے یا پھر کچھ لوگ جو خواہ مخواہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت بد میں مبتلا ہوتے ہیں کسی مقام کے بارے میں پھر چاہے وہ کوئی شہر قصبہ ہو یا کوئی گاؤں اس طرح کی خبر دیتے ہیں کہ وہ علاقہ ''دوزخ'' معلوم ہوتا ہے اور آپ وہاں جانے کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ جاتے ہیں۔

پشاور لاری اڈہ میں بس سے اترتے ہی میرا پہلا احساس انتہائی خوشگوار تھا۔

ضرورت سے زیادہ عظیم جذبہ حب الوطنی سے سرشار آزادی صحافت کے علمبردار قومی بلیڈ پریشر کو مسلسل بلند تر رکھنے میں مصروف ہمارے میڈیا کی ہیجان افروز رپورٹنگ کے سبب میں یہ گمان رکھنے میں حق بجانب تھا کہ وہاں ہر طرف ایک "ہو" کا عالم ہوگا، لیکن لوگوں کی بھرپور چہل پہل بلکہ اچھی خاصی دھکم پیل اور معمول کے مطابق نقل و حرکت نے امن و امان کے حوالے سے میرے تمام خدشات کو رفع کر دیا۔

میں نے منزل مقصود تک جانے کے لیے بغیر میٹر ٹیکسی اور رکشے والوں سے روایتی ''مذاکرات'' کیے، اس طرح کے مذاکرات ملک بھر میں عام کیے جاتے ہیں، اور تقریباً ہر پاکستانی الحمدللہ ان کا عادی اور ماہر ہو چکا ہے، اگر آپ محض کسی کے شریفانہ حلیے اور اندازِ تخاطب کی وجہ سے اعتبار کر کے ٹیکسی لیں گے تو نہ صرف یہ کہ دوگنا کرایہ ادا کرنا پڑ سکتا ہے بلکہ غلط جگہ پر اُتر کر سخت ذہنی کوفت کا سامنا بھی کر سکتے ہیں۔

رکشہ والے کا میلا کچیلا لباس اس کے سلجھے ہوئے اندازِ گفتگو سے ہرگز میل نہیں کھاتا تھا، اس کی دلچسپ ہنس مکھ شخصیت اور مناسب کرایہ کے پیش نظر میں نے اسے دوسروں پر ترجیح دی اور ہمارا سفر شروع ہوگیا۔

پشاور کے روڈ بھی پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح بری طرح تباہی اور خستہ حالی کا شکار نظر آئے، بعض جگہ دور سے محسوس ہوتا کہ آگے کوئی انڈر پاس ہے لیکن قریب ہو کر انکشاف ہوتا کے وہ کوئی گہرا کھڈا ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری غنڈوں کی مفاد پرستانہ محنت کا نتیجہ ہے۔

تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد دائیں طرف خاردار تاروں سے گھری ایک پرشکوہ عمارت نظر آئی، رکشہ ڈرائیور سے استفسار کیا تو اس کے فوراً اور بے دھڑک جواب نے مجھے حیران کر دیا

"جی یہ چوروں کا گھر ہے"

اِس سے پہلے کے میں کچھ کہتا اس نے خود ہی وضاحت کی ۔۔۔"یہ ہماری صوبائی اسمبلی ہے جناب!"

اسکے تپے ہوئے انداز پر میں بے اختیار مسکرا دیا۔

اِسی روڈ پر مزید تھوڑی دور جانے کے بعد اسنے ایک اور عمارت کی طرف اشارہ کیا "اور یہ عمارت دیکھیں، سرکاری طور پر دورانِ تعیناتی یہاں بڑے ڈاکو رہائش رکھتے ہیں اسے گورنر ہاؤس کہتے ہیں۔"

میں پوری طرح اس کی بات سے محظوظ بھی نہ ہوا تھا کہ اسنے مزید "گلفشانی" کی ۔۔۔"اور یہ بائیں طرف کی عمارت عجائب گھر ہے، اس عجائب گھر کی خاص بات یہ ہے کے یہ ایک بڑے عجائب گھر میں تکلفاً قائم کیا گیا ہے ہمارا پورا ملک ہی ماشاءاللہ کسی بڑے عجائب گھر سے کم تو نہیں۔۔۔"

مزید تقریباً دس منٹ سفر کے بعد سڑک کنارے میں نے ایک خستہ حال عمارت کے بارے میں دریافت کیا، زندہ دل رکشہ ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔۔۔"یہ مستقبل کا عجائب گھر ہے جی، انشاء اللہ جلد ہی اسے بھی سرکاری طور پر عجائب گھر قرار دیا جائیگا، اور ہم اپنے بچوں کو یہاں لایا کریں گے"

میں نے غور سے اس عمارت کا جائزہ لیا کسی جابر فاتح قوم کے ہاتھوں لٹی ہوئی بری طرح سوتیلے پن کا شکار وہ پشاور مین ریل سٹیشن کی عمارت تھی۔

تقریباً بیس پچیس منٹ مزید سفر میں رکشہ والے کی دلچسپ لائیو کمنٹری جاری رہی، آخرکار اسنے ایک جگہ رکشہ روکا مجھے منزل آنے کی خبر دی میں نے بائیں جانب ایک اور پھیلی ہوئی پرشکوہ عمارت کے بارے میں کرایہ ادا کرتے ہوئے پوچھا "تم نے اسکے بارے میں نہیں بتایا یہ کونسی جگہ ہے؟"

اس نے رکشہ اسٹارٹ کیا، مسکرا کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو ہرگز میرا وہم نہیں ہو سکتے ۔۔۔"یہ پشاور یونورسٹی ہے جناب! وہ جگہ جہاں سے فراغت کے بعد اگر سفارش ہو تو سرکاری ڈاکو نہیں تو مجھ جیسے رکشہ ڈرائیور پیدا ہوتے ہیں!!"

سید عارف مصطفیٰ

# مہمانِ خصوصی

کوئی اگر ہم سے دریافت کرے کہ مہمان خصوصی کیا ہوتا ہے تو ہم جواب میں اس سے اپنا سوال درست کرنے کو کہیں گے کہ میاں یہ پوچھو کہ بھلا مہمان خصوصی کیوں ہوتا ہے، اور کیسے ہوتا ہے؟؟ ویسے اس بات کا ایکدم صحیح جواب تو مدعو کرنے والے ہی دے سکتے ہیں کہ مہمان خصوصی کیوں ہوتا ہے لیکن اس کا کسی نہ کسی حد تک درست جواب کوئی ''مہمان خصوصی'' بننے کا تجربہ رکھنے والا بھی دے ہی سکتا ہے جیسے کہ ہم ۔۔۔ کیونکہ مابدولت بھی ایک بار اِس سحر انگیز مسند پہ بٹھائے جا چکے ہیں۔

زیادہ عرصہ پرانی بات نہیں ایک بار جب ایک انگلش میڈیئم اسکول والے کسی ایسی موٹی اسامی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بہت ہلکان اور نہایت لیٹ ہوگئے کہ جو اُن کی سالانہ تقریب تقسیم اعزازات کے لیئے اپنی جیبیں جھاڑ سکے اور تقریب میں صرف دو ہی دن باقی رہ گئے تو بالآخر وہ اس مقولے کے قائل ہو ہی گئے کہ ''مقدر سے زیادہ نہیں اور نصیب سے کم نہیں'' یوں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور انہیں گذارا کرنے کے لیئے ہم ہاتھ لگ گئے۔

اگرچہ ٹی وی کوئز پروگراموں میں سوالوں کے جواب بتا کر دو بار کاریں جیتنے کی ہماری تھوڑی سی شہرت اُن کے بہت سارے آنسو پونچھنے کے لئے کافی نہیں تھی لیکن ''کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے'' کے اصول پر ہم سے ہمارے ایک دوست کے حوالے سے رابطہ کیا گیا، مزاجاً ہم جدت پسند ہیں لہٰذا اُن کے مدعو کیئے جانے پہ ہم نے آغاز ہی روایت شکنی سے کیا، وہ ایسے کہ ہانکا لگا کر گھیرے گئے۔ مہمان خصوصی کی جانب سے عاجزانہ انکار کرنے کی روایت زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے یعنی تاریخی طور پر فوری ہاں کہنے سے گریز کیا جاتا ہے اور آخری نتیجہ بہر حال انکسار سے کیا گیا اقرار ہی ہوتا ہے، لہٰذا ہم نے روایت توڑ دی لیکن اپنے دوست کا دل نہ توڑا اور کسی حد تک فوری ہاں کہہ دی۔۔۔ ویسے ہم اس ہاں کہنے میں ہم ذرا وقفۂ سکوت تو لے آئے تھے لیکن جب صاف نظر آیا کہ سندیسہ لانے والا وافر حد تک روکھا ہے اور اصرار کرنا تو در کنار نشست سے بے نیازانہ تین چوتھائی مقدار تک اٹھ بھی چکا ہے تو پھر شتابی سے سر بھی ہلایا اور منہ سے بھی ہاں کہہ دی کہ مبادا کسی ایک قسم کے اقرار پہ اکتفا سے ہماری تسلیم و رضا کی تشریح اس تک صحیح طور پہ منتقل نہ ہو سکی ہو۔

مہمان خصوصی بننے کی یہ اوّلین دعوت قبول کرتے ہی ہمیں اپنے اندر یکا یک کئی تبدیلیاں سی آتی محسوس ہوئیں۔ اوّل تو یہ کہ تمام رگ و پے میں ایک عجب سرشاری سی چھا گئی اور چال میں ایک نامعلوم سی تمکنت آپ ہی آپ در آئی، دوئم یہ کہ اپنے اردگرد کا ہر

فرد بلکہ دور دور تک دکھائی دینے والی تمام ہی مخلوق بہت "عمومی عمومی" سی دکھائی دینے لگی لیکن اس کے باوجود باقیماندہ دن ہم نے اپنے ہر ملنے والے کو بہت دلداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اس اعزاز کی خبر کا شریک کرلیا تا کہ بعد میں شاکی نہ ہو کہ "ہمیں تو بتایا ہی نہیں۔" یہ ہمارا بڑا پن تھا لیکن کئیوں کا ظرف بہت کم نکلا، مبارکباد تو کسی نے نہ دی البتہ کچھ تو باقاعدہ کھلکھلا کر ہنس دیئے اور چند حاسدوں نے منہ در منہ ایسے تبصرے کرنے شروع کردیئے کہ "ہمارے ملک میں واقعی تعلیم کا شعبہ بری طرح ابتری کا شکار ہے" یا یہ کہ "ہماری درسگاہوں کا معیار بہت روبہ زوال ہے" وغیرہ وغیرہ۔۔۔

حاسدین کا یہ رویہ ہمیں نڈھال ہی کرڈالتا جو اگر ہم کسی قدر بے حسی سے کام نہ لیتے پھر بھی یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ جو درحقیقت ابھر کر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ تقریب تقسیم اعزازات واسناد کی اس تقریب میں ہم کیا تقریر کریں گے اور آخر کس طرح وہاں موجود ہر جن و بشر کو اس تھوڑے سے وقت میں اپنی بے پایاں صلاحیت سے اس درجہ متاثر کرسکیں گے کہ وہ ہماری وہاں موجودگی پر بے حساب نازاں ہوں اور بعد میں ہر تیرے میرے کو ہمارے تاریخی فرمودات سے آگاہ کر کے اسے بھی اپنے لازوال فخر کا حصہ بنا سکیں۔

اِس فاضلانہ تقریر کے لیئے ہم نے بسرعت تمام کئی پرانی بقراطی سی موٹی موٹی کتب گرد جھاڑ جھاڑ کر مطالعے کی میز پہ سجادیں، نامور ادیبوں کی اہم نگارشات کا انتخاب کر کے میز پہ جمایا۔۔۔ چونکہ مشاہیر کے اقوال زرّیں ٹانکنا بھی اچھی تقریر کے سامان زیبائش میں داخل ہے چنانچہ اس کی بھی دو کتابیں سامنے رکھ لیں۔۔۔ ایکا ایکی یاد آیا کہ تقریر کو موثر بنانے کے لیئے اشعار کا سہارا بھی تو لیا جاتا ہے سو چند بیت بازی کی کتابیں بھی خوب کس کے پونچھی گئیں۔

اب جبکہ یہ رسد اکٹھی ہوئی تو کیا دیکھا کہ میز پہ ایک چھوٹا سا پہاڑ سا کھڑا ہوگیا ہے کہ جسے دیکھ کر ہمارا دل بیٹھ گیا، تھوڑے سے بادام اور چار مغز پھانک کر قدرے تقویت ملی تو خود کو تسلی دے کر دل اور قلم تھام کر تقریر کا لخت لخت سامان جوڑنے بیٹھے پھر نجانے بہت دیر تک کیا کیا لکھا جاتا رہا لیکن تھک تھکا کر جب پڑتال کی تو سب عبارت اوٹ پٹانگ سی محسوس ہوئی۔ سب کچھ علمی بوچھار سے شرابور ہو کر خلط ملط ہوگیا تھا۔۔۔ منشی پریم چند نابکار ورڈزورتھ کے کندھوں پہ سوار ہوگئے اقبال شیکسپیئر کے مکالمے بولنے لگے۔۔۔ نکلسن اور نطشے کے اقوال زریں عطاء اللہ شاہ بخاری اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ گندھ گئے اور اور فیض و غالب مل کر بوسیدہ برٹینڈرسل کے سینے پہ چڑھ بیٹھے تھوڑی ہی دیر میں ہماری تقریر کے مسودے پہ عجب سی گھمسان کی جنگ نظر آنے لگی جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نطشے کا گلا دبا رہے تھے کہ جس میں سے پیہم جوش کے اشعار ابل رہے تھے اور مسز نائیڈو کا چونڈا نکلسن کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ ہر طرف آغا حشر کی لائنوں نے حشر نشر کیا ہوا تھا لیکن وہ خود ابراہام لنکن وابوالکلام کی پھنکی لگا رہے تھے اور سرسید و حالی ایک طرف کھڑے لاحول پڑھتے ہوئے ہانپ رہے تھے۔

دلبرداشتہ ہو کر جب ہم اپنی چھٹی ہوئی تقریر کا چھٹا مسودہ پھاڑ کر نہایت ہی مایوسی کے عالم میں اس کا بڑا سا گولا بنا رہے تھے تو اسی وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال گونجا کہ "میاں پہلا پہلا موقع ہے، آخر اتنی بیٹھا شہ محنت کی کیا ضرورت ہے، پھر سامعین میں بالغوں کی تعداد بھی تو بہت کم ہی ہوگی سو اتنے جھنجھٹ میں کیوں پڑا جائے، ابھی تو فی الحال کام چلانے والی ترکیبیں آزمائینگے یعنی اسکول اور اسکی انتظامیہ کی خوب خوب روایتی سی تعریفیں کرڈالیں گے، داد کے کم ازکم درجن بھر ڈونگرے برسائینگے، طلباء کی ذہانت کے بھی زبردست قصیدے سنادیں گے اور جس جس جملے پہ تالیاں بجیں اسے کم ازکم دو ورنہ تین بار تو لازمی دہرائیں گے اور اپنی ایڑی پہ دائیں بائیں گھوم گھوم کے اور سامعین کو تاک تاک کے مزید داد دبوچیں گے اتنا کچھ کہنے اور کرنے کے بعد پھر بھی وقت بچ رہا تو تعلیم کے مقاصد اور قومی نصب العین ٹائپ عنوانات پہ بھی کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کر دیکھیں گے۔۔۔ اگر یہ کوشش کامیاب رہی تو آئندہ کہیں اور، ورنہ وہاں تو لازماً تقریر کے کئی مواقع اور مل جائیں گے، پھر کیا ہے دیکھتے ہی دیکھتے خاصے رواں ہوجائیں

گے اور پھر بعد میں سب عالمانہ و فاضلانہ کسر نکال ہی لیں گے۔"

ایک اور اہم پریشانی جو لاحق ہوئی وہ کپڑوں کے انتخاب کی تھی۔۔۔گرمی کا موسم نہ ہوتا تو مسئلہ ہی نہ تھا، کوئی بھی مناسب سا سوٹ ڈاٹ لیتے کہ جس پہ دلکش سی ٹائی عجب بہار دیتی اور خواتین اسٹاف سے ستائش بھی یقینی ہوتی، مشکل یہ تھی کہ وہاں کرتا شلوار بھی نہیں چڑھایا جاسکتا تھا کہ اسے دائم اردو میڈیم ملبوسات میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ تقریب ایک نہایت انگلش میڈیم اسکول کی تھی، نہایت کا سابقہ یوں لگایا کہ کسی نے بتایا تھا کہ وہاں کے تمام اساتذہ اور اکثر بچے تو کھانستے بھی انگریزی میں ہیں۔۔۔ لے دے کر نگاہِ انتخاب اس سفاری سوٹ پر ٹھہری جو دو سال پہلے ہم نے اس وقت سے پہننا ترک کر دیا تھا کہ جب ایک شادی کی تقریب میں عین اسی کپڑے اور اسی رنگ کا سفاری سوٹ ہم نے اپنے میکینک کو پہنے پایا تھا مستزاد یہ کہ نیا ہونے کے باعث یا میکنک کی خوش شکلی کے سبب ہمارے بزرگ سفاری سے زیادہ دمک رہا تھا، بہرحال اسے ارجنٹ ڈرائی کلیننگ پہ بھیجا گیا تو اِک ذرا سکون کی سانس آئی۔

اب سب تیاری مکمل تھی اور خدشات کا بھی غبار چھٹ چکا تھا کیونکہ ہمیں گھر سے ڈھونے اور واپس انڈیلنے کی ذمہ داری اسی دوست کی لگائی گئی تھی بس اک ذرا تردد رفع کرنے کو ہم نے اسے اگلے روز تین بار فون کر کے یہ یقین دہانی حاصل کرلی کہ آیا اس کی گاڑی کے جملہ پرزہ جات مستحکم ہیں اور وہ سواری کسی بھی طرح عین وقت پہ دھوکہ دینے کی ویسی تاریخ خصلت تو نہیں رکھتی جیسا کہ ہماری گھریلو خبیث مشینریوں کا وطیرہ ہے- چوتھی مرتبہ سب تیل پانی چیک کرنے کی ہدایت کے لیئے دوست کو آخر شب فون کیا تو نجانے کیا ہوا وہاں سے فون اٹھاتے ہی بند ہوگیا اور پھر مسلسل بند ہی ملا۔۔۔تمام شب عجب بے چینی سی رہی-

اگلا دن تقریب کا تھا اور اس روز شاید سورج معمول سے بہت ہی دیر سے طلوع ہوا پھر بھی صبحدم جب ہم بیرونی کھڑکی کے انتہائی بائیں جانب سے سڑک پہ نظریں گاڑے دوست کے منتظر تھے۔اس کی گاڑی انتہائی دائیں جانب سے آن پہنچی، جھٹ سوار ہوئے اور گاڑی چل دی لیکن جلد ہی تشویش ہوئی کہ دوست سے جو بات بھی پوچھتے ہیں آگے سے وہ صرف "ہوں" کہتا ہے اور کوئی جواب نہیں دیتا، پھر یکدم بات سمجھ میں آگئی، گھبراہٹ، غلطی و عجلت سے ہم کار کی پچھلی نشست پہ بیٹھ گئے تھے اور وہ ڈرائیور سا معلوم ہو رہا تھا۔گاڑی رکوا کر معذرت کر کے اگلی نشست پہ آئے، اس بیچارے نے اچھے بھلے ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ شاید اس سحر خیزی و عجلت میں ہم سے رہ گیا ہو، ناشتہ تو ہم علی الصبح ہی کر چکے تھے لہٰذا معذرت کی لیکن اُس نے جب یہ کہا کہ اور کھالیجیئے وہاں تقریر کے لیئے بہت توانائی درکار ہوگی اور آواز بھی ذرا مضبوطی سے نکلے گی تو گویا حجاب کا پردہ دفعتاً ہٹ گیا اور سب سامان خورد و نوش لمحوں میں سمٹ گیا۔۔۔اس کے بعد آخر آخر اپنے سراپے پہ نظر ڈالنے کے لیئے دو تین بار اپنی سمت کا سائڈ والا شیشہ اپنی طرف موڑا۔۔۔ نک سک سے درست تھے مگر دوست کا کہنا تھا کہ چہرے پہ آٹھ بجے ہی بارہ کا وقت براجمان تھا ذرا رستے کی ہوا لگی تو بالوں سے فارغ ہوتے سر پہ جو چند بال لٹے پٹے قافلے کی ٹوٹی طنابوں کی مانند سر پہ ادھر ادھر پڑے دکھتے ہیں، انہیں یکبارگی سرور ملا اور انہوں نے اٹھ کر بھنگڑا ڈال دیا اور پھر باہم بغلگیر ہوگئے۔ انہیں واپس بٹھاتے بٹھاتے منزل آن پہنچی جو کہ ایک کشادہ بینکوئیٹ ہال تھا۔۔۔آجکل بڑے اسکولوں کا بڑا پن شاید اسی طرح نمایاں ہوتا ہے، گاڑی سے یوں اترے بلکہ اتارے گئے کہ گویا دولہا ہیں اور عروسی مسند تک بہت ناز اور احتیاط سے پہنچانے کا فریضہ ان کارکنوں کو سونپا گیا ہے کہ جنہوں نے لپک کے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔آن کی آن بینڈ بجاتی اسکاؤٹوں کی یونیفارم پہنے طلباء کی ایک ٹولی سامنے صف بستہ ہوگئی، دفعتاً ایک لڑکا جس کے تیور خطرناک اور ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار تھی چیختا چلاتا ہوا تڑک کر ہماری سمت آگے بڑھا، خدشہ ہوا کہ شاید اس کے مزاج کے خلاف ہمیں مہمان خصوصی بنایا گیا ہے اور ابھی چیر کے رکھ دے گا۔۔۔مصر کے انوار السادات کا انجام یاد آیا لیکن اس نے تلوار دوسرے ہاتھ میں تھام کر یکدم زور سے ایڑیاں بجا کر ہمیں سلیوٹ کیا تو جان میں جان آئی-

پھر وہاں ہال کے وسط میں بچھائے گہرے سرخ قالین کی پٹی پہ خراماں خراماں اس عالم میں چلائے بلکہ ٹہلائے گئے کہ وہ تلوار بردار آگے آگے تھا جس کے مزید آگے چار اسکاؤٹس مسلسل بینڈ بجائے جا رہے تھے اور ہمارے ساتھ دائیں بائیں دو اسکاؤٹس اپنی بغل میں دبی چھڑی کے ایک سرے کو پکڑے ہوئے مستعدی سے چل رہے تھے۔۔۔سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہم چل نہیں رہے تھے ہواؤں میں اڑ رہے تھے، ہم نے اس طرح کے استقبالی مناظر ٹی وی پہ کئی بار دیکھے ہیں اور ہر بار مسحور ہو کر رہ گئے ہیں شاید اسی سبب یا کمال نشاط سے ایک بار تو یہ بھی جی چاہا کہ اس سے تلوار لے کر ہم خود ہی ٹھکا ٹھک آگے آگے چلیں لیکن یہ ممکن بھی نہ تھا اور پھر ماضی کی سبھی نقابیں الٹ جاتی ہیں۔لیکن ہمارا البیلا دل تھا کہ کبھی اس پزیرائی پہ متبسم ہوتا تھا تو کبھی اگلے مراحل سے وابستہ وسوسوں پہ رو رو اٹھتا تھا، اسی خرام کے دوران پتلون کی گرفت میں مفسدانہ کشادگی سی محسوس ہوئی، آناً فاناً روشن ہوا کہ اس دو سالہ وقفے میں ہماری دیرینہ وفادار پتلون خاصی ڈھیلی ہو چکی ہے اور ہم عجلت میں اسے بیلٹ کی لگام دینا بھول گئے ہیں اور اب پتلون پہ کشش ثقل پوری طرح اثر انداز ہے۔۔۔بس پھر کیا تھا پانچوں حواس پہلے تو غائب ہوئے اور پھر اسی بیلٹ پہ آ کر لم لیٹ ہو گئے۔۔۔بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک بندہ ان کا شکار نہ ہو جائے ان کی شدت اور گہرائی کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، مجھے پورا یقین ہے کہ کسی اوسط فرد کے لیئے اس کی ڈھیلی پتلون میں بیلٹ نہ ہونے کا مسئلہ تیسری عالمی جنگ چھڑ جانے کی خبر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔

وہ اسکاؤٹس ہمیں بلند کرسی والی مسند پہ چھوڑ کر جب چوکسی سے پلٹے تو ہماری تو دنیا ہی بدل چکی تھی،،، بیلٹ کی عدم موجودگی نے جیسے ہمارے ذہن کی بتی ہی بجھا دی تھی، دنیا اندھیر ہو چکی تھی، ایک لمحے کو تو یکبارگی یہ لگا کہ ہم مفت میں مارے جانے والے ہیں اور دل یہ چاہا کہ انہی پلٹتے مستعدین کے ساتھ ہی اپنی پتلون دونوں طرف سے تھام کر شتابی سے واپس ہو لیں اور بگولے کی مانند تیزی سے باہر نکل جائیں گاڑی میں بیٹھنے کا تردد بھی نہ کریں

بس منہ اٹھا کر بگٹٹ بھاگ نکلیں اور فنافٹ قریب سے گزرتی کسی آتی جاتی سواری میں لد جائیں لیکن مسند پہ موجود دو کرسیوں میں سے ایک پر اسکول کے مالک براجمان تھے جنہوں نے اٹھ کر لپک کر اس طرح مصافحہ کیا اور نشست پہ بیٹھنے تک اس طرح ہمارا ہاتھ نہ چھوڑا کہ گویا ہمارے فرار کی سوچ ان پہ آشکار ہو چکی ہے۔۔۔وہ اس نوعیت کے عجب اور قطعی خاموش آدمی تھے کہ جنہیں خود بخود وقفے وقفے سے مسکراتے رہنے کی ایسی تجارتی مشق ہو چکی ہوتی ہے کہ باقی چہرے کو کانوں کان خبر نہیں ملتی، وہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب آدمی تھے ایک بڑے اسکول کے مالک تھے لیکن ہمارے نزدیک ان کی خوش قسمتی کی فوری اور بڑی علامت وہ بیلٹ تھی جس نے انکی پتلون کو ان کی ٹھاٹھیں مارتی توند سے بخوبی پیوستہ کر رکھا تھا اور وہ آسانی سے پیہم مسکرا سکتے تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی تقریب شروع ہوگئی اور تھوڑی دیر بعد جبکہ ہمارا ذہن کسی سنگینی میں الجھا ہوا تھا اور نظر سامنے کسی رنگینی سے سلجھنے کے لیئے آمادہ نہ تھی، وہاں بھنبھناتی چند مکھیوں نے ہماری ناک پہ بیٹھنے کی ضد کرلی۔

بات یہ نہیں کہ ہم ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دینے کے خصوصی طور پہ قائل ہیں بلکہ ہم تو درحقیقت مکھیوں کو کہیں بھی بیٹھنے نہ دینے کے لیئے ہمیشہ سے پرجوش رہے ہیں اور جھپٹ کر کسی چیز سے ان پہ حملہ آور ہو جاتے ہیں لیکن یہاں برسرِعام اپنی ہی ناک پہ جھپٹنا نہایت دلدوز نظارے میں بدل سکتا تھا۔۔۔لہٰذا دو چار بار، ہاتھ میں دبے بروشر کو ان کی جانب جھلا تو وہ اڑ کر ہمارے صاف ہوتے ہوئے سر کے پلیٹ فارم پہ جا بیٹھیں، اور پھر خرابی یہ ہوئی کہ فدوی کی چندیا پہ ان کی مستقل چاند ماری سے یکایک کھجلی کی شدید خواہش نے انگڑائی لی لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مہمان خصوصی وہ بدنصیب مہمان ہوتا ہے کہ جسے خصوصی طور پہ منع ہے کہ وہ ممنوعہ حصوں کے علاوہ بھی کہیں نہ کھجائے لیکن یہ بات مکھیوں کو کیسے معلوم ہوتی ہے یہ راز ابھی تک نہیں کھلا۔ آپ نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ مہمان خصوصی عموماً گنجے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں ایک رومال دبائے رکھتے ہیں۔۔۔کچھ نہ کھجا سکنے کی تلافی کے طور پہ وہ اپنے اس رومال سے کئی بار سر پہ بڑی بے نیازی مگر واضح عجلت کے ساتھ پونچھا سا مار لیتے ہیں۔۔ اس پونچھے کے لیئے وہ نمی کی فراہمی کے لیئے پسینے سے مدد لیتے ہیں اور ہر بار نہ صرف خارش کو آرام ملتا ہے بلکہ ان کا پلیٹ فارم بھی یکبارگی جگمگا اٹھتا ہے جس کی وجہ سے تھوڑی سی رونق چہرے پہ بھی چکر لگاتی رہتی ہے لیکن ہمارے پاس گنج تو تسلی بخش حد تک میسر تھا تاہم اسے تسکین و تازگی بہم پہنچانے کے لیئے کوئی رومال نہ تھا لہٰذا ضبط کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور بلاشبہ تا دیر جاری رہنے والی یہ مشق ضبطِ نفس کی تربیت کے لیئے مہارت تامہ تک پہنچانے والی مشقوں میں سے تھی اتنی دیر میں مائیکروفون پہ کس نے کیا کہا یہ انہی مکھیوں کے علم میں ہے کیونکہ ہماری توجہ بس ان کی تخریبی سرگرمیوں تک ہی محدود ہو چکی تھی، اگر اسکول کے مالک جلد ہی یہ سب بھانپ کر ایک پنکھا وہاں نہ لگواتے تو اسی دل لگی میں محفل تمام ہوتی تھی۔

اِدھر ہم مکھیوں کے ساتھ مہابھارت کر کے فارغ ہوئے اُدھر مائیک پہ کسی مقدس بزرگ کی شان میں کوئی قصیدہ سا پڑھا جانے لگا، پڑھنے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا سا فریم تھا اور وہ اسی میں سے جھانک جھانک کر پڑھ رہا تھا، ہم نے گمان کیا کہ کسی روحانی شخصیت کا تذکرہ ہے اور اس کے عظیم الشان نورانی عرس کی دعوت عام دی جانے والی ہے لیکن یکلخت بیچ میں جب ہمارا نام لیا جانے لگا تو پہلے سخت حیرانی ہوئی اور پھر اس سے بھی شدید پشیمانی ہوئی کیونکہ اس خطاب میں (کہ جس کے بارے میں بعد میں علم ہوا کہ وہ ہمارے اعزاز میں دیا گیا خطبہ استقبالیہ تھا) ہمارے ان اوصاف حمیدہ کو تلاش کر لیا گیا تھا کہ جن میں سے کوئی ایک بھی ہم میں موجود دیکھنے کی تمنا میں ہمارے والدین بھی کے جنت مکانی ہو چکے تھے۔ یہ ان خواہشوں اور تمناؤں سے لبریز ایک ایسا کیریکٹر سرٹیفکیٹ تھا کہ جس کے اہم اجزاء کی تکمیل کبھی ہمارے بس کی بات نہ تھی اور محض اس ایک خطبۂ استقبالیہ کو دکھا کر مزید تازہ نکاح نہ بھی سہی زکواۃ کونسل کا چیئرمین بننے کی کامیاب کوشش ضرور کی جا سکتی تھی۔ اس خطبۂ استقبالیہ کے بعد چند تعریفی تقریریں اسکول اور اس کی انتظامیہ کے لیئے نہایت یتیمانہ انداز میں کی گئیں

جن سے واضح ہوتا تھا کہ بالآخر دنیا میں ایک ایسا اسکول قائم ہو چکا ہے کہ گو وہ ہے تو زمین پر لیکن اس کے سارے معاملات جنت سے چلائے جا رہے ہیں اور اس کی استانیاں دراصل حوریں ہیں اور اس دور کے کسی بھی طالبعلم کے بدقسمت ثابت ہونے کے لیئے اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اس اسکول میں نہیں پڑھتا ہے۔

لیجیئے اتنے میں وہ گھڑی بھی آن پہنچی کہ جس کے لیئے ہمیں یہاں بلایا گیا تھا یعنی تقریب تقسیم اعزازات کے آغاز کا اعلان ہوا اور ہمارا دم جیسے حلق میں آکر اٹک گیا۔ کمپیئر نے متواتر دوسری بار جب ہمارا نام پکارا تو اٹھنے کی کوشش کی اور یوں لگا کہ جیسے مقتل کو بلائے جاتے ہیں۔۔۔ خود کو تسلی دینے کی کوشش کی اور اس دوران اک عجب بات ہوئی، اسی لحہ ہزار بار کا سنا ہوا یہ شعر ذہن میں گونج گیا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

اس شعر کی تاثیر کچھ ایسی تھی کہ سینہ کسی قدر فخر سے پھول گیا اور ساتھ ہی پیٹ بھی کہ جس سے پتلون اور کمر کے درمیان تفاوت واضح طور پہ کم ہوئی۔ کشش ثقل بھی خاصی ماند پڑی اور اس غیبی مدد سے بے حد اطمینان ہوا، یقین ہو گیا کہ مایوسی کفر ہے اور ہم پھولے پیٹ پہ دھری پتلون سنبھالے اک گونہ وقار کے ساتھ طلباء کو اعزازات دینے میں جت گئے۔ اس دوران پیٹ سانسوں کی آمد و رفت کے ساتھ پھولتا پچکتا بھی رہا اور ہم کسی قدر چوکنی بے نیازی سے کبھی پیٹ پھلاتے رہے اور کبھی دوسرے ہاتھ سے پتلون کو سفاری کے دامن کی اوٹ میں ایڈجسٹ بھی کرتے رہے، لیکن چند کمبخت حاضرین ہم سے بے نیاز نہ رہ سکے اور جب بھی ہم پینٹ ایڈجسٹ کرنے کے لیئے سفاری کی اوٹ میں ہاتھ ڈالتے وہ اپنی سیٹ پہ ذرا تر چھے ہو کر اپنی نگاہیں بھی اسی جانب گاڑ دیتے ، ایسے میں خود اعتمادی سے بڑی دولت کوئی نہیں۔۔ لیکن اعزازات و اسناد تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہ آرہی تھیں۔ اب طلبا ہی نہیں اسٹاف کے لوگوں کو اور نجانے کن کن لوگوں کو بھی بلایا جا رہا تھا اور لگتا تھا کہ آج اسکول کے آس پاس 2-3 کلومیٹر کے علاقوں کا کوئی رہائشی بچ کے نہ جانے پائے گا۔

یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک کچھ اندرونی "آمد" سی محسوس ہوئی۔۔۔ اور طبیعت میں کچھ خلاء سا پیدا ہوا۔۔۔ ماحول کی سب دلکشی رخصت ہوئی اور بڑھتے بحران کا بگل دمبدم اندر ہی اندر بجنے لگا لیکن کیا کیجیئے کہ ٹیکنالوجی کے اس تیز رفتار دور میں بھی جبکہ انسانی خیالات کی لہریں تک ریکارڈ کی جانے لگی ہیں ہمارے یہاں کے منتظمین انسانی ضرورت کے طوفان کی لہریں بھی نہیں بھانپ سکتے اور مجبوری کی یہ آفاقی و بین الاقوامی زبان تک نہیں سمجھتے کہ جب کوئی مہمان خصوصی ماحول سے اچانک لاتعلق سا ہو جائے اور بار بار خلاؤں میں گھورتا پایا جائے تو سمجھ لیجئے گا کہ "خصوصی آمد" ہے اور اسے خصوصی مقام رخصت یعنی بیت الخلاء تک پہنچانا لازم ہے ورنہ حالات مہمان و میزبان دونوں کے لیئے نہایت سنگین ہو سکتے ہیں، بالائے ستم یہ کہ اسی انقباضی کیفیت یا بھینچ بھانچ میں تقریر کی نوبت بھی آ گئی۔

یہ وہ مرحلہ تھا کہ ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ رہے تھے اور نجانے کہاں کہاں سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ میزبان نے روایتی تجارتی مسکراہٹ سے مائیک پہ جانے کا اشارہ کیا تو ہم جوابی مسکراہٹ برآمد کرنے کا رسک نہیں لے سکے کیونکہ ایسا کرنا ضبط و احتیاط کے تقاضوں اور ماحولیات کے لیئے مہلک ہو سکتا تھا۔۔۔ ہم بہت تھم تھم کر ڈائس تک پہنچے،، حاضرین کے لیئے مہمان خصوصی کی یہ حد درجہ پروقار چال بہت متاثر کن تھی لیکن اس کی اصل وجہ اس کے سوا کوئی بھی نہ جانتا تھا۔۔۔ مائیک منہ کے سامنے آیا تو اندر کی دنیا زیروزبر ہو رہی تھی، مسلسل ضبط کے باعث اب سانس پھولنے اور آواز بھرانے لگی تھی، داخلی شدید اُبال کے سبب جبڑے بھینچ کر سسکارتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکے۔۔ "خواتین و حضرات بہت دیر ہو چکی ہے اس لیئے میں اس وقت تقریر کر کے آپکا مزید وقت نہیں لینا چاہتا مجھے بھی جلدی ہے، آپ کو بھی گھر جانا ہے لہٰذا خدا حافظ" اور یہ کہ کر ہم نے دونوں ہاتھوں سے پتلون تھامی اور اسٹیج کے عقبی دروازے کی جانب چھلانگ لگا دی۔

مزمل حسین چیمہ

# شعریت

انسانی دماغ کی ایک خاص حد رکھی گئی ہے دماغ اگر وہ حد پار کر جائے تو انگریزی میں اُسے سائکی پرابلم کہتے ہیں جو کہ اکثر سرائیکیوں میں پائی جاتی ہے اور اردو میں نفسیاتی مریض کے ساتھ ساتھ شاعر بھی کہتے ہیں۔ شاعر بنا نہیں جاتا شاعر بنایا ہوتا ہے یہ ایجاد نہیں ہوتا بلکہ معرض وجود میں لایا جاتا ہے۔ اور انہیں معرض وجود میں لانے کا تمام تر ٹھیکہ مخالف جنس نے اٹھا رکھا ہے۔ شاعر کئی طرح کے ہوتے ہیں ایسا کئی بار سنا مگر جب تحقیق کی تو حاصل نتیجہ فقط ایک بات تھی کہ شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ شاعر اچھے ہوتے ہیں اور کچھ اچھے شاعر ہوتے ہیں۔ جو شاعر اچھے ہوتے ہیں اصل میں وہ صرف شاعر اچھے نہیں ہوتے ہیں بلکہ بہت اچھے شاعر بھی ہوتے ہیں اور جو اچھے شاعر ہوتے ہیں وہ اچھے شاعر تو ہوتے ہیں مگر وہ صرف شاعر ہی ہوتے ہیں۔

کچھ سال پہلے ہی میرے گھر والوں کو گماں گزرا کہ مجھے کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ اچھے اچھے ڈاکٹروں سے معائنے کروائے گئے۔ تمام تر ٹیسٹس کی رپورٹیں یکجا کر کے دیکھی تو بھید کھلا کہ شاعر ہو چکا ہوں اب یہی عارضہ میری پہچان ہے۔

دوستوں میں سب سے اچھے دوست وہ ہوتے ہیں جو دوست ہوتے ہیں اس کے علاوہ باقی سب صرف دوست ہوتے ہیں۔ مجھے تمام تر دوست شاعرانہ مزاج کے ملے ہیں برسوں بعد بھی ملیں تو پوچھتے ہیں کہ کوئی نئی تازی اب بھلا انہیں کون سمجھائے کہ جس بیماری کو ہم برسوں سے جھیل رہے ہیں اس میں لفظوں کو تول تول کر رکھا جاتا ہے اور روانی سے پڑھنے پر شعر کہلاتا ہے آخری بار جوڑے ہوئے الفاظ ہی ہمارے لیے نئی تازی ہوتی ہے اپنے مخصوص انداز میں نئی تازی جب بھی سنائی گئی ہے سامنے والے کے موبائل فون کا نیٹ ورک خراب پایا گیا ہے۔ شاعری کی دن بدن گھٹتی عزت میں بھی ان موبائل فونز کمپنیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے ملنے ملانے والے تو زمانے اب نہیں رہے انہی کے سہارے گفتگو و شنید کی کمی پوری کی جاتی ہے۔

زیادہ تر شاعری مستورات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے زیادہ تر اس لیے کہ میری اپنی شاعری ہمہ وقت مستورات کے طواف میں مگن رہتی ہے۔ میرا ایک دوست اکثر مجھے کہا کرتا تھا بلکہ نصیحت فرماتا تھا کہ عورت اور مرد کا تعلق درمیانہ ہونا چاہیے اگر ذرا سا اوپر ہوا تو عورت کو نقصان ہوتا ہے ذرا سا نیچے ہو تو مرد کو۔ اس لیے عورتیں مرد کو نیچا دکھانے میں مصروف رہتی ہیں کیونکہ یہ بات وہ بخوبی جانتی ہیں کہ مرد نقصان کے بعد غلامی کی طرف کھینچا چلا آتا

**ایک اخبار کے ایڈیٹر کا نوٹ**

متعجب نہ ہوں اگر آپ کو اس اخبار میں کوئی غلطی نظر آجائے۔ ہم ہر ایک کی پسندیدہ کو ملحوظ رکھتے ہیں اور کچھ لوگ صرف غلطیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہے۔ اور مرد بھی اس بات سے غافل نہیں ہیں کہ عورت نقصان کے بعد بغاوت پر اتر آتی ہے آج اگر دنیا میں مرد غلاموں کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے جو بھید کھلتا ہے کہ مرد ہمیشہ دماغ سے کام لیتا آیا ہے۔

عورت کے بنا انسانی وجود بیکار ہے ٹھیک اسی طرح میری یہ تحریر بھی عورت کے ذکر کے بغیر بیکار رہ جاتی یہ الگ بات ہے کہ عورت کے ذکر کے باوجود کافی حد تک بیکار رہی ہے۔

شاعر بہت حساس ہوتے ہیں اسی لیے کسی دوسرے شاعر کا ایک اچھا شعر انہیں تیر کی سی اذیت دیتا ہے اور اگر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دوست بھی ہو تو تیر تلوار بن جاتا ہے۔ شاعروں کی اپنی دنیا ہوتی ہے وہ دوسروں کی دنیا میں جھانک جھانک کر اپنی دنیا بنانے میں مگن رہتے ہیں مگر کافی حد تک ناکام رہ جاتے ہیں۔ شاعری میں لفظوں کو گنا جاتا ہے جیسے کہ جمہوریت میں آدمیوں کو مگر دونوں کی اپنی اپنی گنتی ہے۔ شاعر ہر بات سے شعر نکالنے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی گزار دیتا ہے جب لفظ گن گن کر نکالنے ہوں آدمی دانا ہو جاتا ہے اس وجہ سے شاعر حضرات بولتے کم ہیں اور سناتے زیادہ ہیں یہاں سنانے سے مراد وہ نہیں ہے جو میں کہہ رہا ہوں بلکہ وہ ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ کم بولنا ایک طرح سے ایک دانائی صفت ہے۔ کم گوئی شاعروں میں خطرناک حد تک پائی جاتی ہے مگر انہیں دانا کہنا خود شاعر ہونے کے مترادف ہے۔

شعریت ایک ایسا داغ ہے جو محبت کے داغ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ شاعری میں جتنی رقیب الخاص کی تشہیر کی جاتی ہے اتنی کسی دوسرے کے محبوب کی جائے تو آدمی شاعر ہونے سے بال بال بچ سکتا ہے۔ شعریت ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں اس بیماری کے ڈاکٹر سے لیکر کمپاؤڈر تک اس بیماری کی روک تھام کی بجائے اس بیماری کو پھیلانے میں سرگرم ہیں۔

ارمان یوسف

# لندن میں سالِ نو کی شب

سرد ہوائیں، بارشیں اور برف باری جیسے موسم لانے والا دسمبر ہمارے ہاں جدائی، کرب اور اداسی کا استعارا سمجھا جاتا ہے جو کسی حد تک درست بھی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے بڑا قومی سانحہ یعنی سقوطِ ڈھاکہ اسی ماہ میں وقوع پذیر ہوا جس کے افسوس میں ہر سال کئی اداریئے، کالم اور مضامین لکھے جاتے ہیں۔ (معلوم نہیں، آزاد بنگلہ دیش کے باسیوں اور پاکستانی سرکردہ راہنماؤں کی رضا مندی کے باوجود یہ قومی سانحہ کیوں شمار کیا جاتا ہے) اس کے علاوہ اردو کے مایہ ناز شاعر منیر نیازی اور پروین شاکر بھی اسی مہینے ہم سے جدا ہوئے۔ اسی لیے تو بیسیوں شعرا نے دسمبر کو طویل جدائی، تنہائی اور یاسیت کی علامت قرار دیا ہے۔ اب بھلا آپ سے کیا پردہ، ہماری بھی تینوں محبوباؤں نے اسی مہینے میں الوداع کہا۔ یہ الوداع کہنا بھی ہم اپنی وفاؤں کا بھرم رکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں ورنہ تو انہوں نے جھوٹے منہ بھی شادی کارڈ تک نہ بھیجا۔ ہمیں یاد ہے کہ دسمبر ہی میں محبوبہ اول کی رخصتی کے موقع پر ہم ٹیپ ریکارڈر کرائے پر اٹھالائے تھے اور کئی شہیدانِ محبت کے سامنے اس نغمے پر بے مثال پرفارمنس دکھائی تھی: "عاشق کی دعائیں لیتی جا، جا دکھی تجھے سنسار ملے" ارے یہ تو ابھی اسی دسمبر کی بات ہے کہ جانِ محبوبی ماریہ نے بھی کہہ دیا "کون ارمان؟" ہم نے بار ہا کہا "

مجھ سے نظریں چرا کے مت گزرو
میں تمہارا رضا توانہ ہوں

مگر ہر بار "آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا" سننے کو ملا۔ بھائی اور کیا، ابھی تو ہم ایشوریہ رائے کی جدائی کا صدمہ نہ جھیل پائے تھے کہ وینا ملک بھی اسی سال دسمبر ہی میں پیا دیس سدھار گئیں اور ہماری یہ خواہش بھی چکنا چور ہو کے رہ گئی۔

مگر یورپ میں دسمبر میں خوشیوں کا استعارا سمجھا جاتا ہے۔ اسی مہینے کرسمس سب کے لئے خوشیاں لاتا ہے، لوگ عید مناتے اور انجوائے کرتے ہیں، اگلے روز 26 دسمبر "بوکسنگ ڈے" کے موقع پر سال بھر کی خریداری ایک ہی روز میں کر لی جاتی ہے کیونکہ قیمتیں آدھی سے بھی کم ہو کے رہ جاتی ہیں اور شائقین تو رات ہی سے قطاریں بنالیتے ہیں۔ اور پھر نیو ایئر نائٹ! ہر چہرے پر مسکراہٹ اور نئے سال کی آمد کی خوشی۔ لندن میں ہر سال دریائے ٹیم اور بگ بن کے درمیان لندن آئی پر آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جس کا باقاعدہ آغاز 2000ء میں ہوا اور بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق تیس لاکھ لوگوں نے یہ نظارہ کیا۔ نئے سال کے آغاز پر آتش بازی امریکہ، جاپان چین اور دوبئی سمیت پوری دنیا میں کی جاتی ہے۔ اس برس دوبئی نے 10 ماہ کی منصوبہ بندی سے 5 لاکھ شُرلیاں چھوڑ کر ٹاپ پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ اب کے ہم نے سوچا لندن میں ہونے والی آتش باری کا نظارہ اپنی گنہگار آنکھوں سے کیا جائے، سو 31 دسمبر کو گجر پاک اور مانی کو ساتھ لئے برمنگھم سے لندن روانہ ہوئے جہاں رضوان سمیت دوستوں کا ایک جتھہ ہمارا منتظر تھا۔ گجر نے تو لندن پہنچتے ہی

اپنا رُخ قبلہ (محبوبہ کے گھر کی) طرف کرلیا جبکہ ہم نے میزبانوں کے ساتھ پر تکلف دعوت اڑائی اور لندن کے علاقے ایج ویئر میں واقع عمران فاروق (مقتول) کا گھر بھی دیکھا اور دور سے ایم کیو ایم کا دفتر بھی۔ کہ

جب سے یہ معلوم ہوا ہے چاند بھی کالا پتھر ہے
مجھ کو سارے چاند سے چہرے دور سے اچھے لگتے ہیں

خیر ہم زیر زمین ریلوے، جو دنیا کا پہلا انڈر گراونڈ ٹیوب ہونے کا اعزاز بھی رکھتا ہے، کے ذریعے سنٹرل لندن کو روانہ ہوئے۔ خوش قسمتی سے آج رات شائقین کی سہولت کے لئے سفر مفت تھا، اور نہ بھی ہوتا تو بھی بغیر ٹکٹ سفر کا ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتے کہ ہم بھی پاکستانی ہیں۔ سٹیشن پر پہنچتے ہی نیو ائیر نائٹ کے جلوے دیکھنے کو ملے۔ سنہرے بالوں والی گوریاں تقریباً قدرتی لباس میں اٹھلاتی ہوئی ملیں، بعض نے تو شراب کی بوتلیں بھی اٹھا رکھی تھیں اس پر ہم نے سوچا کہ خود تو ظالم 100 بوتل کا نشہ رکھتی ہے اور اوپر سے شراب بھی ساتھ، گویا قیامت ہی قیامت۔

ٹیوب (ٹرین) کے اندر اور سٹیشنوں پر بھی حسب معمول جا بجا جوڑے بغلگیر پائے گئے۔ ایک بار تو ہمارا پاکستانی خون کھول اٹھا اور ہم نے "ماموں" بننے کی ٹھان لی۔ مگر ساتھ بیٹھی گوری نے "ہیپی نیو ائیر" کا راگ الاپتے ہوئے گفتگو کا آغاز کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یوں ہم اسے ہمہ تن گوش سنتے بھی رہے اور تاڑتے بھی رہے۔ آخری سٹیشن بند ہونے کی وجہ سے طویل پیدل سفر کر کے دریائے ٹیم کے کنارے پہنچے۔ مخلوقِ خدا تھی کہ اُمڈتی چلی آرہی تھی۔ ہر رنگ ہر نسل کے لوگ ایک دھن میں ناچتے، جھومتے گاتے ایک ہی منزل کو رواں تھے۔ مطلوبہ مقام پہ پہنچے تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی زن و مرد ایسے گھتم گتھا کہ "تو من شدی، من تو شدم" سخت سردی اور ٹھنڈی ہوا کے باوجود اکثر پاکستانی اور ہندوستانی لونڈے جو دور سے ہی اپنی شکل اور حرکات کی وجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں، ماتھے سے پسینہ پونچھتے نظر آئے۔ بخدا ہمارا دامن پاک رہا، ہم نے کسی کو آنکھ تک اٹھا کے نہ دیکھا (کہ آنکھ اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی) اور آئے بھی اکیلے اس لئے تھے ساری صورتحال سے آپ کو آگاہ کر سکیں۔ الٹی گنتی شروع ہونے سے قبل آس پاس موجود کئی جوڑوں میں سے ہم نے ایک نوجوان جوڑے کو شرفِ گفتگو بخشا اور نئے سال کے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ پتہ چلا کہ نوجوان کو محبوبہ سے زیادہ شرلیوں میں دلچسپی ہے۔ سو اس کی محبوبہ کی اداسی بھی ہم سے دیکھی نہ گئی اور نئے سال کا آغاز ہوتے ہی رنگا رنگ پھوٹتی روشنیوں کے نظارے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس بیچاری کو محبوب کی عدم توجہی کا قطعی احساس اور کمی نہ ہونے دی۔۔۔۔۔۔ سنا ہے اس برس لندن والوں نے 18 لاکھ پاؤنڈ کی لاگت سے آتش بازی کا یہ مظاہرہ کیا جسے سخت سردی اور بارش کے باوجود لاکھوں لوگوں نے دریائے ٹیم کے کنارے براہِ راست دیکھا۔

## Do as Roman's do

ایک امریکی روم (اٹلی) میں چھٹیاں گزار کر آیا، دوستوں نے روداد پوچھی تو اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ میں نے وہاں ایک امریکی ٹورسٹ خاتون سے دوستی کرلی تھی، دوستوں نے کہا، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، امریکی لڑکیاں تو یہاں بھی بیشمار ہیں وہاں تو تمہیں کسی اٹالین خاتون سے دوستی کرنی چاہیے تھی۔

امریکن نے مسکراتے ہوئے کہا "میں کیا کرتا بھئی، وہاں سب لوگ امریکن لڑکیوں کے پیچھے تھے اور وہ مثل تو تم نے سُنی ہوگی کہ

"When in Rome, do as Roman's do

امجد اسلام امجد کے سفرنامے "ریشم ریشم" سے اقتباس

حماد احمد، لاہور

# پندرہ منٹ کی اہمیت

کئی بچے مسلسل دو گھنٹے چیخ چیخ کر والدین سے انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت مانگتے رہتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مدتوں سے "وکٹ حاصل کرنے کو ترسا" ہوا باؤلر امپائر سے "ایل بی ڈبلیو" آؤٹ کی اپیل والتجا کر رہا ہو، مگر ان کی اپیل اتنی سختی سے مسترد کردی جاتی ہے کہ انہیں محض "پندرہ منٹ" کے لئے بھی انٹرنیٹ چلانے کی اجازت نہیں ملتی بلکہ سختی سے سکول سے ملا ہوم ورک مکمل کرنے کا کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کئی چالاک بچے خود بخود ہی صرف "پندرہ منٹ" میں اپنا ہوم ورک مکمل کر کے نہ صرف شاباش حاصل کر لیتے ہیں بلکہ پھر اس کے بعد بغیر کسی روک ٹوک کے "اگلے دو گھنٹے" تک کامیابی سے انٹرنیٹ بھی استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔

☆ کئی مرتبہ گوگل میپس ایک جگہ سے دوسری جگہ کا فاصلہ بتاتے اور سمجھاتے ہوئے "پندرہ منٹ" کا متوقع سفر بھی بتاتا ہے لیکن جب سفر کرنا شروع کریں تو ٹریفک جام میں پھنس پھنس کے منزل تک پہنچتے ہوئے دو گھنٹے بیت جاتے ہیں یوں گوگل میپس کی غلط انفارمیشن کی بدولت دیر سے مطلوبہ جگہ پہنچنے پر انسان اگلے "پندرہ منٹ" تک اپنا سر پکڑے رکھتا ہے۔

☆ ڈاکٹرز کے بقول صرف اور صرف "پندرہ منٹ" مسکراتے رہنے یا سمائل دینے سے انسانی صحت کو اتنا فائدہ پہنچ جاتا ہے جتنا دو گھنٹے نیند پوری کرنے سے ملتا ہے۔

☆ بہت سی لوگ بہترین کوالیٹی والی کنگھی کے ذریعے کافی دیر تک اپنے بال کنگھی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن "پندرہ منٹ" کے بعد بھی ان کے بال دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے سری لنکن فاسٹ باؤلر لاسیتھ ملنگا سامنے کھڑا ہو۔

☆ کئی لوگ اچھی تصویر کھنچوانے کے لئے "پندرہ منٹ تک" کیمرے کو گھورتے ہوئے "رنگ برنگی سمائلز" دیتے رہتے ہیں مگر جیسے ہی "پندرہ منٹ" کی سخت محنت وکوشش کے بعد ست ترین کیمرہ مین کیمرے کا بٹن دبانے میں کامیاب ہوتا ہے، اسی وقت انہیں زوردار قسم کی چھینک آجاتی ہے اور یوں ساری بدقسمت سمائلز گھاس نوش فرمانے چلی جاتی ہیں۔

☆ ایک سروے کے مطابق اکثر لوگ پہلی بار الارم بجنے کے بعد اگلے "پندرہ منٹ" تک ضرور دائیں بائیں "پاسے" مارتے اور جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی مکمل بیدار ہو پاتے ہیں۔

☆ کئی لوگ فیس بک پر اپنی پروفائل پکچر شیئر کرتے ہیں تو محض پندرہ سیکنڈز کے اندر ہی انہیں پندرہ لائیکس مل جاتے ہیں۔ لیکن اگلے "پندرہ منٹ" کے بعد پیج کو "ری فریش" مارنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے لائک کم ہو کر کامیابی سے نالائق سوری

"کم یابی" سے "نالائک" ہو چکے ہیں۔

☆ کئی بار مدد کے حصول کے لئے کسی ادارے کی "کسٹمر سروس سینٹر" جائیں تو پندرہ منٹ بعد باری آتی ہے۔ ایسے میں اگر پندرہ منٹ بعد بھی سروس سینٹر والا یہ پوچھے کہ "کیا میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں؟"، تو مجبوری میں جواب دینا پڑتا ہے کہ:۔ "نہیں حضور والا! میں تو صرف آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لئے ہی "پندرہ منٹ" سے "عشاق" کی لائن میں کھڑا ہوں"۔

☆ کئی بچے اتنے ذہین اور لائق ہوتے ہیں کہ امتحانات میں جو پرچہ باقی بچے تین گھنٹوں میں حل کرپاتے ہیں، وہ صرف "پندرہ منٹ" میں ہی حل کر کے فاتحانہ چہرہ لئے امتحانی ہال سے باہر نکل آتے ہیں۔

کئی سٹوڈنٹس مکمل تین گھنٹے تک بھی پیپر حل کرتے رہتے ہیں۔ ایسے سٹوڈنٹس آخری "پندرہ منٹ" کے دوران اس قدر خوبصورت ہینڈ رائٹنگ سے لکھتے ہیں کہ ان کے اندر کسی ڈاکٹر کی روح سما جانے کا گمان ہوتا ہے۔

☆ لیکچر کا وقت شروع ہونے کے "پندرہ منٹ" بعد تک بھی اگر استاد کلاس میں داخل نہ ہوتو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ استاد جی نے آج مکمل چھٹی کرنی ہے۔۔

☆ کئی مرتبہ موبائل پر "کسی اہم شخصیت کی طرف سے" ایسا عجیب وغریب قسم کا ایس ایم ایس یعنی میسیج آجاتا ہے کہ انسان اس کو "پندرہ منٹ" تک گھور کے دیکھنے کے بعد بھی مکمل طور پر سمجھ نہیں پاتا۔ اور جب سمجھ آجائے تو اس کا جواب سوچنے اور لکھنے میں بھی "پندرہ منٹ" باآسانی صرف ہوجاتے ہیں۔

☆ ایک دوست کو بے تحاشا سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ میں نے بارہا اسے یہ عادت ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ کل اس نے خوش خبری سنائی کہ اس نے سگریٹ نوشی کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں بہت خوش ہوا اور پوچھا کہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کیسا محسوس ہو رہا ہے؟۔ کہنے لگا بہت ہی اچھا محسوس ہو رہا ہے کیونکہ صرف پندرہ منٹ بعد ہی مجھے اپنا فیصلہ توڑنا پڑ گیا تھا۔ ہاں، وہ پندرہ منٹ میری زندگی کے مشکل ترین لمحات تھے۔

☆ ایک اور دوست کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو میں نے پوچھا: "برخوردار کس پر گیا ہے؟"۔ وہ دوست انتہائی ادب و احترام سے بولا کہ حضور! ابھی تو وہ "پندرہ منٹ" پہلے ہی پیدا ہوا ہے، مجھے تو کسی "آلو کی طرح" ہی گول مٹول سا لگ رہا ہے۔

سارا مضمون لکھنے کی اصل وجہ "پندرہ منٹ" کی انسانی زندگی کے لئے کیا اہمیت ہے، یہ بیان کرنا تھا۔ اب اس اہمیت کو واپڈا والے بھی بخوبی جان اور پہچان گئے ہیں۔ جی ہاں، کیا کبھی آپ نے سوچا تھا کہ لوڈ شیڈنگ کے لئے اب بجلی گھنٹہ مکمل ہونے پر جانے کی بجائے "پندرہ منٹ" اوپر ہونے پر جایا کرے گی؟۔ لیکن اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ لاہور ہو یا پنڈی، فیصل آباد ہو یا ملتان، کسی بھی جگہ اگر لوڈ شیڈنگ شیڈول کے مطابق ہوہی ہو تو آپ کو لائٹ ایک، دو، تین، چار یا پانچ بجے جانے کی بجائے سوا ایک، سوا دو، سوا تین، سوا چار یا سوا پانچ بجے ہی جاتی دکھائی دے گی۔ کافی دیر تک تو مجھے اس انقلابی تبدیلی کی کوئی بھی منطق، لاجک اور وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اب سمجھ ہی گیا ہوں تو سوچا کہ کیوں نہ آپ کو بھی سمجھا دوں۔ ہوسکتا ہے آپ بھی سوچتے ہوں کہ "پندرہ منٹ" ہی اوپر کیوں؟ بیس منٹ یا پچیس منٹ بھی تو ہو ہی سکتے تھے؟۔ لیکن اب آپ کو یہ سوچ کر پریشان اور ہلکان نہیں ہونا پڑے گا۔ ہاں نہیں تو کیا۔

## اُردو میں ترجمہ

ماؤزے تنگ کے ذکر پر یاد آیا کہ چند برس قبل عبدالعزیز خالد صاحب نے غالباً "پروازِ عقاب" کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی تھی جو ماؤ کی شاعری کے منظوم تراجم پر مشتمل تھی۔ اس کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر سید ضمیر جعفری نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ خالد صاحب نے بہت سی زبانوں کی شاعری اُردو میں ترجمہ کی ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر کچھ وقت نکال کر اپنی نظموں کا بھی اُردو ترجمہ کروالیں۔

امجد اسلام امجد کے سفرنامے "ریشم ریشم" سے اقتباس

ذہین احمق آبادی

# احمق آباد

## تاریخِ پیدائش

تاریخِ پیدائش میں کیا رکھا ہے بلکہ ہے تو یہ بہت اہم مگر ان لوگوں کیلئے جو ایک عدد تاریخِ وفات بھی رکھتے ہوں کیونکہ قدر آج تک انھی کی ہُوئی جو دونوں سے بہ وقت بہرہ ور تھے۔ ویسے شعراء کے لئے بھی تاریخِ پیدائش رکھنا عبث ہے جبکہ وہ ایک کے بجائے کئی تواریخ وفات رکھتے ہیں۔۔۔کبھی اِدھر لڑھکے۔۔۔کبھی اس چشمِ نم کا تیر کھا جاں بحق ہوئے۔۔۔کبھی اس نرم گفتار کے گھائل ہوئے۔۔۔کبھی کوئے یار میں قتیل ٹھہرے۔۔۔کبھی اس دستِ حنا کے "ہاتھوں" اپنی روح قفسِ عنصری سے پرواز کروائی اور پھر فوراً ہی اُچک کر لپک لی۔۔۔کبھی اُدھر رقیب کے ہاتھوں جامِ شہادت پیا تو کبھی محبوب کے گھر پر زہر غٹاغٹ چڑھالیا۔۔۔جو آنکھ کھلنے پر پوست کا ڈوڈا ثابت ہوا، محبوب دل، گھڑی اور بٹوے سمیت قیمتی اشیاء لے کر فرار جبکہ خونِ جگر موقعۂ واردات سے ملا اور وہ محض چشمِ نم چھوڑ گیا۔ شاعر نے محض دل کی رپٹ درج کرائی، ناوکِ مژگاں، زلفِ اژدر نما اور یاقوتی لبوں کے خلاف، طالبان نے ذمہ داری قبول کر لی جبکہ گردے اور پھیپھڑے وغیرہ انتہائی غیر شاعرانہ ہونے کے باعث محفوظ رہے۔ وہ قتالۂ عالم بعد میں عادی "محرم" ثابت ہوئی جسے ایک نقطہ "مجرم" کر گیا۔اس کے خلاف کافی ساری رپٹ پہلے ہی درج تھیں۔۔۔یوں اِدھر دیکھا کیے گویا اُدھر دیکھا کیے۔۔۔اسی باعث کہتے ہیں کہ تمام "دوائیں" شاعروں کی پہنچ سے دور رکھیں، دماغ زیادہ خراب ہو تو عطار کے لونڈے سے رجوع کریں جیسے کہ یہ شعر جناب شاعر بعد از وفات ہانک رہے ہیں ۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غرض اتنی ساری تواریخِ وفات اور اسی کے لحاظ سے تواریخِ پیدائش وافزائش کا دفتر رکھنے سے بہتر ہے بندہ ایک عدد بیوی رکھ لے، دفتر بھی تھم جائے گا، زیر و بم بھی آ جائے گا۔۔۔ دھت تیرے کی۔۔۔!

## ابتدائی حماقت

میں نے میں ایک ذہین گھرانے میں پیدا ہونے کی کوشش کی جو صد فیصد کامیاب رہی لیکن یقین مانیے یہ میری حماقت میں رتی برابر فرق نہ لا سکی۔۔۔حماقت کا کچھ نہ بگاڑ سکی، پس تب سے ہی میں ذہین احمق آبادی کہلاتا ہوں کیونکہ یہ ذہین خانوادہ احمق آباد میں ہی ایستادہ تھا۔ ابتدائی حماقت مدرسۂ الحماقت میں حاصل کرنے کی کوشش کی مگر صرف جماعت پاس کر لی، حماقت کا حصول تشنہ ہی رہا کیونکہ میں جماعت میں پیچھے کی اور براجمان ہوتا تھا جبکہ ساری تعلیم آگے والے ہی اچک لیتے تھے، میرے نصیب میں بس باس ہی آتی تھی۔ اس کے بعد اعلیٰ حماقت کیلئے جامعہ حمقیہ کا رُخ کیا مگر اُنہوں نے ذہانت کا "الزام" لگا کر نکال باہر کیا بلکہ میں خود باہر آ گیا یا شاید اُنہوں نے گھسنے ہی نہ دیا، گو کہ میں نے اُنہیں خوب گھسا مگر مثبت جواب ندارد۔ میں نے بغاوت کا

وہ جو مہر بہر نکاح تھا وہ دلہن کا مجھ سے مزاح تھا یہ تو گھر پہنچ کے پتا چلا میری اہلیہ کوئی اور ہے (دلاور فگار)

سوچا مگر پھر یہ سوچ کر توبہ کر لی کہ کسی ایسی چیز کو ہاتھ میں لینا درست نہیں جس کے اپنے ہاتھ بھی بہت لامبے ہوں۔ باتیں تو بہت سی یاد آ رہی ہیں مگر ذہن میں نہیں آ رہیں۔۔۔بس کبھی کبھی ذہنی قبض سے بھی گزرنا پڑتا ہے جسے لکھاری حضرات خوب جانتے ہونگے۔۔۔''اے ایمان والو'' سلسلہ میں میری واعظانہ باتوں کے باعث کئی دفعہ میری دال دلیہ اور گوشت وغیرہ نہیں گلتے۔۔۔ مزاح نگاری کی کوشش میں وعظ نگاری ظہور پذیر ہوتی ہے، یہاں تک کہ بقول احمقستان کی ملکۂ عالیہ میں اپنی تحاریر کو کلمہ پڑھا دیتا ہوں، اسی باعث میں بہت مشہور واقع ہُوا ہُوں بلکہ میں قبل از پیدائش ہی کافی مشہور تھا۔۔۔تمام اُردو ادب کے خامہ فرسا خاص طور پر شعراء مجھ سے واقف ہیں اور تھے، اُنہوں نے خوب مُجھ شیخ کو لتاڑا ہے، محبوب کے غمِ غلط میں بھی میری دبا کرمت ماری ہے۔۔۔اسی سے اندازہ لگا لیں کے کتنا مشہور ہوں، شعراء نے تو اوروں کو بھی لتاڑا ہے لیکن رقیب والا منصب بہر حال میں لینے کو تیار نہیں ہوں، اِسی وجہ سے شاعری اُنّیس برس کی عمر میں ہی ترک کر دی کے دُوسرے ہی ''حضرتِ شیخ'' کی شان میں اتنی باتیں کہہ چکے ہیں کہ اب اور کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں رہی، دوسرا میں تعلّی * کرتا اپنی شان بڑھاتا کیا اچھا لگوں گا۔ کتاب تو میں نے ایک بھی نہیں لکھی، ہاں کچھ سلسلہ ہائے مضامین رپٹ گئے اس نامعقول قلم سے۔۔۔سب سے پہلے رقم کِیا ''حماقت نامہ'' جو تا حال نامکمل ہے۔۔۔''اے ایمان والو'' بھی لکھنے کی کوشش کی، ''حدیثِ ماتمِ دِلبری'' بھی قلم سے نِکل بھاگا مگر مجال ہے جو میں نے اسے مکمل ہونے دِیا ہو۔ ''بڑ، وہ بھی بڑھ چڑھ کر'' سلسلہ میں بھی خوب گڑ بڑ کی، ''نامے'' تو اور بھی بہت لکھے اور نامہ بر کے حوالے بھی کیے مگر مجال ہے جو آج تک کبھی پکڑا گیا ہوں، نامے ڈاڑھی کی وجہ سے نہیں پکڑے گئے اور میں گاڑی کے باعث نہیں پکڑا گیا جو کہ میرے پاس نہیں ہے۔۔۔دھت تیرے کی۔۔۔!

## تاریخِ حماقت

احمقی لوگ (یعنی احمق آباد کے مقامی) قمری اور شمسی طرز پر ہی دِنوں کا ماپ تول کرتے ہیں مگر اُن کی تاریخ کچھ علیحدہ طریقے سے شروع ہوتی ہے۔۔۔''ق ح'' کی تاریخ یعنی ''قبل از حماقت'' اور ''ب ح'' کے معانی ''الکتاب الحماقت وَ اللّیاقت'' میں مرقوم ہیں کہ ''بعد از حماقت'' بقولِ راجح۔۔۔جمہور آئمۂ حماقت نے اس پر اجماع کرنے کی کوشش کی ہے مگر دوسرے آئمہ کے مختلف فرمودات ہیں۔۔۔ ذیل از باب ''التاریخ الحمق و السعادۃِ بین السطور'' اشکال دُور کرنے کیلئے رجُوع کریں ''الکتابُ الحماقت واللیاقت'' صفحہ نمبر منفی ۴۲۰ ترجمہ از ''ابن الحمق مُفلس احمقی''۔

کچھ لوگوں کے نزدیک اس تاریخ کا قصہ کچھ یوں ہے کہ۔۔۔کوئی تھا۔۔۔ بہت ہی نیک، پرہیزگار، مسند دار۔۔۔ تحقیق اس نے اپنا لوہا پتھر وغیرہ سب کچھ منوایا ہوا تھا ان میں جو اس کے گرد و نواح میں موجود و الشھو د رہتے تھے۔۔۔پھر ہُوا کچھ یُوں کہ اسکے کاسۂ سر میں حماقت کا سودا سمایا اور وہ پہاڑ تلے آیا، رغز ے میں اس نے مٹّی کو سجدہ کرنے سے اِنکار کِیا اور اس کے اِس عمل سے اسکی عزت اُچھل کُود کر رہ گئی، پھٹکار پڑی۔۔۔اس بدتمیز کو

### ٹھیکیدار

مخلوط آبادی کی وجہ سے مسلمانوں میں اجتماعی تصور ہی سرے سے موجود نہ تھا۔ مسلمان مالی اعتبار سے بھی خوشحال نہ تھے اور ترقی کرنے کا جذبہ بھی اُن میں نہیں تھا۔ مقامی اور مضافات کے بیشتر لوگ مزدوری پر اکتفا کرتے۔ اکثر اُن میں دہقان زادے بھی ہوتے جو کھیتی باڑی سے فارغ ہو کر مشقت کی نیت سے شہر آ نکلتے۔ کبھی کبھی ایک دو نفر ایسے برآمد ہو جاتے جو تھوڑی بہت عقل سے کام لیتے اور مزدوری کے زمرے سے نکل کر سفید پوشی میں قدم کر رکھنے لگتے۔ ایسے ہی کسی سفید پوشوں سے پوچھو کہ کیا کرتا ہے، بڑے فخر سے بتاتا۔۔۔''ٹھیکیداری!''

''کیسی ٹھیکیداری؟''

''گدھے رکھے ہوئے ہیں، مٹی ڈھوتا ہوں!!''

راول دیس از عزیز ملک

ایسے بندوں کو جانتا ہوں میں جن کا واحد علاج ''مالش'' ہے (عزیز فیصل)

ذرا شرم نہ آئی۔۔۔ بڑھ چڑھ کر رب کو بولا کہ میں بھٹکاؤں گا تیرے بندوں کو تیرے راستے سے، پس پھر اسے جنت سے زمین پر پٹخ دیا گیا، وہیں سے تاریخ حماقت کا ورود ہوا۔۔۔اب وہ اپنے کہے پر عمل پیرا ہے اور انسان کو پیپر ہن کرنے پر تلا ہوا ہے اور انسان نرا احمق بنا تاریخِ حماقت پر سندِ توثیق ثبت کرتا جا رہا ہے لیکن جب وہ اچھے خیال کی شکل میں کسی ماٹھے قسم کے بندے پر سوار ہوتا ہے تو وہ بندہ چونک چونک جاتا ہے اور یہ فوراً پکڑا جاتا ہے، کچھ ایسی صورتِ حال ہوتی ہے کہ وہ اس کا گریبان تھام لیتا ہے اور جھنجھوڑتا ہوا کہتا ہے۔۔۔

"بدتمیز کہیں کے، تجھے ذرا شرم نہیں آتی؟ بے شک تو کسی خوش کُن خیال کا ہم شکل ہو یا تم شکل۔۔۔ میں تجھے پہچان لوں گا۔۔۔لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔!"

اوہ معذرت، معاف کیجیے گا "اچھی بھلی" تحریر کو کلمہ پڑھا دیا۔۔۔دھت تیرے کی۔۔۔!

## قومی جانور

احمق آباد کا قومی جانور گدھا ہے، جس کے سینگ غائب ہوتے ہیں یا کر دیے گئے ہیں۔۔۔اس بارے میں کافی کلام ہے موّرخوں کا کہ کب، کہاں اور کیوں سدھارے، ہمت کیسے ہوئی۔۔۔ویسے یہ بحث بالکل لاحاصل ہے کہ سینگ گدھوں کے ہوتے بھی تھے یا نہیں کیونکہ سائنس کی رو سے جیسے وہیل مچھلی کے پیر ہوتے تھے اور وہ سینۂ زمین پر دندناتی چھتیں رسید کرتی پھرتی تھی تو کیا معلوم گدھوں کے سینگ بھی رہے ہوں۔۔۔واللہ اعلم، کہنے میں کیا ہے۔۔۔!

کب غائب ہوئے؟ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کچھ یوں وقوع پذیر ہوا کہ کوئی احمقی گھوڑوں کے ساتھ اپنے گدھے بھی فروخت کرنے منڈی میں لے آیا تا کہ رات کو آرام سے سو سکے، الرجی رہی ہوگی۔۔۔تو ان میں ہی ایک گدھا ایسا تھا جس کا خوب چرچا ہوا کیونکہ اسکے سر پر سینگ تھے اور وہ بالکل بکرا معلوم ہوتا تھا، بکنا تو اس نے کیا تھا، ہاں پکنا اس کی قسمت میں

تھا۔۔۔کوئی چور ہی اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا گیا دنوں دن خوب تحقیقات ہوئیں اور پھر بالآخر اس کا سراغ ایک لاہوری کی دیگچی سے مل ہی گیا مگر سینگ ندارد، پتا کچھ یوں چلا کہ یہ کارروائی اسی نے ڈالی تھی جب اس کا ڈاڑھی سے عاری چہرہ دیکھا گیا چونکہ یہ پرانے دور کی بات ہے اس لیے اس وقت عام طور پر لوگوں کی ڈاڑھیاں ہوتی تھیں تو اس نے حفظِ ماتقدّم کے طور پر داڑھی ہی

صاف کرادی تھی کہ ڈاڑھی ہی نہیں رہے گی تو جھٹکا کِدھر سے برآمد ہو سکے گا، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وقت کے ساتھ پلاسٹک کی بانسری بھی بازار سے بارعایت دستیاب ہوتی ہے۔۔۔احمق آباد میں ذہانت کہاں چلتی ہے، پکڑا گیا صاف، اس کے بقول اس نے بکرا سمجھ کر ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، اب اس سے جب نایاب سینگوں کا پوچھا گیا تو اس بارے میں تاریخ میں اختلافات ہیں۔ "ابن الحمق مفلس احمقی" جو کہ احمق آباد کے سب سے زیادہ مستند تاریخ داں ہیں، کا کہنا ہے کہ گدھے کے سینگوں کا پتا کہیں سے بھی نہیں چلتا سوائے ہندو دیومالا کے۔۔۔بقول آں بات یہ ہے کہ وہ نایاب سینگ وہی ہیں جن پر ویدوں کے نزدیک دنیائی گیند استراحت فرما رہی ہے، ہاں وہ خود کس پر استراحت فرما رہے ہیں یہ بات بھی مذکور ہے، بس فرق یہ ہے کہ ویدوں میں جانور کا نام بھینس ہے جبکہ اس داستان کا قارورہ گدھے کے سینگوں سے ملتا ہے۔ بھینس اور گدھے کی بابت جو اختلاف ہے اس کی وضاحت میں ابن الحمق کا کہنا ہے کہ جب گدھے کے سر سے سینگ غائب ہو سکتے ہیں تو تاریخ کے کچھ حصے میں گھپلا کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔سب چلتا ہے۔۔۔اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر خلائی مخلوق چہل قدمی کے دوران "خلاء" میں "گر" جائے تو کیا وہ بھی تو تکار اور گریبان پھاڑنے کے بعد ٹیٹنس کے ٹیکے استعمال کرتی ہے یا نہیں۔۔۔!

احمق آباد کا نام تاریک۔۔۔اررر۔۔۔تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا اور اس سنہری روشنائی کو استعمال سے قبل گٹر کے پانی سے "پاک" کیا جائے گا۔۔۔!

## ابن الحمق مفلس احمقی

جیسا کہ پہلے بتایا تھا، یہ وہ ہستی ہے جس نے احمق آباد کی تاریخ پر سب سے زیادہ کام کِیا ہے۔ بڑے فلسفیوں میں سے تھے احمق آباد کے۔۔۔اسی باعث "مفلس" تخلص کرتے تھے، "احمقی" احمق آباد کی نسبت سے نام کے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔ ایک دفعہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، پہلے تو ملنے سے ہی کترا رہے تھے پھر اجازت دے دی ملنے کی، دس بجے کا وقت دِیا، میں پورے وقت پر ساڑھے گیارہ بجے پہنچا۔ پرانے زمانے کا سا گھر تھا، قدیم پنا جھلکتا تھا، صندلی لکڑی کا بوسیدہ دروازہ دھکیلتا اندر گیا تو

## شادی کے بعد

"میں شادی کے بعد تمہارے تمام دُکھ بانٹ لوں گی!"
"لیکن مجھے تو کوئی دُکھ نہیں!!"
"میں شادی کے بعد کی بات کر رہی ہوں!!!"

کیا دیکھتا ہوں کہ سماوَر میں چائے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی ہے۔۔۔ آنجناب ابن الحمق کو ایک کونے میں مچھر دبوچے بیٹھے ہیں، ضعف کے باعث اُن کو گرمیوں میں بھی اکثر سردی لگتی ہے، اس وجہ سے کونوں کھدروں میں رہتے ہیں کیونکہ کونے تو نوے درجے (90 degrees) کے ہوتے ہیں، سر بالوں سے عاری، اُن کے لااُبالی ہونے کی دلیل تھے۔۔۔ بال اُگانے کا مخصوص احمق آبادی تیل اس کثرت سے جوانی میں لگایا تھا کہ لگاتے لگاتے اصل میں بال اُگ آئے تھے (ہتھیلیوں پر) دائمی سر درد میں مبتلا رہتے تھے اور ڈسپرین کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے تھے کیونکہ احمق آباد میں سر درد رفع کرنے کیلئے ڈسپرین سے زیادہ پروین کارآمد رہتی ہے جیسا کہ بتایا کہ "مفلس" تخلص کرتے تھے تو غضب کے شاعر بھی تھے بلکہ اکثر ایسی بحر میں شاعری کرتے جو مسلسل بہہ رہی ہوتی تھی، کبھی دائیں سے کبھی بائیں سے۔۔۔ ایک مصرعہ دو کلو میٹر بہتا تھا تو ایک بمشکل دو فرلانگ پر ہی ماہیِ بے آب کی مانند تڑپتا دم توڑ دیتا تھا اور شاعری کی دُم بھی، آنکھوں میں چھچھڑے اتر آئے تھے مگر مجال ہے جو عینک لگا لیتے، کبھی کہتے کہ عینک نہیں چشمہ لگاؤں گا، فرق پوچھنے پر عالمانہ انداز میں بتلاتے کہ

"عینک اور چشمے" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق تو چشمے کا مذکر اور عینک کا مؤنث ہونا ہے جو بنیادی فرق ہے لیکن اگر نابالغ ہونے کے باعث اس سے بھی تشفی نہیں ہوتی تو یہ بات سمجھ لینا کافی ہے کہ ایک کے نیچے سے سیلی زدہ رطوبت بہتی ہے تو ایک بذاتِ خود بہتا ہے، ویسے میں شکل پر نہیں، عقل پر چشمہ لگانے کا قائل ہوں۔۔۔!"

شاعری کی مَد میں اُن کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے "آزاد غزل" کے بعد شاعری کی ایک اور صنف متعارف کرائی تھی۔۔۔ "غلام غزل"۔۔۔ "آزاد غزل" کو نری الفاظ کی جگالی سمجھتے تھے جس میں جبراً خواہ مخواہ متاثر ہونا رہتا ہے، اسی باعث اس کی ضد میں یہ صنف متعارف کرائی تھی۔۔۔ گو کہ ایک بھی "غلام غزل" کا عملی نمونہ نہ پیش کر سکے مگر راجح قول کے مطابق وہ محض بڑی زمینوں پر بیٹھ سکتی تھی، شادی شدہ رہی ہوگی۔۔۔ خیر۔۔۔ شاعری کو اتنا غلام کیا تھا اس صنف میں کہ ایک مصرعے میں دو دو قوافی جھونکنے کی کوشش کی تھی، آدھے آدھے مصرعے میں، ردیف کی گنجائش اس کے سوا تھی، نتیجہ کباڑے کے سوا کیا ہو سکتا تھا مگر پھر بھی اپنا آپ منوا لیا تھا احمق آباد کے شاعروں میں، جبھی تو تمام شعراء شاگردی کا شوق لیے ہاتھ پاؤں دھو کر پیچھے پڑ گئے تھے۔ زیادہ شوق والے تو وضو تک کر آئے تھے اور جب اس باعث پانی کی قلت ہوئی تو کئی نے تو تیمم سے کام چلایا۔۔۔!

میں مزید بھی ملاقات کا شرف حاصل کرتا کہ اسی دم سماوَر نے اپنے اندر تڑپتی چائے کے باعث تیز سیٹی ماری اور ایک دروازے سے "ابن الحمق" کی بیٹی "فطینہ احمق آبادی" آ گئی۔۔۔ اسے پتا نہیں تھا کہ کوئی آیا ہوا ہے، اسی باعث مجھے دیکھتے ہی اسی جگہ ٹھٹکی اور 'مشرٔ دم' (شرم کا مفعول) ہو کر رہ گئی۔ اتنے "پرانے" ماحول میں اتنی "نئی" چیز دیکھ کر میری دلچسپی بڑھ گئی، میرے چودہ طبق روشن کر گئی، نتیجتاً ایسا عشق ہوا کہ کھانا تک بھول جاتا ہوں، کھانے کے باوجود۔۔۔ اسی وجہ سے ایک وقت میں کئی کئی وقت کا کھانا پھانک کر جگالی کرتا رہتا ہوں ؎

"حماقت" میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دَم نکلے

"ابنِ الحمق" کا پوپلا منہ اس شیریں بدن، توبہ شکن، غنچہ دہن، چشمِ سخن، حورِ عدن، زلفِ اگن کے ہوتے ہوئے کون برداشت کرتا۔۔۔ میں بھی اُٹھ گیا، معنی خیز مسکراہٹ لیے۔۔۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔۔۔ ہوگئی ہے وہ دل کی کھاد۔۔۔ دھت تیرے کی۔۔۔!

نعیم طارق

# خوشی کی مٹھائی

میں خوشی خوشی ڈیمانڈ نوٹس بھر کر جب دفتر پہنچا تو کاؤنٹر پر نیم دراز ایک بابا جی نے میرے سامنے رجسٹر رکھتے ہوئے کہا ''پتر اس پر اپنے ہاتھ سے اپنا پتہ درج کردو۔ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو، پنسل تو آپ کے پاس ہوگی نا؟''

میں نے پوچھا ''بابا جی! میرا میٹر کب تک لگ جائے گا؟ میں نے ڈیمانڈ نوٹس تو بھر دیا ہے۔''

وہ بے تکلفی سے کہنے لگے ''اللہ دے کماں دا کی پتا پتر؟''

اتنے میں کسی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے جا کر آہستہ سے بولا ''بھائی صاحب میٹر سٹور میں تو نہیں ہے۔ آپ کوئی تسلی کرائیں تو کام ہو جائے گا۔''

میں نے پوری باچھیں کھول کر پوچھا کہ کب اور کیسے؟

کہنے لگا ''آپ فردِ ملکیت اور شناختی کارڈ کی کاپی لے آئیں۔''

میں بھاگم بھاگ پٹوار خانے پہنچا ایک گھنٹہ انتظار کے بعد باری آئی تو میرے سامنے تین ہزار صفحات پر مشتمل ایک رجسٹر رکھ کر کہا گیا کہ اپنا نام تلاش کرو۔ خیر ایک گھنٹہ اور لگ گیا۔ جب فرد ملکیت کا نذرانہ دے کر اٹھنے لگا تو دفتر میں کام کرنے والے ایک نورانی صورت انسان، اپنے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ سجائے کہنے لگا ''بھائی صاحب خوشی کی مٹھائی تو دیتے جائیں۔''

میں نے کہا ''پیسے دے تو دیے ہیں۔''

وہ بولا ''بابوجی! وہ تو آپ نے فیس ادا کی ہے، نیا میٹر لگوا رہے ہیں۔ مٹھائی تو بنتی ہے نا ہماری!!''

میں نے پچاس روپے نکال کر دیے تو کہنے لگے چلو نہ دیں ہم ویسے ہی خوش ہیں۔ خیر سو روپے پر وہ راضی ہو کر کہنے لگا ''بابو جی آج میں اکیلا ہوں ورنہ یہاں تو پانچ آدمی کام کرتے ہیں۔''

خیر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آن پہنچا جب میرے گھر پر نیا میٹر لگا۔ میٹر لگانے والے عملے کو پھر خوشی کی مٹھائی دینی پڑی۔ دو ماہ بعد جب پہلا بل آیا تو ڈاکیے کو خوشی کی مٹھائی دینی پڑی۔ خوشی کی اتنی مٹھائیاں دے کر ایک دن میں نے اپنے دوست سے پوچھا یار یہ خوشی کی مٹھائی کہاں سے ملتی ہے تو ہنس کر کہنے لگا میاں چنوں سے۔ پھر مجھے غور سے دیکھ کر بولا یہ خالصتاً مشرقی روایت ہے۔ ہم لوگ خوشی کے موقع پر کچھ میٹھا ہو جائے کے اتنے شوقین ہیں کہ اب یہ ایک قومی روگ بن چکا ہے۔ پتہ نہیں چین، امریکہ والے ایسے موقعوں پر حقہ پیتے ہوں گے شاید، پر ہمارے ہاں آپ کوئی موقع آنے دیں بس۔

نئی گاڑی لی تو خوشی کی مٹھائی، پلاٹ لیا تو خوشی کی مٹھائی، شادی ہوئی تو خوشی کی مٹھائی، بچے کی پیدائش پر خوشی کی

مٹھائی، بینک میں کھاتہ کھولا تو خوشی کی مٹھائی، دکان کھولی تو خوشی کی مٹھائی، نوکری لگی تو خوشی کی مٹھائی، پہلی تنخواہ ملی تو خوشی کی مٹھائی۔ چلو یار یہ سب موقعے تو مان لیں مگر، ڈومی سائل بنوایا تو خوشی کی مٹھائی، شناختی کارڈ بنوایا تو خوشی کی مٹھائی، پاسپورٹ بنوایا تو خوشی کی مٹھائی، اور تو اور بھائی صاحب میں تو سم کی بائیو میٹرک کروانے پر خوشی کی مٹھائی دے کر آ رہا ہوں۔

میرے ایک دوست جو ہر معاملے میں بہت احتیاط کے قائل ہیں کبھی کسی کو خوشی کی مٹھائی دینے پر راضی نہ ہوتے تھے ایک دن ناکے پر روک لیے گئے، تمام کاغذات، لائسنس وغیرہ چیک کروانے پر جب خوشی کی مٹھائی مانگنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آسکا تو اہلکاران کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی آدھی سگریٹ دیکھ کر کہنے لگا۔

"بادشاہو! سارے آئٹم پورے رکھ دے جو۔ اج سگرٹ دا اک سوٹا ای لوا دیو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ سے سگریٹ کا ٹوٹا چھین لیا اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے کہ لو آج ہمارے اس دوست کو بھی آخر کار خوشی کی مٹھائی دینے کی عادت پڑ ہی گئی۔

## بچوں کی ماں

مشہور شاعر نظامی نے کسی مشاعرے میں ایک خاتون کو دیکھا اور حسبِ عادت ہزار جان سے اس پر مائل ہوگئے، مشاعرے کے بعد اس خاتون کے پاس پہنچے اور کہا "اے دشمنِ ایمان و آگہی! کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ میرے دل کے مرتعش جذبات تمہارے پاکیزہ عطر بیز تنفس کی آمد و شد سے ہم آہنگ ہو سکیں؟"

بے چاری حسینہ اس اندازِ بیاں کو نہ سمجھ سکی اور حیرت سے بولی:۔ "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اب نظامی نے صاف صاف کہا "میں چاہتا ہوں تم مجھ سے شادی کر لو اور میرے بچوں کی ماں بننا گوارا کرو۔"

حسینہ نے چند لمحے سوچا اور حیرت سے دریافت کیا "کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

شوکت علی مظفر

# بابائے شادیات

ایک زن مُرید دوست نے مسلسل زن مُریدی سے تنگ آ کر دوسری شادی کا فیصلہ کرلیا۔ ہم نے طنز کیا، کم نصیب مُریدوں کے مُرشد بدل جانے سے حالات نہیں بدلا کرتے۔ دوست نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جواب دیا "نیا والا مُرشد کم عمر ہے۔" اس طرح کے بندے ہوتے ہیں جو سستی بے عزتی کو بھی بچت ہی شمار کرتے ہیں۔ بیگم اور بم جتنے چھوٹے ہوں اتنی زیادہ تباہی مچاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ہینڈ گرنیڈ کی پن کھینچ کر عملی تجربہ کرلیں۔ مَلک نے کہا، بندے نے مشورہ دینا ہو تو اچھا دینا چاہیے، تم کم عمر لڑکی سے شادی کا عملی تجربہ بھی بتا سکتے تھے۔ ہمارا جواب تھا، مشورہ وہ دینا چاہیے جس پر عمل کرنے والا بعد میں کوئی اعتراض نہ کرسکے۔

ہمارے یہاں پہلی شادی مشکل اور دوسری شادی اُس سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ پہلی شادی میں رشتہ دار رکاوٹ بنتے ہیں اور دوسری میں بیوی۔ بندہ رشتہ داروں سے لڑسکتا ہے، بیوی سے کبھی نہیں جیت سکتا۔ جو لوگ بیوی سے جیتنے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں ذہنی مریض سے زیادہ اور کیا سمجھا جاسکتا ہے؟ ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی چوہا شراب پی کر بلی کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہوجائے، انجام تو پھر سب کو معلوم ہے۔ ایک کام ایسا ہے جو بیٹا کرے تو ماں ناراض ہوتی ہے اور داماد کرے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتی، اس کام کو بیوی کو غلامی کہا جاتا ہے۔ دوسری شادی کرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے، وہ غلام نہیں رہتا کیونکہ غلام کسی ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے ملکیت میں حصہ داری آجائے تو غلام ترقی کر کے بے غیرت قرار پاتا ہے۔ یہ ترقی اسے پہلی بیوی عطا کرتی ہے۔ ہم نے دو بیویاں بیک وقت رکھنے والے مرد تو دیکھے ہیں لیکن بیک وقت تین چار بیویوں سے ملا کھڑا کرنے والے نظر نہیں آئے۔ مَلک نے کہا، یہ کبھی نظر بھی نہیں آئیں گے کیونکہ بندہ دو محاذ پر تو لڑ سکتا ہے، چومکھی جنگ لڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

بہت سے لوگ اس لیے بھی دوسری شادی کے لیے بے چین رہتے ہیں کہ اُن کی بیوی اللہ میاں کی گائے ہوتی ہے۔ محاورہ ہے کہ کسی انسان کو کوئی غم نہ ہو تو وہ بکری پال لے۔ یہی سوچ کر بندہ دوسری شادی کرلیتا ہے۔ دوسری شادی کے خواہش مند سے ہم نے کہا، لوگ سمجھتے ہیں کہ شادی جان کا عذاب ہے پھر بھی لوگ شوق سے یہ عذاب پال لیتے ہیں، ایسا کیوں؟ جواب ملا، یہ سب بکواس ہے اصل میں بیوی ایک نعمت ہے، جبھی تو انسان دوسری نعمت کے حصول کے لیے بے چین رہتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا وہ بندہ اتنا شکر گزار ثابت ہوا کہ یکے بعد نعمتیں حاصل کرتا گیا۔ آج وہ شخص 205 ویں شادی کی تیاری کررہا ہے۔ مصر کے شہر قاہرہ کا رہائشی طبلہ نواز چاچا مصطفیٰ اپنی نئی دلہن کے لیے اس کے بیوہ ہونے کا منتظر ہے کیونکہ زیادہ تر شادیاں انہوں نے بیوگان سے ہی کی ہیں۔ چاچا جی تو قرب و جوار میں ایسی خبروں کی تلاش میں

رہتے کون سا شادی شادہ آدمی اپنی جوان بیوی ان کے آسرے پر چھوڑ گیا ہے۔ چاچا جی سے پوچھا، اتنی ساری بیویاں کیسے مل گئیں تو جواب دیا کہ انہوں نے زیادہ تر شادیاں عرب، اسرائیل جنگ کے دوران کیں کیونکہ اس دوران ہزاروں شہری اور فوجی قتل ہو گئے اور ان کی بیویاں بے آسرا ہو گئیں، اس وقت صرف دو مصری پاؤنڈ کے حق مہر پر بیوی مل جاتی تھی۔ یہی نہیں مصری چاچا نے بہت سی شادیاں تو صرف ایک مصری پاؤنڈ حق مہر پر کیں۔ اس کا راز بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک مولوی صاحب کو دوست بنالیا، جو عورت شادی کے لیے تیار ہو جاتی، اسے مولوی صاحب کے پاس لے جاتے، وہ کم حق مہر پر اتنا پُر اثر بیان فرماتے کہ عورت کم سے کم حق مہر پر شادی کے لیے تیار ہو جاتی۔ طلاق کے بعد ایک مصری پاؤنڈ دے کر بابا جی ایک اور بیوی لے آتے۔ چاچا نے تو مصر کی کئی اُبھرتی ہوئی گلوکاراؤں کو بھی سہانے سپنے دکھا کر شادی کی اور جب وہ کسی مقام پر پہنچ گئیں تو چاچا جی کو اپنے مقام سے گرا دیا، یعنی خود ہی شوہریت کے حق سے محروم کرتے ہوئے یا تو فرار ہو گئیں یا پھر طلاق حاصل کر لی۔

چاچا طلبہ نواز سے اگلا سوال پوچھا گیا کہ وہ اب اس عمر میں دوسو پانچویں شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ تو ان کا جواب تھا، جس سال شادی نہ کروں مجھے چین نہیں آتا۔ مَلک کہتا ہے، جس بندے کو چین نہ آتا ہو، اسے چین بھیج دینا چاہیے۔ وجہ پوچھی تو بولا، چین میں ہر بندہ پریشان ہے جن کی مصیبتیں دیکھ کر بے چین آدمی کو چین آجاتا ہے۔ یہاں مَلک سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چینی کبھی پریشان نہیں ہوتے، پریشان صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی کام نہ ہو۔ بہرحال چاچا جی سے مشورہ طلب کیا کہ شادی کی دو سنچریوں کے بعد وہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے کیا کہتے ہیں تو فرمایا "میری نوجوانوں سے اپیل ہے وہ زیادہ شادیاں نہ کریں۔" مَلک نے یہ سن کر منہ پھلا لیا کہ خود تو زندگی بھر شادیوں کے علاوہ کوئی کام نہ کیا اور دوسروں کو اس کام سے ہی روکنے کی اپیلیں۔ مَلک کو ہم نے یہ کہہ کر تسلی دی، بابا کی بات پر دھیان نہ دیں، ایک بیگم ہی انسان کو دماغ پھرا دیتی ہیں بابا تو دو سو چار بیگمات بھگتا چکے ہیں۔ لوگ سمجھتے تھے سب سے زیادہ شادیاں ہالی ووڈ کی اداکارائیں کرتی ہیں مگر چاچا شادیات نے اس بات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اگر انہیں بابائے شادی کا خطاب دیا جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔

شوبز ایسی دنیا ہے جہاں افیئر کھل کر اور شادیاں چھپ کر کی جاتی ہیں۔ چاچا مصطفیٰ بھی شوبز کے شعبہ موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا بہت کھل کر کیا۔ مَلک نے فرمایا، اس میں چاچا جی کا کوئی کمال نہیں کیونکہ طبلہ بجانے والے ایسے ہی بے رحم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے مکمل اتفاق ہے کیونکہ جنرل مشرف طبلہ نواز کا دور تو میں نے دیکھ رکھا ہے۔ انہی کی مہربانیاں ہیں جو اس وقت بھی ہمارے ملک کا حال اس شخص جیسا ہے جس کی دو بیویاں ہوں۔ فرض کر لیں ایک کا نام امریکا اور دوسری کا نام طالبان ہے۔ اور دونوں کو شک ہو کہ شوہر صاحب دوسری والی کو زیادہ چاہتے ہیں۔ ان حالات میں جو حالات ہیں وہ تو ہونے ہی ہیں۔ ایک کے دیئے زخم بھرتے نہیں کہ دوسری بیگم زخم دینے کو تیار کھڑی ہوتی ہے۔ خدا کرے، کسی دن دونوں بیویاں ہی آپس میں سنجیدگی سے بھڑ جائیں، کوئی ایک بھی جان سے گئی تو شوہر کو کچھ تو سکون ملے گا!!

راستے میں صابر کرائیلا کو جب علم ہوا کہ عنقریب ہمارے اور حمایت علی شاعر کے صاحب زدگان بھی تعلیم کی غرض سے امریکا آنے والے ہیں تو انہوں نے اطلاعاً بتایا کہ جاں نثار اختر کے بیٹے ڈاکٹر سلمان بھی یہاں رہتے ہیں اور بہت کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کہنے لگے بہت پہلے کی بات ہے، بمبئی میں جاں نثار اختر کے یہاں میں اور بنے بھائی بیٹھے تھے۔ اتنے میں سلمان آ گیا۔ میرے پوچھنے پر ان نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ میں نے اُسے فوراً اپنی تکلیف بتائی کہ بیٹا میری دائیں پنڈلی میں کبھی کبھی شدید درد اٹھتا ہے۔ اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "انکل، میں تو دماغی امراض کا ڈاکٹر ہوں۔" میں نے یہ سن کر کہا "اچھا، تو جاؤ اپنے ابا کا علاج کرو۔"

حیرتوں کی سرزمین از محسن بھوپالی

میم سین بٹ

**شادی** بڑی ظالم چیز ہے جس کی نہیں ہوتی وہ تو پریشان رہتا ہی ہے جو کر بیٹھے وہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ پریشان پھرتا ہے، مالی اور گھریلو پریشانیوں کے باعث شادی شدہ لوگوں کی بہت بڑی بڑی تعداد خاصی حد تک نفسیاتی مریض بنتی جارہی ہے ایک زمانہ تھا کہ گھر کا ایک فرد کما کر آٹھ دس افراد پر مشتمل کنبے کو پال لیتا تھا اب مہنگائی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کیلئے سفید پوشی کا بھرم برقرار رکھنا ناممکن ہوتا جارہا ہے، بھلے وقتوں میں بزرگ جس سے رشتہ طے کر دیتے تھے اولاد چوں چراں کئے بغیر فیصلہ قبول کر لیتی تھی اب یہ حال ہے کہ بڑے شہروں میں اولاد رشتہ خود ڈھونڈھ کر والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیتی ہے اور وہ بیچارے کان دبا کر چپکے سے نکاح پڑھا دیتے ہیں اور جو نہیں پڑھاتے ان کی اولاد کورٹ میرج کر لیتی ہے۔

دیہات میں کورٹ میرج کیلئے باغی دوشیزاؤں کو رفع حاجت کے بہانے آشنا کے ساتھ فرار ہونا پڑتا ہے چونکہ عدالت گاؤں سے بہت دور تحصیل صدر مقام پر ہوتی ہے اس لئے تھانے، کچہری وغیرہ کا خرچہ پورا کرنے کیلئے دوشیزائیں گھر سے فرار ہوتے وقت بھاری نقدی اور طلائی زیورات سمیٹنا نہیں بھولتیں جن کی واپسی کیلئے ان کے والدین کو مبینہ آشنا کے خلاف بیٹی کے جبری اغوا اور حدود کا جھوٹا سچا مقدمہ درج کرانا پڑتا ہے، پریمی جوڑا تو ہنی مون منا لینے تک ہاتھ نہیں آتا تاہم پولیس ''مغویہ'' کی بازیابی اور ''ملزم'' آشنا کی گرفتاری تک اس کے باپ یا بھائی کو پکڑ کر حوالات میں ڈال دیتی ہے۔

پریمی جوڑے کے عدالت میں پیش ہونے پر عموماً معاملہ نمٹ جاتا ہے لڑکی اپنے جبری اغوا کی تردید کر کے نکاح نامہ پیش کر دیتی ہے اور عدالت اسے اپنے پریمی شوہر کے ساتھ مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دیتے ہوئے مقدمہ خارج کرنے کا حکم دیدیتی ہے، بعض بھولی بھالی بلکہ چالاک یا ڈرپوک قسم کی دوشیزائیں پکڑے جانے پر اہلخانہ کے دباؤ پر عدالت میں بیان دے دیتی ہیں کہ انہیں تو جبری طور پر اغوا کیا گیا تھا جس پر وہ خود تو ماں باپ کے ساتھ گھر چلی جاتی ہیں لیکن الو کا پٹھا عاشق نامراد ساری عمر جیل میں پڑا سڑتا رہتا ہے۔

حکومت نے کچھ عرصہ قبل غالباً بجلی کی بچت کیلئے رات کے وقت شادیوں پر پابندی عائد کر دی تھی ہمارے خیال میں تو اسے دن میں بھی یہ پابندی لگا دینی چاہیے تھی کیونکہ بقول شاعر۔۔۔۔۔

زندہ ہیں کتنے لوگ ''شادی'' کئے بغیر

اب شادی شدہ حضرات اس کے جواب میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔

شرمندگی ہی شرمندگی ہے
کنواروں کی بھی کیا زندگی ہے

بیچارے کنوارے تو بس برائے نام زندہ ہوتے ہیں لیکن اکثر

شاپنگ سے ہم نے سوری کیا تو وہ پھٹ پڑی
آتی نہیں ہیں تم کو نبھانی محبتیں (نعیم نیازی)

## سیاستدان اور عورت میں فرق

سیاستدان ہاں کہے تو مراد "ممکن" ہوتا ہے، جب وہ ممکن ہے کہتا ہے تو مطلب ہوتا ہے "نہیں" اگر وہ نہیں کہے تو سیاستدان ہی نہیں، جبکہ ایک عورت "نہیں کہتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے "ممکن ہے"، جب وہ کہتی ہے "ممکن ہے" تو مطلب ہوتا ہے "ہاں" اگر وہ "ہاں" کہے تو وہ عورت ہی نہیں۔

بٹ تمیزیاں از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

شادی شدہ حضرات اپنی زندگی بلکہ زندہ دلی کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے دھڑا دھڑ نئی زندگیاں تخلیق کرتے رہتے ہیں، حکومت فیملی پلاننگ پر مکمل عملدرآمد کرتے ہوئے شادیوں کی حوصلہ شکنی کیلئے مختلف منصوبوں پر عمل کر رہی ہے، مہنگائی اور غربت کی انتہا کے باعث لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں، جہاں لوگوں کو انصاف ہی نہیں روٹی، کپڑا، مکان بھی نہ ملے وہاں شادیاں کرنے کا خیال کسے آئے گا اور پھر اس دور میں سونا کے نرخ بھی آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، طلائی زیورات کے بغیر تو شادی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، ماضی میں بعض سماجی تنظیمیں اجتماعی شادیوں کے ذریعے غریب طبقے کو ریلیف مہیا کرتی رہی ہیں مگر پنجاب میں اس وقت کے فوجی گورنر کی تبدیلی کے بعد یہ کام بری طرح متاثر ہوا تھا۔

حکومت نے صرف رات کے وقت شادیوں پر پابندی اس لئے لگائی تھی کہ اسے پتا تھا شہروں میں لوگ رات کی شادی کو ترجیح دیتے ہیں اور مئی، جون، جولائی کے گرم ترین موسم میں تو شہری دن ہی نہیں رات کے وقت بھی شادی کی تقریب نہیں رکھتے البتہ دیہاتی بھائیوں کو اس حکومتی پابندی سے کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا کیونکہ وہ نہ صرف شادیاں دن کے وقت کرتے ہیں بلکہ ان کیلئے جون، جولائی اور اگست کے مہینوں کا انتخاب کرتے ہیں، شدید گرم موسم میں جب چوٹی سے ایڑھی تک پسینہ بہہ رہا ہوتا ہے گاؤں کی بارات کے شرکاء رنگ برنگے ریشمی کپڑے پہنے دلہن لینے جا رہے ہوتے ہیں یا لے کر آ رہے ہوتے ہیں انہیں گرمی تو لگتی ہوگی مگر ان پر اثر نہیں کرتی، ہمیں تو ایک سابق دور میں رات گئے شادیوں پر پابندی کا حکومتی فیصلہ بھی کسی پینڈو مشیر کا مشورہ لگتا ہے جس نے شہریوں اور دیہاتیوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

موجودہ حکمران جماعت کے ایک سابق دور میں شادیوں پر کھانا نہ دینے کا قانون بنا دیا گیا تھا، جس سے شادیاں کرنے والوں کی خاصی حوصلہ افزائی ہوئی تھی تاہم محکمہ فیملی لانگ والوں کا دردسر بڑھ گیا تھا ویسے ان کھابہ گیر حکمرانوں کی جانب سے شادیوں پر باراتیوں کو کھانا نہ دینے کی پابندی بڑے دل گردے کا کام تھا حکومت کے اپنے حامیوں کو بھی یہ فیصلہ پسند نہ آیا ہوگا لوگوں نے شادی بیاہ کی تقریبات میں جانا کم کر دیا تھا، محض کولڈ ڈرنک پی کر دولہا کو ہزار پانچ سو روپے سلامی دینا بڑے دل گردے کا کام تھا، سیانے لوگ سوچتے تھے کہ بارات یا ولیمے پر پانچ سو سے ہزار روپے میں ایک بوتل مشروب پینے سے بہتر نہیں کہ بازار سے چکن کڑاہی منگوا کر کھالی جائے اور اکثر کھابہ گیر حضرات یہی کام کرتے رہے تھے۔

زیادہ تر ادیب شاعر اور صحافی دانشور لوگ محبت کی شادی کے قائل ہوتے ہیں بلکہ بہت سے دانشور تو صرف محبت کے قائل ہوتے ہیں شادی وہ کرتے نہیں اور اگر گھر والوں کی مرضی سے کر بیٹھیں تو عموماً ناکام رہتی ہے، بیشتر ادیبوں، شاعروں اور دانشور صحافیوں کی ارینج میرج کامیاب رہتی ہے مگر اس کا کریڈٹ انکی بیگمات کو جاتا ہے جو بیچاریاں بعض مجبوریوں کے باعث خلع حاصل نہیں کرتیں، دراصل ادیبوں، شاعروں کی گھریلو خاتون کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی جو ادیبہ، شاعرہ انہیں پسند آتی ہے اس کے درجنوں امیدوار میدان میں موجود ہوتے ہیں، ادیب، شاعر طبقہ آئیڈیل پسند ہوتا ہے اور آئیڈیل کا اردو ترجمہ غالباً "ہما" سمجھتا ہے اس پرندے ہی کی طرح انہیں اپنا آئیڈیل نہیں ملتا اور انتظار کرتے کرتے ان کے بالوں میں چاندی اتر آتی ہے اور پھر بالآخر یہ نوبت آ جاتی ہے۔۔۔۔۔۔

بیتی عمریا جلتے جلتے، جلتے انگاروں پہ چلتے
موت کی منزل مل جائے تو ہو جائے چھٹکارا

اس قدر صرف الٰہی میرے خونِ دل کا
اب محبت کا "بجٹ" فیل ہوا جاتا ہے
(ماچس لکھنوی)

عثمانی بلوچ

# سرگودھا

**ہمارے** دوست نکلے نے بتایا کہ سرگودھا شاہینوں کا شہر ہے تو ہمیں تجسس ہوا کہ جو شخص سرگودھا میں چار سال گزار کے آیا ہے۔ وہ سچ ہی بولتا ہوگا اگر چہ سچ بولنا اس کا وطیرہ تو نہیں ہے مگر اس کے نکلے ہو جانے کی وجہ سے ہم نے یقین کر لیا کہ بے سبب زمین پر زلزلے نہیں آتے اور بے سبب کوئی ٹکلہ بھی نہیں ہو جاتا۔ ہم نے شاہین نامی افراد کی جستجو شروع کی تو ہم نے دیکھا شہر کے داخلی دروازے سے چند کلو میٹر دور دو شاہین گدھے کی کھال اتارنے میں مصروف تھے۔ نہایت ہی شریف النفس انسان تھے۔ ہم نے دریافت کیا جناب کیا کر رہے ہو تو فرمانے لگے کہ آپ کو کیا نظر آتا تو ہم نے بے ساختہ جواب دیا چمڑی سے آثار یہی بتاتے ہیں کہ یہ گدھے کی کھال ہے تو بگڑ کے انہوں نے کہا جناب اپنی نظروں کا علاج کروائیں سرگودھا کے اندر بکریوں کی کھالیں میٹھے پان کھانے کی وجہ اسی طرح ہو جاتی ہیں۔ ہم نے چپ سادھ لینے میں عافیت سمجھی اور انہیں یقین دلاتے ہوئے آگے روانہ ہوئے کہ جب گوشت بیچنے کے لیے بازار میں لائیں تو ہمیں ضرور اطلاع دینا، ہم بھی خریدنے آئیں گے۔ آگے گورنمنٹ نواز شریف کالج کے در دیوار نے ہمارا استقبال کیا۔ اساتذہ کرام تو وہاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ اس لیے کالج کی تین دیواروں نے ہمیں خوش آمدید کیا جبکہ چوتھی دیوار نے کمر درد کی وجہ سے ہمیں لیٹے لیٹے سلامی دی۔ کالج کی چوتھی دیوار دیکھ کر ہمیں بے ساختہ موت کا سماں یاد آیا کہ جب پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے تو ہماری گاڑی بھی اسی طرح اڑنے لگی۔ ترقیاتی کاموں کا ایک جال بچھا ہوا تھا ہر طرف روڈوں کی مرمت ہو رہی تھی اور پایۂ تکمیل کے لیے وہ شاید ایک صدی کا وقت مانگ رہیں تھیں۔ سرگودھا کے لوگوں سے ملے تو وہ بڑے مہمان نواز نکلے۔ جب انہوں نے سنا کہ ہم ان کے ہاں کچھ دنوں کے لیے مہمان ہیں تو وہ تالہ لگا کر اپنی اپنی ملازمت پر روانہ ہونے لگے۔ ہمیں اُن کا فعل سمجھ نہ آیا۔ بعد میں سمجھ آیا کہ یہ مہمان کو کیوں دروازے تک رخصت کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں خدشہ ہوتا کہ وہ سواری کی مہاریں ہی نہ موڑ لے۔

اس میں کئی صفات ایسی ہیں جو پاکستان کے سارے شہروں میں مشترک ہیں۔ مثلاً جگہ جگہ پرائیوٹ اسکولوں پر مبنی بزنس پلازے۔ صفائی کا اتنا اعلیٰ نظام کے پتہ ہی نہ چلے کس علاقے کی روزانہ صفائی کی جاتی ہے۔۔ سیاستدانوں کی شرافتیں۔ اعلیٰ اقدار کے حامل صاحب اقتدار جو الیکشن کے بعد شاذ و نادر جبکہ الیکشن کے دنوں میں اکثر و بیشتر۔ بھوک سے نہال دعائیں دیتی ہوئی عوام۔۔ غرض یہ صفات تو دہرانے کی نہیں ہیں یہ تو ہر جگہ کا لوک ورثہ ہیں۔ سرگودھا کو کئی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے باقی شہروں سے۔ یہاں لوگ اپنے دشمن کو کبھی بددعا نہیں دیتے کہ خانہ خراب ہو تیرا۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ مالٹا خراب ہو تیرا۔ یہاں پر پینے کا

شاعر ناصر کاظمی جوتا خریدنے بازار تشریف لے گئے۔ دکاندار ناصر صاحب کا دوست اور پر مزاح طبیعت کا مالک تھا۔ ناصر صاحب نے کئی جوتے پہنے اور کہنے لگے "پہلے تو مجھے چھوٹا نمبر پورا آجاتا تھا لیکن اب وہ نمبر پاؤں میں چھوٹا پڑ رہا ہے۔" دکاندار نے کہا، "جناب! اس کی وجہ یہ ہے کہ اب آپ کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔"

پانی اتنا میٹھا کہ پانی سرگودھا کی سرزمین کا پئیں اور مزہ بحیرہ عرب کے پانی کا لیں۔ یعنی کے فاصلے سمٹ کے رہ گئے۔ لوگوں کے اندر انسانی ہمدردی اتنی زیادہ ہے کہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ سرگودھا بورڈ عمارت کس طرف ہے تو وہ پورے پاکستان کے نقشے کو اٹھا کر آپ کے سامنے رکھ دیں اور آپ کو اتنا تسلی و تشفی کے ساتھ سمجھائیں گے کہ آپ بورڈ کی عمارت تک پہنچیں یا نہ پہنچیں کوئین چوک تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ ہم نے ایک صاحب سے سرگودھا کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ نام کہاں سے آیا اتنا تو پتہ نہیں ہے البتہ اتنا ضرور پتہ ہے گودھا میں سے "و" کو نکال لیا جائے تو جو نام بچتا ہے وہ آجکل سرگودھا کی شناخت بن چکا ہے۔

یونیورسٹی آف سرگودھا کی عمارت میں ہمیں ایک دوست نے دن دیہاڑے داخل کروایا۔ تو ہم نے وہاں پر بہت سے بن بیاہ جوڑوں کو دیکھا جو جوڑیوں کی شکل میں گھریلو مسائل پر گفت وشنید کر رہے تھے۔ بہت سے لڑکے اپنی منہ بولی بہنوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت دینے کے لیے رضامند تھے۔ یونیورسٹی کے اندر داخل ہو کر ہمیں اندازہ ہوا کہ سرگودھا یونیورسٹی میں شعراء کی تعداد کیوں زیادہ ہے۔ یونیورسٹی کے صحرا میں بھٹکے ہوئے بہت سے آوارہ مجنوں دشت لیلیٰ کا سفر کرنے کے لیے ہاتھوں میں آئی فون پکڑے ہوئے انتظار لیلیٰ میں گرمیوں کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارا یونیورسٹی کے اندر داخل ہونا پھر یوں گھومنا معیوب سا لگ رہا تھا۔ کیونکہ نکلے میاں بھی کنوارے ہی تھے اور بن بیاہے جوڑوں سے نا آشنا تھے۔ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں پکنے والے گوشت کے متعلق بھی چرچے سنے کہ کس طرح لذیذ گوشت گدھے کا لڑکوں کو کھلایا گیا۔ اور گوشت کھر کے ذائقے سے انہیں روشناس کرایا گیا۔ جولڑکے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا پائے وہ ضرور پچھتا رہے ہوں گے یہاں پر چند ایسی ہنس مکھ مزاج لڑکیوں نظر آئی جو ہر آنے والے کو خوش آمدید اور ہر جانے کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ بعض مرد حضرات بھی ہیئر سٹائل پرندوں کے گھونسلوں کی مانند بنا کر گھوم رہے تھے۔ ہمیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھا مردانہ ڈیپارٹمنٹ (جیالوجی) اور زنانہ ڈیپارٹمنٹ (ڈی فارمیسی)۔ یہاں پر مخالف صنف کا وجود اتنا ناپید تھا جتنا کہ قرضے کے بغیر پاکستانی حکومت کا چلنا۔ یونیورسٹی کے ماحول سے محظوظ ہوتے ہوئے چند بن بیاہے جوڑوں سے ہم نے گفت وشنید کرنا چاہی تو اُن کے مستقبل کے بچوں کی اماں نے انہیں منع کر دیا۔ ہم چپ سادھے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے دوست نے بتایا۔ یونیورسٹی کے اندر اور باہر موجود کو آپریٹیو سٹور اتنے سستے ہیں کہ بندہ کو پٹرول کی قیمت ۱۵۰ روپے لٹر ہو تو مناسب لگے۔ یونیورسٹی کے باہر چوک پر ایک حسین وجمیل اشتہار تھا زیورات کی مشہوری کے لیے۔ اس کے مخالف میں چند سرکاری بنچ بنی ہوئی تھیں۔ جہاں پر بیٹھ کر وہ لڑکے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جنھیں یونیورسٹی کے اندر یہ مواقع میسر نہیں ہوتے۔

ہمارے دوستوں نے ہمیں بتایا تھا کہ سرگودھا جیسا خوبصورت شہر آپ پورے پاکستان گھوم کے آئیں نہیں ملے گا واقعی ہمیں نہیں ملا۔ کیونکہ یہاں پر حسن کا نام ہی نہیں تھا تو ظاہری سی بات ہے ایک سا ماحول خوبصورتی ہی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اگر ماحول میں ایک لالہ نہ ہوا تو وہ سیاہ فاموں کو معیوب لگتا ہے۔ یہاں پر کافی سارے سیاسی مسلک پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر مضبوط سیاسی مسلک وہی ہے جو انسانوں کو پیار سے محبت سے تقسیم کرے اور حکومت کرے۔ اس کے اندر چوری کا خطرہ ہی نہیں ہے۔ بس موبائل چھیننے کی وارداتیں کبھی کبھی میڈیا کی بدمعاشی کی وجہ سے منظر عام پر آجاتی ہیں۔ آزاد میڈیا غریب چوروں کو ننگا کر کے پیش کرتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی


# واٹر پمپ مارکیٹ

**چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں اور عظیم شخصیات کے تذکروں پر مبنی ایک عظیم تحریر**

**ساٹھ** کی دہائی کا آغاز تھا، موجودہ عزیز آباد ٹیلے فون ایکسچینج کے عقب میں "عرشی ٹینٹ ہاؤس" قائم ہوا، فیڈرل 'بی' ایریا کے باسی، نذر نیاز، میلاد مولود، جلسہ مجلس، شادی بیاہ، غرض، خوشی غمی کے موقع پر عرشی ٹینٹ ہاؤس والے کا "تمبو" یا "شامیانہ" لگوا کر فرحت محسوس کرتے، دیدہ زیب، دل کش رنگوں والے چَو تھپے والے شامیانے، جن کے اندر سے اُٹھتی قورمے، بریانی، شیر مالوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں (بھائی! اگر زندہ رہا تو عرشی ٹینٹ والوں پر بھی کچھ لکھ دوں گا "کراچی رنگ" میں، حمیرا اطہر تو "کراچی کے رنگوں" کو "دائرۂ معارف العلوم کراچی" (کراچی کا انسائکلو پیڈیا) بنانے پر تُلی ہیں، ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا!!!!)

خیر۔۔۔ عرشی ٹینٹ والے کی دکان کے ساتھ ساتھ آگے کی جانب تشریف لائیے تو بائیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ریجنل دفتر کے ساتھ ساتھ، دائیں ایک سرکاری اسکول، بائیں رقیہ اسکوائر کے قدیم فلیٹس، ساتھ آغا خان کمیونٹی کا رہائشی علاقہ اور اُن ہی کا مطب۔ ذرا اور آگے تشریف لائیے تو دائیں دستگیر کالونی بلاک چودہ کے مکانات نصیر آباد، ذرا آگے دائیں بائیں جانب اب موٹر سائکل مکینکوں کا اژدہام (ساٹھ کی دہائی میں یہ بلائے ناگہانی نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ دائیں جانب چائے خانہ، لسی، بعد میں ماموں کباب ، السراج اسکوائر، فرید اسکوائر، دائیں جانب دواؤں کے تھوک فروش بیوپاری یعنی سولہا نمبر دستگیر بمع بلاک ۱۴ دستگیر، واہ واہ، کیا دن تھے؟ دل چاہتا ہے، پورے دستگیر کا پیدل نہ صرف خود چکر لگاؤں بلکہ قارئین کو بھی گھماؤں)

اب ذرا نکڑ پر پہنچ کر سامنے ملاحظہ فرمائیے، سڑک کے پار چیختے چلاتے "ماہی گیر" مچھلیوں کے ٹوکرے جمائے بیٹھے ہیں، روہو بھی مل جائے گی، دوتھر (دھوتر) بھی ہے، پاپلیٹ بھی تکئے اور جھینگا مچھلی کے مزے بھی لوٹئے، ہاہا۔۔۔ یہ لیجئے صاحبو "واٹر پمپ مارکیٹ" شروع ہوگئی۔ بائیں "نواز کورٹ فلیٹس" اور دائیں "گوشت مارکیٹ"، آیئے مارکیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ اب تو دکانوں، پتھاروں، ٹھیلوں کا اژدہام ہے۔

**مچھلی مارکیٹ:**

واٹر پمپ مارکیٹ کا "الف" یہی "مچھلی مارکیٹ" ہے، جب سے یہ مہک دار مارکیٹ قائم ہوئی، خریداروں نے "فشریز" یا لیاقت آباد کی "مچھی مارکیٹ" جانا کم کر کے یہاں قدم جمایا، اس طرح موسیٰ کالونی اور کریم آباد گوشت مارکیٹ کی "مچھلیاں" بھی گاہکوں کے انتظار میں "دیدہ و دل فرشِ راہ" کئے پڑی رہیں مگر واٹر پمپ مارکیٹ کی "مچھلی مارکیٹ" کی رونقوں میں کمی نہ آئی، لوگ دور دراز سے مچھلی لینے آتے۔ رفتہ رفتہ معصوم ماہی گیر "تیز و

وہ عکس بن کے میری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

آج سے کوئی چند برس قبل شہر کراچی سے ایک آواز دنیائے ادب میں گونجی، یہ آواز طارق بدایونی کی تھی ان کا ترنم بھی بہت خوب تھا مگر ہوا یہ کہ اُنہوں نے یہ مشہورِ زمانہ غزل اپنے نام سے پڑھنا شروع کردی، بس غزل کے مطلع میں لفظ عکس کی جگہ اشک کردیا اور اپنا نام طارق بدایونی سے طارق سبزواری کرلیا، یوں وہ دنیائے ادب سے بازارِ ادب میں چلے گے۔

اِسی دوران پاکستان کے مشاعروں میں ایک اور شاعرہ کی آواز گونجی۔۔۔ نازؔی چودھری۔۔۔ اس شاعرہ نے بھی یہی مشہور غزل اپنے نام سے پڑھنا شروع کردی یوں وہ بھی اس بازارِ ادب میں داخل ہوگئیں۔

اصل تماشہ اُس روز ہوا جب ایک ہی مشاعرے میں یہ دونوں مدعو تھے اور دونوں نے ہی یہ غزل اپنے اپنے نام سے پڑھی اور لڑنے لگ گئے کہ غزل اُن کی ہے یوں وہ مشاعرہ مجرے میں تبدیل ہوگیا مگر انتظامیہ بیچ میں آگئی اور اسی وقت دونوں سے یہ وعدہ لیا گیا کہ وہ دونوں یہ غزل اب کبھی نہیں پڑھیں گے۔

مجھے ایک صاحب نے ہندوستان سے ایک طویل خط میں لکھا ہے کہ یہ مشہور غزل طاہرؔ جونپوری کی ہے مگر کوئی ثبوت دیا ہے نہ کسی کتاب کا حوالہ کہ آخر یہ طاہرؔ جونپوری ہے کون کہاں رہتے ہیں؟ پاکستان کے شہر ساہیوال کی ایک شاعرہ سیما ناز ملک بھی اس غزل کی دعویدار ہیں۔

حضرات یہ غزل ان میں سے کسی کی بھی نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف مرحومہ بِسمِل صابری کی ملکیت ہے اور وہ ہی اس غزل کی اصل خالق ہیں۔۔۔ باقی سب جھوٹے ہیں۔

طرار'' مچھلی کے سیٹھوں کا رُوپ دھارتے گئے، جیسے جیسے مچھلی کی فروخت میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے آس پاس لہسن، پیاز، ادرک، مچھلی مسالوں کی دُکانوں اور پتھاروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا، ساتھ قسائیوں نے گائے، بھینس، بیل، بکرے، بکری کے گوشت کے تھڑے بھی قائم کرلئے جو اسّی کی دہائی میں قانونی ''دکانوں'' کی شکل اختیار کرگئے۔ دکانوں کے قیام کے بعد ہی اُن کے آگے پتھارے داروں نے ڈیرے ڈال لئے۔ ان میں سب سے مزے دار آئٹم وہ اوڈھنیاں (خواتین) تھیں جو گودی میں بچوں کو سلائے، لہسن، ادرک، پیاز، مرچ، ٹماٹر، ہرا دھنیا، پودینا فروخت کیا کرتیں۔ کبھی کبھار ''کے ایم سی'' کے جیالے ''چھاپہ'' مار کر عظیم الشان چیختی چنگھاڑتی ''واٹر پمپ پتھارا مارکیٹ'' کو اُجاڑ دیا کرتے لیکن کیا کیجئے کہ پھر کچھ ہی دنوں بعد یہ اُجڑا دیار پھر سے آباد ہوجاتا، مجھے یقین ہے کہ اگر میر تقی میرؔ، دلّی کی بجائے، واٹر پمپ مارکیٹ میں ہوتے تو کبھی ''دِلّی'' اُجڑنے کے مرثیے نہ کہتے، ہاہاہا، ہاہاہا۔۔۔

اپنے گرائیں شوکت علی فانؔی بدایونی کا شعر ذرا سا تبدیل کردوں کیونکہ ''اُردو کا ماسٹر'' (ماسٹر نہیں جناب، ماسٹر ہوں، کوئی پوچھنے والا تو ہے نہیں، ہاہاہا) شعر ہے ؂

''واٹر پمپ مارکیٹ'' وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہوسکے
پچھتاؤ گے ، سُنو ہو ، یہ بستی اُجاڑ کے

میرا دوست، سید عبدالعزیز عزمی، مرحوم ہوا، محمود شام صاحب کے بچوں کے پرچے ''ٹوٹ بٹوٹ'' میں ''ادیبوں کی ڈائری'' لکھا کرتا تھا، بڑی شان کے ساتھ کسی بس میں بیٹھ کر آتا، واٹر پمپ مارکیٹ پر وہ بس ''لینڈ'' فرمایا کرتی، اُس نے میری ڈیوٹی لگا دی تھی کہ جب بھی میں آؤں گا تو تمہیں ایک دن پہلے بتادوں گا، پھر تم شام کو پانچ بجے مجھے بس سے اتارنا اور واپس بھی بٹھا کر آنا، اُس وقت موبائل فون تو درکنار پی ٹی سی ایل فون بھی ہر گھر میں نہیں تھے، نواز کورٹ میں ایک ''پبلک کال آفس'' تھا، اُس کا مالک گھرکیاں زیادہ سنایا کرتا اور فون پر عزیزوں کی آوازیں کم، عزمؔی، بس سے اُتر کر مجھے گھر پر فون کرتا۔

''ہیلو! ۶۳۳۳۹۴۸ یہی ہے؟''

''جی ہاں!'' والدہ صاحبہ ارشاد فرماتیں۔

''مجیب ہے؟''

''کون؟؟''

''آنٹی، سلام علیکم! مجیب کو واٹر پمپ مارکیٹ بھیج دیں، کہیں

عزمی آیا ہے، مجھے بس سے لے کر آئے وہ!"

جاہل ایک نمبر کا مجھے آرڈر کرتا ، مرگیا سگریٹ پھونکتے پھونکتے ،مگر سگریٹ نوشی نہیں چھوڑی۔ایک دفعہ اللہ اللہ کر کے ٹلا، کھل کر بتایا کہ اب جاؤ بھائی، ابّو آنے والے ہیں، اچھل کر فرار ہوا۔ہاہاہا، والد صاحب کے گھر آنے کا وقت ہو رہا تھا، عزمی کے جانے کے بعد میں نے اپنے فلیٹوں کے نیچے واقع "واٹر پمپ لطیف مارکیٹ" اُتر کر ایک "رُوم فریشر" خرید کر ابو کے آنے سے پہلے کمرہ "فریش" کیا کیونکہ کمرے میں جناب عبدالعزیز عزمی بالی عمریا میں سگریٹ نوشی فرما گئے تھے۔وہ عجیب شان بے نیازی سے سگریٹ لبوں سے لگایا کرتے، میں "گھونچو" بنا حسرت، اُمید و ملامت سے اُن کا اسٹائل دیکھا کرتا، یک لخت وہ پورا سگریٹ جذب فرماتے اور پھر آہستہ آہستہ نتھنوں سے بھاپ والے انجن کی طرح رفتہ رفتہ دھواں و دخان خارج کرتے جاتے۔

"ابے مرجائے گا، چھوڑ دے یہ نلکی!" ایک دن میں نے کہا۔

"کس نے کہا ہے؟" عزمی نے پوچھا۔

"ففٹی ففٹی میں رزاق راجو، قاضی واجد سے کہہ رہا تھا!" میں نے ایک ٹی وی شو کا حوالہ دیا۔

"چل بے! بکتا ہے وہ، سگریٹ پینے سے تو طاقت ملتی ہے!"

سگریٹیں پھونکتے پھونکتے جب عزمی مر ہی گیا تو میں نے الطاف پاریکھ کے ساتھ اُس کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر چلّا کر کہا: "اب بیٹھ تا اُٹھ کر مردود، کہاں گئی تیری وہ سگریٹ والی طاقت؟"

مجھے لگا عزمی ابھی اُٹھ بیٹھے گا اور گالیوں کا طوفان لے آئے گا، لیکن وہ نہ اٹھا۔پھر میرے دوستوں کی تعداد کم ہوگئی۔کل ایوارڈ کی ایم تقریب میں محترمہ حمیرا اطہر سے وعدہ کرلیا تھا کہ اب خاندانی شرافت، نجابت و وقار کے ساتھ "واٹر پمپ مارکیٹ" سپردِ قلم کروں گا، لیکن نظر کا کیا کیجیے کہ ساتھ ہی پروفیسر یاسمین حفیظ بیٹھی نظر آئی، ہرچند کے بچپن کے "ساتھی"، "بچپن" سے اوپر پہچاننے میں دقت پیش آتی ہے، پھر بھی گھر پہنچ کر میں زار و قطار ہنسا کہ ہائے ہائے یاسمین بھی "فُل پروفیسر" ہوئی، ہاہاہا، ہاہاہا، ہاہاہا

(بھائی، داستان جاری ہے، مچھلی مارکیٹ کا احوال جاری ہے لیکن واٹر پمپ مارکیٹ کے تذکروں کے ساتھ ساتھ واٹر پمپی شخصیات کے خاکے بھی آپ کو برداشت کرنا ہوں گے)

محمد ایوب صابر

# شیخ جی کی موٹر سائیکل

شیخ مشرف الدین کی موٹر سائیکل کو کچھ لوگ دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیتے ہیں۔ یہ موٹر سائیکل شیخ جی کے جوانی کی سب سے حسین یادگار ہے۔ جس طرح شیخ جی اپنی جوانی سے والہانہ پیار کرتے ہیں اسی طرح انہیں ۱۹۶۰ء میں خریدی گئی اپنی موٹر سائیکل بہت عزیز ہے اور عزیز کیوں نہ ہو اس زمانے میں شہر کے چند امراء کے پاس یہ نایاب سواری ہوتی تھی۔ ان دنوں موٹر سائیکل صرف سواری کے کام آتی تھی۔ آجکل تو گوالا دودھ بیچنے کے لئے بھی اس پُھرتیلی سواری کا استعمال کرتا ہے۔

موٹر سائیکل سوار جب اپنی پھٹ پھٹی پر بیٹھتا ہے تو ذہنی طور پر وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہوتا ہے۔ اسی نشے میں مخمور ہو کر اس کا سر بہت ہلتا ہے جس کیلئے ہر ملک میں موٹر سائیکل پائلٹ کے لئے لوہے کی ٹوپی پہننا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ لوہے کی یہ ٹوپی، اپنے پہننے والے کو بار بار یاد دلاتی رہتی کہ آرام سے موٹر سائیکل پر بیٹھ، زیادہ ہل مت، ورنہ ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسی لئے اس ٹوپی کو پیار سے "ہلمت" کہا جانے لگا جو بعد ازاں بگڑ کر "ہلمٹ" ہو گیا۔

ہاں بات شیخ جی کی موٹر سائیکل کی ہو رہی ہے۔ شیخ جی اپنے ہاں آنے والے ہر مہمان کو اس طرح موٹر سائیکل کی تاریخ پیدائش سے لے کر جغرافیہ تک بتانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اب تو محلے داروں کو شیخ جی کی موٹر سائیکل کی تمام خوبیاں زبانی یاد ہو چکی ہیں۔ بچے اکثر کھیل کود میں ایک دوسرے کو موٹر سائیکل کی خوبیاں بتا کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شیخ جی کا دعویٰ ہے کہ وحید مراد اور محمد علی نے دو فلموں میں اسی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر شوٹنگ کی تھی گویا بڑے بڑے فلمی ستارے اس کے سفر سے محظوظ ہو چکے ہیں، بلکہ محمد علی نے تو شیخ جی سے ہی موٹر سائیکل چلانا سیکھا ہے۔

شیخ جی کے بقول ان کی موٹر سائیکل پٹرول انتہائی کم کھاتی (پیتی) ہے لیکن استعدادِ کار میں کار کے برابر ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا شیخ جی! مجھے یہ منطق سمجھ نہیں آئی۔ اب وہ اپنی موٹر سائیکل کے حق میں یوں رطب اللسان ہوئے کہ میں اس موٹر سائیکل پر پورے خاندان سمیت سفر کرتا ہوں۔ اس طرح ایک لیٹر پٹرول میں سارا خاندان شہر بھر گھوم لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایئر کنڈیشنر لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ قدرتی ہوا کے مزے لوٹتے ہوئے موٹر سائیکل پر اڑتے جاتے ہیں۔ ہاں اکثر راستے میں دو تین دفعہ موٹر سائیکل خراب ہو جاتی ہے ورنہ مسلسل سفر سے آدمی تھکن کا شکار ہو کر بیمار شمار بھی ہو سکتا ہے۔

شیخ جی کار کی سواری میں مندرجہ بالا وجوہ کے پیشِ نظر مضرِ صحت اور مضرِ جیب قرار دیتے ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ موٹر

سائیکل ایجاد ہونے کے بعد کار کی چنداں ضرورت نہیں تھی اس کے علاوہ یہ ورزش کے کام بھی آتی ہے۔ صبح دفتر جانے کیلئے شیخ جی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کیلئے اسے روزانہ ۴۰ سے ۵۰ مرتبہ کک مارے ہیں، لیکن اس قدر ککیں کھانے کے بعد بھی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتی۔ بالآخر تنگ ہو کر شیخ جی اسے زور دار لات رسید کرتے ہیں۔ اس لات کے ساتھ ہی موٹر سائیکل فوراً اسٹارٹ ہو جاتی ہے کیونکہ موٹر سائیکل بھی جانتی ہے کہ لات کے بعد صرف دولتی کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔

کبھی کبھی شیخ جی اپنی موٹر سائیکل کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور ٹکٹکی باندھ کر اِسے دیکھتے ہیں۔ میں نے ایک دن شیخ جی سے دریافت کیا کہ آپ سارا دن تو اس موٹر سائیکل پر لٹکے رہتے ہیں پھر شام کے وقت اِسے یوں گھورنے کیوں بیٹھ جاتے ہیں؟ شیخ جی نے کہا کہ میں اِسے گھورتا نہیں بلکہ پیار سے دیکھتا ہوں۔ یہ میرے متوفی اباجان کی آخری نشانی ہے۔ اس لئے جب مجھے ابا جی کی یاد ستاتی ہے تو میں موٹر سائیکل کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اس طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ میں کہا شیخ جی سارا دن تو آپ اپنا سارا بوجھ اس پر لادے گھومتے ہیں کم از کم شام کو تو اسے آرام کی مہلت دے دیا کریں۔

شیخ جی کی موٹر سائیکل اکثر خراب رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ موٹر سائیکل اپنی مخصوص آواز کے ساتھ جب گلی میں داخل ہوتی ہے تو بچے اکثر زور سے آواز لگاتے ہیں کہ آج پھر موٹر سائیکل صحیح سالم گھر واپس آ گئی ہے۔ ایک دن ماسٹر علم دین نے تو حد کر دی، انہوں نے ازراہِ تفنن کہہ دیا کہ "شیخ جی کیا اس پھٹ پھٹی کو گھسیٹے رہتے ہو، اسے فروخت کر کے، کچھ مزید پیسے ڈال کر کوئی اچھی سی سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟ روزانہ کی کھٹ پھٹ سے تو جان چھوٹ جائے گی۔"

شیخ جی بھی محلے داروں کی طرح ماسٹر علم دین کی بہت عزت کرتے ہیں اس لئے غصہ شیطان کا ہتھیار سمجھ کر پی گئے، اگر یہ بات ماسٹر علم دین کے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی تو شیخ جی وہیں کھڑے کھڑے اس کا حساب برابر کر دیتے۔ شیخ جی نے موٹر سائیکل کے بارے میں کچھ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں کچھ پیش قیاسیاں بھی کی تھیں جو اُس زمانے میں تو دیوانے کی بڑ ہی لگتی تھیں۔ شیخ جی کہتے تھے کہ: "آنے والے وقتوں میں موٹر سائیکل جیٹ کی اسپیڈ پر چلے گی اور ہیلی کاپٹر کی طرح ہوا میں گھومے گی۔" ہم کہتے شیخ جی آپ کو بھی لمبی لمبی چھوڑنے کی عادت ہے مگر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو آج شیخ جی باتیں سچ ثابت ہو چکی ہیں۔

ایک خبر کے مطابق بیڈفورڈ کے رہائشی رابرٹ میڈاکس نے ۱۹۲۶ء کی ہارڈلے ڈیوڈسن بائیک میں دو عدد جیٹ طیاروں کے انجن نصب کر دیئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ موٹر سائیکل ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتا سے دوڑ سکتی ہے۔ میڈاکس کا کہنا ہے کہ یہ موٹر سائیکل اتنی طاقتور اور منہ زور ہو گئی ہے کہ اپنے اوپر سوار شخص کے بازوؤں کو توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہاں تیز رفتاری کی بات نئی ہے جبکہ بازو توڑنے کا معاملہ پرانا ہے۔ ہمارے شیخ جی اپنی موٹر سائیکل سے بازو ہی کیا کئی دفعہ اپنی ہڈیاں، پسلیاں تڑوا چکے ہیں۔ شیخ جی کے جسم کا شاید ہی کوئی اعضاء اس "شیطانی چرخے" کی ضرب کاری سے محفوظ رہ سکا ہے۔ اس کے باوجود شیخ جی اس موٹر سائیکل کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

شیخ جی کی دوسری پیش قیاسی بھی حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔ آسٹریلوی باشندے کرسٹوفر مالوے نے دنیا کی پہلی اڑن موٹر سائیکل ایجاد کر لی ہے۔ کرسٹوفر کا کہنا ہے کہ یہ اڑن موٹر سائیکل ۱۰ ہزار فٹ کی بلندی پر ۱۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضا میں اڑ سکے گی۔ اس کا کہنا ہے اس موٹر سائیکل پر صرف ایک آدمی ہی سفر کر سکتا ہے۔ گویا فضا میں بھی ڈبل سوار کی ممانعت ہو گی۔ کرسٹوفر جانتا ہے کہ دہشت گردی پر قابو پانے کیلئے ڈبل سواری کی پابندی کا رواج بہت جلد پوری دنیا میں عام ہو جائے گا اس لئے ڈبل سواری کا انتظام کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

> محبت کے امتحان میں جو بھی پاس ہوا، نتیجہ خود نہ سُن سکا۔
>
> اعظم نصر

کے ایم خالد

# گجب کہانی

**سپاٹ** چہرہ اور عینک بچپن سے ہی اس کی پہچان تھی استاد سے سردیوں کے پہلے پیریڈ میں بھی چھڑی سے مار کھاتے ہوئے وہ دوسرے طالب علموں کی طرح نہ تو ہاتھ کو بغل کی طرف لے جاتے ہوئے اوئی، آئے کرتا تھا نہ ہی اس کے سپاٹ چہرے کے تاثرات بدلتے تھے۔ اسے ایک عجیب سا مسئلہ تھا قریب کی عینک سے اسے دور کی چیزیں صاف دکھائی دیتی تھیں لیکن جب وہ ان چیزوں کے پاس جاتا تو اسے احساس ہوتا کہ یہ وہ تو نہیں ہے جو اس نے دور سے دیکھا تھا سب طالب علم اسے کھوجی کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اسکول جاتے اور واپس آتے ہوئے وہ پھونک، پھونک کر قدم رکھتا تھا سارا دن کلاس میں وہ اپنی تحقیقاتی کہانیاں سناتا رہتا جو کہ زیادہ تر اس نے اپنے ذہن کے مطابق تیار کی ہوتی تھیں لیکن سب بچے اس کی کھوجی کہانیوں میں بڑی دل چسپی ظاہر کرتے تھے۔ ایک دن تفریح کے وقت اس نے ایک کہانی کا اینڈ کرتے ہوئے اس نے اپنی عینک درست کر کے دور دفوکس کی اور کہا" اوئے، چاچے جمالے کی مرغیوں کو ایک موٹا تازہ بلا بھنبھوڑ رہا ہے" سارے بچے اس کے ساتھ ہی چاچے جمالے کے گھر میں داخل ہو گئے وہ بھی پھونک، پھونک کر قدم رکھ رہا تھا مرغیوں کا باڑہ دوسری منزل پر تھا سارے بچے وہاں پہنچے وہ سب سے آگے تھا کسی مرغی کی کڑکڑ کی آواز آ رہی تھی اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا اندر ایک مرغی انڈوں پر اپنے پر ٹھیک کرتے ہوئے کڑکڑ کر رہی تھی مرغی نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کیا ہوا۔۔۔؟ تجسس، کھوج اور کہانی اس کے ساتھ ہی جوان ہوئی وہ صحافت میں آیا تو چھاتا ہی چلا گیا اس کی تحقیقاتی کہانیاں اس کے ادارے اور اس کا نام بناتی چلی گئیں وہ قریب کی عینک سے دور دیکھتا اور تحقیقاتی کہانی اپنے انجام کو پہنچ جاتی اس کی ان تحقیقاتی کہانیوں کی بدولت پیسہ اور ادارہ اس پر بڑا عاشق تھا بہت سی پرنٹ میڈیا کی صرف قریب ہی دیکھنے والی شخصیات اس سے "حسد" کرتی تھیں اسے بہت سے اخباروں نے بڑی بڑی آفرز کیں لیکن وہ قریب کی نظر سے دور دیکھ کر وہ ان آفرز کو ٹھکراتا رہا۔ وہ اپنی تحقیقاتی رپورٹس کی بدولت ایسی سنسنی اور تجسس پیدا کر دیتا تھا کہ بڑے بڑے تحقیقاتی صحافی اس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ پاکستان پرنٹ سے الیکٹرنک میڈیا میں داخل ہوا اس نے بھی کیمرے کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے کیمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سپاٹ چہرے کی ساتھ دور دیکھتے ہوئے "گجب کہانیوں" کی لائنیں لگا دیں اور اس کا ادارہ اس کی بلائیں لیتا نہیں تھکتا تھا اس نے قریب کے عینک سے اپنے ادرے میں رہتے ہوئے بہت کچھ محسوس کر لیا تھا اور کوئی بہت دنوں سے کوئی اسے "بولنے" کے لئے اکسا رہا تھا

ایک پبلک میٹنگ کے دوران ایک عورت نے ونسٹن چرچل سے کہا "اگر تم میرے شوہر ہوتے تو میں تم کو زہر دے دیتی۔"
چرچل نے جواب دیا "نہیں میڈم! اگر آپ میری بیوی ہوتیں تو میں خود ہی زہر کھا لیتا۔"

لیکن وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ خاموش رہا معاملہ لاکھوں سے کروڑوں تک جا پہنچا تھا ایک رات اس نے اپنی قریب کی عینک فٹ کی اور اپنی نظریں "ایگزیکٹ" اس جگہ فوکس کر دیں جہاں سے اسے "بولنے" کے لئے اکسایا جا رہا تھا آفر بہت بڑی تھی کام وہی "عجب کہانی" صرف دفتر اور کیمرے اور ماحول ہی بدلنا تھا اس کا موجودہ ادارہ بھی ڈانواں ڈول تھا روزانہ صبح شام ادارہ کے لئے ایک "ڈاکٹر" معافی کا خواستگار ہو رہا تھا اس کی عینک اسے مبارک باد دے رہی تھی اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ آفر قبول کر لی اسے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ جو اس عینک سے دور سے دیکھتا تھا قریب جانے پر منظر کوئی اور ہی ہوتا تھا لیکن یہ اتنے "ایگزیکٹ" لوگ اپنے پاکستان میں حیرت کی بات ہے وہ ان کی کوئی "عجب کہانی" تلاش نہ کر سکا وہ روزانہ ڈمی کیمرہ کے سامنے اپنی "عجب کہانی" کرتا اور سٹاف کی تالیوں کی گونج میں اپنی دفتر کی راہ لیتا وہ اپنی آرام کرسی پر انگلیوں پر حساب کرتا کہ ایسے ادارہ پہلے مل جاتا تو پچیس سال میں کتنے کروڑ اکٹھے ہو جاتے اور ایک ارب تک نہ صرف ہکلا جاتا بلکہ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی۔ اچانک ایک دن اس نے دیکھا کچھ چینل اور اخبار اور ہی بول رہے تھے معاملہ سنگینی کی طرف جا رہا تھا پھر اس نے اپنے "ضمیر" کی آواز پر "بولنے" سے پہلے ہی خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا وہ پہلا کپتان تھا جو اس جہاز سے اترا اسے حیرت اپنی عینک پر تھی اس نے عینک اتار کر دیکھا اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں پر اب بھی کوئی پٹی نما چیز ہے اس نے اس پٹی کو اتارا تو وہ لالچ کی پٹی تھی لالچ کی پٹی اتار کر اس نے دوباری عینک پہنی اور "ایگزیکٹ" وہاں دیکھا جہاں سے وہ خاموش لوٹ آیا تھا ایک نیا نکور سرخ رنگ کا جگمگاتا ہوا چینل اسے دوبارہ "دعوت گناہ" دے رہا تھا اس نے جلدی سے عینک اتار دی۔

شفیق زادہ ایس احمد

# ڈائری کے دو ورق

**سرگوشی**

"میری ڈائری میری سہیلی"
دسمبر ۲۰۱۵ء کی کوئی تاریخ

زندگی میں چھوٹی سی تبدیلی ایک بڑے بھونچال کا سرچشمہ ثابت ہوسکتی ہے، کم از کم میری چھوٹی سی نوکری نے تو یہی ثابت کیا ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہی ایک اسکول کو جوائن کیا ہے۔ مگر اس مختصر عرصے میں ہی طبیعت اتنی تنگ آگئی تھی روز روز کی جھک جھک سے کچھ نہ پوچھو۔ پہلے تو ایمان سے ٹھاٹ سے نیند پوری کرتی تھی۔ چاہے اس میں کی اپنی وجہ سے ہو یا میاں کے بڑھاپے میں بڑھتے چونچال کے باعث۔ اپنی مرضی سے اُٹھ کر پھر ماسی میڈیا سے پورے گھر کا کام کروا کر اطمینان سے "ہم ٹی وی" پر ممنوع موضوعات پر بولڈ ڈرامے بنا روک ٹوک دیکھا کرتی۔ شام کو بھی بچے اسکول ورک، ہوم ورک، پروجیکٹ اور فیس بک پر غیبت وغیرہ میں لگے رہتے تھے اور میں اسی دوران جلدی سے جم بھی ہو آتی تھی۔ آٹھ سوا آٹھ بجے بچوں کو کھانا کھلا کر، ڈانٹ پلا کر، سلا کر خود بھی میاں کے ساتھ تھوڑا بہت زہر مار کرلیتی۔ برتن سمیٹتے سمٹاتے یہ بھی چیخنے چپانے لگ جاتے تو میں بھی سونے لیٹ جاتی۔ دو ڈھائی گھنٹے میں نیند آ ہی جاتی اور گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ سو بھی چکے ہوتے تو صبح آنکھ بھی آرام سے کھل جایا کرتی تھی۔ ہائے کیا دن تھے، اُف!

مگر اب تو یہ حال ہے کہ چار بجے تھکن سے چور لڑکھڑاتے گھر میں داخل ہوتی ہوں تو سب سے پہلے بچوں کی چیں چیں، چخ چخ سننے کو ملتی ہے جو شام ڈھلے تک جاری رہتی ہے۔ ان سے جان چھوٹتی ہے تو میاں کی سرگوشیاں بھیجے کا ملیدہ بنانا شروع کردیتی ہیں جو رات تک جاری رہتیں۔ سچ کہا تھا ہماری چندا چچی نے کہ اکلوتے مرد سے شادی نہیں کرنی چاہئے ورنہ تمام زندگی آیا بن کر پالنا پڑتا ہے۔ ہمارے والے تو پالنے میں بھی منہ پھلائے رہتے ہیں جب تک کہ منہ میں ان کا پسندیدہ پکوان نہ گھسیڑ دوں، رال ٹپکتی ہی رہتی ہے۔ ندیدے پن کی بھی انتہا ہے۔ ماسی میڈیا نے بھی شام کو آنے سے انکار کردیا ہے، کہتی ہے "بوائے فرینڈ کو پسند نہیں کہ جب وہ گھر آئے تو میں موجود نہ ہوں"۔ کمینی کہیں کی! کسی نے زیادہ پیسے دیے ہونگے تو اسی طرف پھسل گئی ہوگی۔ اب تو چار بجے گھر میں گھسنے کے بعد، صفائی شروع کرتی ہوں اور ساتھ ہی شام کے کھانے کی تیاری بھی چل رہی ہوتی ہے۔ بچوں کے قضیئے نمٹانا بھی میرا ہی کام ہے، میں تو فیصلہ صادر کردیتی ہوں، معزز عدالت کی طرح، عملدرآمد ہو کیا کچھ برآمد نہ ہو، بھاڑ میں جائے، اس سے

زیادہ انصاف کی تحریک میرے اندر نہیں ہے۔ میں کونسا کسی بحالی کی تحریک میں بھگا کر لائی گئی ہوں، اس گھر میں باقاعدہ بیاہ کر برآمد کیا گیا ہے مجھے، وہ بھی کسی این آر او کے بغیر۔ تو بھلا میں کیوں اوقات سے بڑھ کر بڑھک مار کر اپنا بیڑہ غرق کروں۔ بچوں کو بھی اب بڑا ہو جانا چاہئے، کب تک باپ کی طرح بچّہ بنیں رہیں گے۔ خیر، ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ کھانا کھلانے کے وقت کمر تختہ ہو رہی ہوتی ہے۔ چار سیزرین کے بعد کسی اور طرح کے پاؤں بھاری تو کیا سُن ہونے کے تصور سے بھی کانپ جاتی ہوں، مگر یہ آسان سی بات اِن کے بھیجے میں کون پہنچائے۔ عشاء تک تمام کام کاج سے فارغ ہو جاتی ہوں، بلکہ یہ کہو کہ ایک مختصر سا وقفہ ملتا ہے تو وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتی ہوں اور تسبیح ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی بستر پکڑ لیتی ہوں۔ اس طرح تمام طرح کے وظائف سے فراغت کے بعد کوئی بارہ بجے جو بے خبر سوتی ہوں تو یہ بھی نہیں پتہ چلتا کہ آج کل یہ نیٹ چیٹنگ کر رہے ہیں یا آفس میں چھوڑے موبائل سے صرف ایس ایم ایس پر ہی گذارہ ہے، میری بلا سے (لیکن پھر بھی؟)۔ ادھر اسکول کے بین الاقوامی بچے؟ اف توبہ، اتنے خاندانی کہ کسی شریف آدمی کو اپنے بچوں کی تربیت کرنی پڑے تو، ان سے بڑھ کر کوئی اور مثال نہیں ہو سکتی۔ یعنی، بس ان تمام حرکات سے اجتناب کرایا جائے جو یہ بچے کرتے ہیں، تربیت خود بہ خود ہو جائے گی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کسی سانچے میں ڈال کر ان جیسے گدھوں کو مرغا بنا دوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر گدھوں کو مرغا بنا دوں تو بار برداری کون کرے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ نقصان کہ وقت پڑھنے پر ہمارے سیاست دان، باپ کسے بنائیں گے۔

آج بہت دنوں کے بعد شمسہ کا فون آیا تھا۔ میں اس وقت باتھ روم میں ہارپک لگا رہی تھی، میں نے تو کافی گھنٹیاں بجنے کا بعد فون اٹھایا اور ہانپتی سانسوں میں ہیلو ہیلو کہا۔ اس نے پوچھا "اتنی دیر بعد فون پک کیا" تو میں بولی "بہت بزی ہوں"۔ اس نے شاید مذاقاً یا طنزیہ سوال کیا "کیوں؟ کیا میاں نے چھٹی کی ہے۔" جھوٹ تو میں بولتی نہیں، صاف جواب دی کہ "جی نہیں، وہ آج ہی تو کام پر گئے ہیں، سوچا میں بھی دوسرے کام نپٹا لوں، کیا خبر لنچ پر پھر آ دھمکیں"۔ بہت کمینی ہے، اس نے کہا "کرموں کا بھوگ بھگت رہی ہو"۔ میری ہنسی چھوٹ گئی "بھوگ نہیں بُھوت"

اچھا بھی اب مزید نہیں لکھا جاتا، بہت نیند آ رہی ہے، انہوں نے باتھ روم کی لائٹ تو بند کر دی ہے، اب کچھ دیر میں کمرے کی بھی ہونے والی ہے، ڈیئر ڈائری باقی باتیں کل، سایونارا

## دہائی

**میری ڈائری سے ایک ورقِ بیچارگی**

**چند سال پہلے لکھا ہوا**

ہمارے گھر میں آنے والے نئے مہمان نے ہمیں بس "شوہر" بنا کر ہی رکھ دیا تھا۔ انگریزی میں پڑھیں تو 'شو' یعنی دکھاوا اور "ہر" مطلب اس کا، بس ہم ان کے ہی ہو کر رہ گئے جسے وہ بہت فخر سے اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر ساتھ لیے پھرتیں۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ موصوفہ نے قبلہ والد صاحب کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اس ہمنوائی کی آڑ میں بڑے دھڑلے سے ہم کو دھمکیاں دی جاتیں جو کہ شاذ ہی کبھی ڈھکی چھپی ہوتیں۔ بہت ہی صاف و سلیس الفاظ میں نتائج کی ذمہ داری اور کیے کا بھگتان ہمارے گلے ڈالا جاتا۔ حد تو یہ کہ ہم اُن تمام پوشیدہ اور مخفی وارداتوں کے مبینہ سزاوار حقدار ٹھہرائے جاتے جو ہم سے نہ کبھی سرزرد ہوئے یا جن کے بارے میں کبھی سوچا ہی ہو۔ والدہ محترمہ اور موجودہ ساسو ماں البتہ ہماری درپردہ حمایتی تھیں مگر توازنِ طاقت کا جھکاؤ موصوفہ کی طرف دیکھ کر وہ بھی اعلانیہ اس حمایت کا اظہار نہیں کرتیں۔ خاص طور سے موصوفہ کے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے بعد تو ممتا کا شہد ہمارے حلق تک پہنچتا ہی نہیں۔ ساس بہو ہم دو ہمارے دو کے مصداق سہیلی سہیلی کھیلنے میں مگن تھیں۔ اگر جنّت کا لالچ نہ ہوتا یا والدہ سیاست دان ہوتیں تو سائڈ بدلنے پر "لوٹی" لقب پاتیں۔ ہم بھانپ رہے تھے کہ کہ چند سال اور گزریں گے اور ہم بھی قبلہ والد صاحب کی طرح آہنی؛ معاف فرمایئے گا "آئینی" صدر بن جائیں گے، یعنی اختیار سے محروم صرف دستخط کرنے کی مشین۔

وطنِ عزیز کے لوگ بہت خوش نصیب ہیں کہ بات اٹھارہویں ترمیم تک لے گئے، ہم نے تو اپنی ازدواجی حیثیت میں کبھی دوسری ترمیم کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارا شادی شدہ ہو کر ختم شدہ ہونے کا تجربہ ایسا کچھ دلربا ہرگز نہ تھا کہ "ڈو مور ڈو مور" کی دعوتی صدائیں نزلہ سے بند ہمارے کانوں میں گونجتیں۔ اوپر سے بیگم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر جو حفاظتی اقدامات کئے ہوئے تھے وہ ہمہ وقت ہمیں سہمانے اور دھمکانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے۔ اس معاملے میں بیگم کی دور اندیشی یوں امریکہ شریف کو بھی مات دیے جاتی ہے کہ ہمارے ارتکابِ جرم سے پہلے ہی فردِ جرم عائد ہو چکی ہوتی۔ یوسف زئی پٹھانی نے باتھ روم میں فنائل کی تیز اثر بوتل، تنویمی طاقت والی سکون آور گولیاں اور ہمارے ائیر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں بغیر پنکھے کا قزاقی ہاتھ جیسا ہک دکھا دکھا کر ہماری جان آدھی کر رکھی تھی۔ آپ سب سے چھپا نہیں ہے کہ "ہم تماشا" میں بیان کردہ آصف قدر ٹھرکی والے معاملے کی جانکاری کے بعد وہ پہلے ہی ہم سے ہمارے زیرِ نگین ہونے کا خراج بہ شکل فسادی دھات کے کنگن وصول کر چکی تھیں اور ساتھ ہی خوب اندازہ لگا چکی تھیں کہ ہمارا بریکنگ پوائنٹ کب آتا ہے، جس کے آنے میں انتظار کی گھڑیاں کبھی بھی طویل نہ ہوئیں۔ ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی گمان تھا کہ دھمکانا اور دہلانا اور بات ہے مگر وہ کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گی جس پر وہ ہم پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھیں، چاہے اصلی یا بناوٹی بیہوشی کے ندلھوں کے لئے ہی صحیح۔ مگر پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ پٹھان بچّی ہے، نہ جانے کس وقت کیا کر بیٹھے، کوئی خوبرو یا پھر خود کش دھماکہ۔ ہمیں خوب جتا دیا گیا تھا کہ (یقینی) ناکام کوشش پر ہمارا کیا حال ہو سکتا ہے۔ جس کا سب سے عبرت ناک پہلو یہ تھا کہ ہمیں اپنے ہاتھ کی بنی چائے خود نوش کرنا پڑے گی۔ وہ چودھری اور چودھرائن کی کہانی سے بہت متاثر ہوئیں، آنکھوں میں آنسو بھر کر ہمارا ہاتھ تھام لیا' چودھرائن بہت عظیم عورت ہیں مگر میں ایسی بالکل نہیں ہوں۔ اسی لئے آپ کسی دھوکے میں مت رہئے گا، میرا نشانہ بہت پکا ہے، اگر بیلن پھینک کر گھٹنے پر ماروں تو وہیں لگے گا، اور اگر طبلے کی طرح سر پر بجاؤں تو گومڑ بھی آپ کے بے بال سر سے ہی نمودار ہوگا۔' پھر روہانسی ہو کر کہنے لگیں "لیکن کسی کی بھی قسم لے لیجئے، اگر آپ کی تیمارداری میں کوئی کوتاہی کروں تو بے فکر ہو کر چٹیا پکڑ لیجئے گا۔ چاہے چھوڑ آئیں مجھے نئے والے فلیٹ میں، میں اُف تک نہ کروں گی، بس آپ ہی کے اے ٹی ایم کارڈ سے خرچ کے پیسے نکال لیا کروں گی۔ اس وقت تک میری ساس نندیں وغیرہ حالات سنبھال ہی لیں گی۔"

موصوفہ بیگم کو خطّے (سسرال) میں اپنی" اسٹریٹیجک ڈیپتھ"یعنی اہمیت کا خوب اندازہ تھا اور اس کا فائدہ اٹھانے کی مہارت بھی تھی۔ ہماری جھکتی کمر میں آخری تنکا پرستانی پارلیمنٹ سے حال ہی پاس کیا گیا "حقوقِ نسواں بہ مخالف تشددِ نسواں" بل ثابت ہوا۔ اب اس قانونی شکنجے کی مدد سے وہ بغیر کسی وجہ کے ہمیں تھانے میں بند کروانے کی مجاز تھیں اور اندھا قانون بھی ان کا ہی ساتھ دے گا۔ ہمیں یقین تھا وہ کچھ بھی کریں، ہم ہی تفتیش کے دائرے میں پھنس جائیں گے۔ پہلے داخلی طور پر سگے رشتہ داروں کے ہاتھوں اور پھر خارجی طور پر سسرالیوں کے چنگل میں۔

ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ جسے دلہن بنا کر دل میں بسائے ناز برداریاں اُٹھانے کے چکر میں لائے تھے اس نے الٹا ہمارا ہی "دولہا" بنا کر بار برداریاں شروع کروا دیں۔

ہمارے ہم عصر اور ہم پیالہ پیارے میاں شام کو کہہ رہے تھے کہ "نئی بیوی اور نئے رشتے، نئے جوتے کی طرح ہوتے ہیں، جب تک پاؤں میں اچھی طرح فٹ نہ ہو جائیں، کاٹتے ہی رہتے ہیں۔" ہم ان کی اس بات سے متفق ہیں، کلی طور سے، کیوں کہ ہماری باہوش زندگی میں میں رشتوں کی کاٹ کو ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

اب تو ہمارے ہاتھوں میں تینتیس دانہ تسبیح ہے جس پر ہم ذیل میں درج شعر کا ورد کرتے ہیں اور اچھے دنوں کی آس میں دانے گھماتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

## ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

جو آئیں سسرالی گھر زیادہ
تو ہوتا ہے دردِ سر زیادہ
بنا ہے جب سے قریب تھانہ
بڑھا ہے خوف و خطر زیادہ
لگائی اہلِ نظر نے عینک
کہ آئے ان کو نظر زیادہ
دکھایا سرجن کو جب سے میں نے
ہوا ہے دردِ کمر زیادہ
سکون و امن و قرار کم ہے
بشر میں ہے شور و شر زیادہ
کہیں یہ دل ہو نہ جائے پنکچر
نہ مارو تیرِ نظر زیادہ
پڑھا ہے اخبار جب سے میں نے
ہوا ہوں میں بے خبر زیادہ
مبادا پیروں میں موچ آئے
نہ گاؤ یوں جھوم کر زیادہ
ہیں پاس جس کے زر و جواہر
وہی ہے یاں معتبر زیادہ
مریض ہیں اب بھی ابتلا میں
ہیں گرچہ اب ڈاکٹر زیادہ
ہے ''کنفیوژن'' کدھر کو جائیں
کہ اپنے ہیں راہبر زیادہ
پیاز یوں کاٹتے ہیں مظہر
ہے چشمِ تر میں اثر زیادہ

## ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

جب گھر میں نہ ہو کھانے کا سامان وغیرہ
آ جاتے ہیں پھر سارے ہی مہمان وغیرہ
سنتے نہیں تم بات مری کوئی ہمیشہ
دکھلاؤ طبیبوں کو ذرا کان وغیرہ
گلرنگ نہ ہو جائے بدن ان کے ستم سے
اس ڈر سے چھپا دیتا ہوں گلدان وغیرہ
اک قائدِاعظم کی جھلک کافی ہے ان کو
روکیں جو کہیں راستہ دربان وغیرہ
سمجھے تھے جسے خون سے لکھی ہوئی تحریر
نکلا وہ ترا تھوکا ہوا پان وغیرہ
پہنچیں نہ کہیں میرے گریبان تلک ہاتھ
یوں پہن کے پھرتا ہوں میں بنیان وغیرہ
تھانے میں لگے ہیں مرے چاچا مرے خالو
ہو سکتا نہیں اب مرا چالان وغیرہ
تہذیبِ ولایت کی درآمد میں ہیں کوشاں
کہنے کو تو ہم سب ہیں مسلمان وغیرہ
سڑکوں پہ نہ کھیلیں تو کہاں کھیلیں یہ بچے
جب گھر میں نہیں آپ کے دالان وغیرہ
مہنگائی کے اس دور میں سوچا ہے یہ مظہر
بس کھائیں ہوا، چھوڑ دیں سب نان وغیرہ

## تنویر پھولؔ

اب ادب کی محفلوں میں دل لگی ہونے لگی
کیسے کیسے شاعروں کی کرکری ہونے لگی

فارغ البال ایک شاعر آئے جب پنڈال میں
اُن کی چندیا کی چمک سے چاندنی ہونے لگی

اُس سراپا ناز کی چٹیا لگی ناگن ہمیں
پھر طبیعت اپنی جانے کیوں ہری ہونے لگی !

میرے پہلو میں جو دیکھا اُس بُتِ طنّاز کو
اُس رقیب رُو سیہ کو بیکلی ہونے لگی

بج رہی ہے ڈگڈگی ، پبلک ہے اس پر ناچتی
جب مداری آگئے تو لیڈری ہونے لگی

جانے کتنے رہبروں نے مل کے لُوٹا ہے ہمیں
رہبری کے نام سے شرمندگی ہونے لگی

تُو نشے میں بک رہا ہے، اس میں تیرا کیا کمال!
زور پر بنت العنب کے شاعری ہونے لگی

تیل سر میں ڈال کرمالش کرائی رات بھر
شیخ جی کی کھوپڑی یوں پلپلی ہونے لگی

پھولؔ صاحب ! مسکراہٹ آپ لائے ہیں یہاں
آپ کے اشعار سُن کر گدگدی ہونے لگی

## تنویر پھولؔ

دیکھ کر یار مجھ کو ، ہوا ہو گیا
پکڑو پکڑو ، اسے آج کیا ہو گیا؟

بالیقیں کان اُس کے ہیں تم نے بھرے
وہ وفا چھوڑ کر ، پُر جفا ہو گیا

کل تھا مسرور ، اب منہ ہے پھولا ہُوا
جانے اِک دن میں کیا ماجرا ہو گیا

خون بہتا ہے ، پانی کی قلت ہے یاں
شہر اپنا بھی کیا کربلا ہو گیا؟

اُس نے سمجھا، وہ جیون کا مالک ہُوا
ناخدا گویا سب کا خدا ہو گیا

جونہی لیڈر سے تختِ حکومت چھنا
غم میں کرسی کے وہ مبتلا ہو گیا

بارشِ فضلِ ربی کا فیضان ہے
کھیت سوکھا پڑا تھا ،ہرا ہو گیا

کار و بار اُس کا ہم نے یہ دیکھا یہاں
عمرہ کرنے کو آیا ، گدا ہو گیا

راز ہائے عنادل عیاں ہو گئے
پھولؔ گلشن میں نغمہ سرا ہو گیا

## عبدالحکیم ناصؔف

''انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا''
''دیکھا نِکل کے گھر سے تو ''بکرا، بُوا'' کا تھا''

میک اَپ مشاعرے میں غضب شاعرہ کا تھا
اُف! اُس چڑیل کا بھی ترنّم بلا کا تھا

دیکھا جو بزم میں تو سبھی مجھ پہ ہنس پڑے
کُرتا جو زیبِ تن تھا، مری اہلیہ کا تھا

سامانِ نقل جیب میں بھرپُور تھا مگر
پیپر ، فِزکس کا نہیں تھا کیمیا کا تھا

جس علم سے ہے کوششِ تسخیرِ کائنات
پہلے یہ علم ملّتِ اسلامیہ کا تھا

بُندہ جرا کے کان میں ہے شازیہ کا آج
کل شازیہ کے گال پہ پوڈر جرا کا تھا

حیرت ہُوئی جو سیٹھ جی کل اِغوا ہوگئے
اِغوا کا ، کام اصل میں اِغوا شُدہ کا تھا

فیشن کے شو میں فرسٹ پرائز ملا اُنھیں
میری چچی کے پیر میں جُوتا چچا کا تھا

اپنا ''شریفوا'' نہ ڈرا ''نیب'' سے کبھو
اُس کو تو خوف بس کسی ''راحیلوا'' کا تھا

والد کی والدہ سے رہی جنگ عمر بھر
سارا قصور والدہ کی والدہ کا تھا

ناصؔف کو آئی ماں کی دُعا سے یہ شاعری
شاید اثر دُعا کا نہیں بد دُعا کا تھا

## عبدالحکیم ناصؔف

جو میٹھے لوگ ہیں مستانے تھوڑی ہوتے ہیں
مہاسے ، کیل شکر دانے تھوڑی ہوتے ہیں

بہن کے گھر میں یُوں ویرانے تھوڑی ہوتے ہیں
چلے گئے ہیں جو دیر، آنے تھوڑی ہوتے ہیں

یہ چار دِن کی بھی قیمت ہے چار آنے صرف
ہماری جیب میں چار آنے تھوڑی ہوتے ہیں

مشاعروں کو میں سنجیدگی سے لیتا ہُوں
مشاعرے یونہی بھگتانے تھوڑی ہوتے ہیں

خود اپنے ہاتھ سے ہم مار دیتے ہیں دُشمن
کسی کو بھیج کے کھڑکانے تھوڑی ہوتے ہیں

یہ کام آتے ہیں سرکھولنے کے اب اُستاد
''منٹوں'' کے واسطے اب پانے تھوڑی ہوتے ہیں

یہی تو غسلِ جنابت کا پُر سُرور ہیں راگ
یہ ''باتھ رُومی'' کوئی گانے تھوڑی ہوتے ہیں

یہاں تو یار کی زُلفیں قیام کرتی ہیں
یہ میتوں کے لیے شانے تھوڑی ہوتے ہیں

غرارے حلق کی سوزش چُھڑاتے ہیں میڈم!
غرارے پیٹ پہ لٹکانے تھوڑی ہوتے ہیں

عوام آپ کے سُنتے ہیں وعظ و اِرشادات
حرم میں شیخ جی! فرمانے تھوڑی ہوتے ہیں

ضرورتوں کے تکلّف میں رہتا ہے تنہا
یہاں غریب کے یارانے تھوڑی ہوتے ہیں

یہاں خریدنے آ جاؤ ، گھر پہ جا کے پیو
شراب خانے یہ میخانے تھوڑی ہوتے ہیں

بنائے جاتے ہیں حوروں کے واسطے ناصؔف
یہ نانیوں کے لیے ''نانے'' تھوڑی ہوتے ہیں

## عرفان قادر

شہروں میں چار سمت نہ گرد و غبار دیکھ
یلغار کر رہے ہیں جو مچھر ہزار دیکھ

دو تین چھٹیاں تو ذرا مانگ باس سے
پھر اُس کے بعد تو اُسے چڑھتا بخار دیکھ

دُنیا کی کوئی چیز نہیں ہے فضول، دوست
عینک تعصبات کی پہلے اُتار، دیکھ!

کافی ہے نو بجے کا خبر نامہ ہی تجھے
ٹی وی پہ یہ ڈرامہ فقط ایک بار دیکھ

مجنوں کو مشورہ ہے مرا مفت کا یہی
لیلیٰ سمجھ کے بھینس کو لیل و نہار دیکھ

پھر اُس کے بعد دیکھنا شاید نصیب ہو
اپنے عزیز دوست کو دے کر اُدھار دیکھ

اربابِ اختیار کی ہی جی حضوریاں
کیا کر رہے ہیں آج کے کالم نگار دیکھ

کرتے ہیں پیش پیارا سماں، پُر فضا مقام
پانی گٹر کا، بن کے گرے آبشار، دیکھ

"لوٹے" ہیں ہم اگر، تو بُرا مت منائیے
دل پر نہیں ہمارا رہا اختیار، دیکھ!

## عرفان قادر

کیا غم ہے، اگر بے تکے دیوان بہت ہیں
لے آ، کہ مقابل میں مرے کان بہت ہیں

ایوانِ سیاست میں ہو رسوا نہ، یوں آ کے
جا کھیل گلی ڈنڈا، کہ میدان بہت ہیں

لاہور میں دھرنا ہے دیا آج گدھوں نے
کیوں ہم ہی، یہاں اور بھی حیوان بہت ہیں

لاکھوں میں پڑے گا وہ، اگر لاؤ گے سنگر
دو چار مراثی ہی خوش الحان بہت ہیں

بھولے سے کبھی ہیر کے کوچے سے نہ گزرو
کوچے میں لتھڑ جانے کے امکان بہت ہیں

ہو ناشتہ ہلکا سا ہی، اک چائے کا جگ ہو
چھ سات پراٹھے ہوں تو دس نان بہت ہیں

شنگھائی ہو، نیو یارک ہو، لندن ہو یا پیرس
سب اپنی حکومت سے پریشان بہت ہیں

کھٹمل تجھے کاٹیں تو خوشی سے سہے جا
دُکھ اور بھی دُنیا میں مری جان بہت ہیں

انڈوں کی ہے اور نا ہی ٹماٹر کی ضرورت
ہر شاعرِ بے بحر کو عرفان بہت ہیں

## ڈاکٹر عزیز فیصل

کیوں میں ان اہل قلم کے بھی لکھوں نام ابھی
جن کی جیبوں میں گھسے ہی نہیں اقلام ابھی

استری کون کرے خلعت سلطانی کو
فیس بک پر ہیں بزی شاہ کے خدام ابھی

قیس جی چرس کے بورے کو چھپا لو فوراً
آنے والے ہیں یہاں دشت کے حکام ابھی

شربت دید کی مقدار نہیں حسب طلب
ایک بیرل سے چلانا ہے مجھے کام اب؟ ی

وصل جاناں کی نہیں اس میں کوئی گنجائش
ہجر سے پُر ہے مرے بخت کا گودام ابھی

ہم کلومیٹروں گھومے تو ہوا یہ معلوم
دور ہے کوچہ محبوب کئی گام ابھی

سر پہ رکھتا ہوں میں اس حال میں بھی اتنے بال
کسٹمر اپنا مجھے کہتے ہیں حجام ابھی

شیر کے قصر صدارت پہ کروں گا قبضہ
ٹارزن سے مجھے لینا ہے یہی کام ابھی

چار مرلے کا یہ دل والا پلاٹ آپ کے نام
لکھ کے دینا ہے بشیراں کو یہ اشٹام ابھی

## ڈاکٹر عزیز فیصل

ملی دانش جنھیں دانشوروں سے
وہ چیری مانگتے ہیں کیکروں سے
رہو بیوی کے حسن ظن کی زد میں
سبق سیکھا یہی ہے دوسروں سے
کئی لیڈیز کہتی جا رہی تھیں
چھڑائیں جان کیسے" لوفروں" سے
سوئس بنکوں کے بوتھے بھر دیے ہیں
بشیراں نے ہمارے ڈالروں سے
مقرر نے یہ زیر لب کہا ہے
مخاطب ہو رہا ہوں میں خروں سے
وہ نرگس کس طرح اوجھل رہے گی
گلی کوچوں کے سب دیدہ وروں سے
مرے کندھے اتر جائیں نہ آخر
تری سبزی کے بھاری شاپروں سے
مرے کچھ خواب مس ہونے لگے ہیں
تری پلکوں کی ننھی جھالروں سے
ترا قرب خصوصی مل نہ جائے
رقیبوں کے عمومی ٹاکروں سے
چڑاتے جاؤ منہ نقاد کا بھی
یہی سیکھا ہے میں نے بندروں سے
سمندر پار تو بیٹھی ہے چاہے
میں تم کو دیکھتا ہوں میٹروں سے
ہے رانجھا خفیہ خفیہ رابطے میں
سنا ہے ہیر کی سب سسٹروں سے
پری چہروں کو دل دینے میں فیصل
میں قدرے سخت دل ہوں دیگروں سے

## نورؔ جمشید پوری

دے کے دعوت بلا کے دیکھ لیا
خوب سب کو کھلا کے دیکھ لیا

اینٹ کا اب جواب پتھر سے
خوب اس نے ڈرا کے دیکھ لیا

حسن اس کا نکھر نہیں پایا
خوب میک اپ کرا کے دیکھ لیا

گھر سے جاتا ہے کب بھلا سالا
روز اس نے بھگا کے دیکھ لیا

لوٹ کر آ نہیں رہی بیگم
لاکھ اس نے منا کے دیکھ لیا

آ کے باتوں میں غیر کی اس نے
آشیاں خود جلا کے دیکھ لیا

نورؔ تو کم نہیں ہوا کچھ بھی
اس نے شمع بجھا کے دیکھ لیا

## نورؔ جمشید پوری

حالانکہ سر کھپاتے رہے تھے کتاب میں
پھر بھی تو پاس ہو نہ سکے ہم حساب میں

مشکل تمام دس پہ ہی بس اکتفا کیا
مرچی جو تھوڑی زیادہ پڑی تھی کباب میں

ماڈرن ہوئے ہیں جب سے تو کہتے ہیں اب میاں
رنگ لیں گے ہم بھی بالوں کو اپنے خضاب میں

مانگے ہے روز آ کے پڑوسن مری ادھار
اللہ میری جان پھنسی کس عذاب میں

ڈھلنے لگی ہے عمر ادائیں تو دیکھیے
خود کو سمجھ رہے ہیں ابھی تک شباب میں

ملکہ ہے نورؔ حسن کی سر پہ سجا ہے تاج
چھچھڑے ہی روز آتے ہیں بلی کے خواب میں

## نوید صدیقی

شعر جس نے بھی کہہ دیا یونہی
ہو گئی اس کی واہ وا یونہی

کچھ "محاسن" ہیں آپ میں اس کے
لوگ کہتے نہیں "گدھا" یونہی

لا کے دکھلائے کوئی حدمت گار
شوہر نام دار سا یونہی

ہم تو چنتے ہیں میٹ کر انکھیاں
راہ زن یونہی ، راہ نما یونہی

آج "ریحام" چھوڑ کر چل دی
کل گئی تھی "جمائما" یونہی

کان میں روئی دے کے بیٹھا ہوں
سُن لیا کل مشاعرہ یونہی

"بارکنگ نیوز" کیسے بنتا ہے؟
ایک معمولی واقعہ یونہی

اُف! یہ طرحی ملاکھڑے توبہ!
پچھلی ایف بی پہ اک وبا یونہی

ہارٹ ہی فیل ہو گیا اس کا
منہ سے نکلا مرے جو "ٹھاہ" یونہی

اس کے شعروں میں جیسے سکتہ ہے
ذہن میں بھی ہے اک خلا یونہی

صرف "دولاکھ" قرض مانگا تھا
"وہ ہوا بے سبب خفا یونہی"

## نوید صدیقی

بیویوں کی نگہِ خام سے جل جاتے ہیں
کتنے شوہر ہیں جو آرام سے جل جاتے ہیں

درد جو موسمِ سرما میں دیے تھے اس نے
جب رگڑتے ہیں انھیں "بام" سے ، جل جاتے ہیں

گرم کپڑوں کی حرارت سے پگھلتے نہیں ہم
ٹیگ پر لکھے ہوئے دام سے جل جاتے ہیں

میں نہ "آتش" ہوں، نہ "شعلہ" ہوں، نہ "بجلی" پھر بھی
"جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں"

پہلوئے حور میں لنگور کی دیتے ہیں مثال
دوست مجھ سے مرے گلفام سے جل جاتے ہیں

یوں ہوا شکوہ کناں ایک ذخیرہ اندوز
کیوں یہ مفلس بھرے گودام سے جل جاتے ہیں؟

## اعظم نصر

عشق بیچارہ سوالی، العجب
حُسن کی روشن خیالی، العجب

ایک موبائل ہے سمیں سات سات
رسم کیا یاروں نے ڈالی، العجب

ایک راضی اور خفا سارا جہاں
رِیت یہ کس نے نکالی، العجب

چائے سے مطلب نہیں اور ضد یہی
چاہیئے بس یہ پیالی، العجب

گو پرانی سوچ ہے پر ہے نصر
عشق میں بندہ مثالی، العجب

## اعظم نصر

یہ جو وعدہ خلافی ہے
محبت کے منافی ہے

ستم پہلے ہی کافی ہے
نہیں، بلکہ اضافی ہے

وفا کی بات رہنے دو
یہ موضوع اختلافی ہے

مگر جو تم سمجھتے ہو
فقط الفت خلافی ہے

نہیں بس میں محبت تو
تمھیں اِتنا ہی کافی ہے

چلے آؤ سیاست میں
یہاں پر سب معافی ہے

کرو یا نہ کرو کچھ بھی
فقط وعدہ ہی کافی ہے

نصر چھوڑو سیاست کو
یہ موضوع ہی لقافی ہے

## شاہین فصیح ربانی

وہم تھا، بات کی ضرورت ہے
بھوت کو لات کی ضرورت ہے

انقلاب ایک ہی نہیں کافی
انقلابات کی ضرورت ہے

زندگی یوں سپاٹ سی کیوں ہو
حادثہ جات کی ضرورت ہے

اجنبی وادیوں میں پھرتے ہیں
کن خیالات کی ضرورت ہے

رات بھر شعر کہتے جائیں گے
قافیہ جات کی ضرورت ہے

زرہ بکتر ہمیں بنانی ہے
آہنی دھات کی ضرورت ہے

## شاہین فصیح ربانی

مار سکتے نہیں ہیں بلی آپ
فتح کرنے چلے ہیں دلی آپ

آپ کا رہن سہن، اف توبہ
جذبہ رکھتے ہیں کتنا ملی آپ

ہم کہیں کیا کہ اپنی باتوں سے
خود ہی لگتے ہیں شیخ چلی آپ

ہے یہ کرکٹ پہ تبصرے سے عیاں
کھیلتے ہوں گے ڈنڈا گلی آپ

## نوید ظفر کیانی

شاعر بنے تو ساتھ ہی نقاد ہم ہوئے
یوں آپ اپنے ہاتھ سے ایجاد ہم ہوئے

بیکار تھے سو عشق بھی کرنا تھا لازمی
شیریں تھا اُس کا نام سو فرہاد ہم ہوئے

کچھ اور بن نہ پائے کہ میرٹ کی بات تھی
سرکاری درسگاہ میں استاد ہم ہوئے

تم ہم کو پی ٹی آئی کا ورکر نہ جان لو
"یہ سوچ کر نہ مائلِ فریاد ہم ہوئے"

دوچار جامعات سے سودا بنا لیا
دولت ملی تو صاحبِ اسناد ہم ہوئے

لوہے کے کاروبار کو آگے بڑھا لیا
کہتے ہیں پولیٹکس میں فولاد ہم ہوئے

بس قد بڑھانے کے لئے نسخہ یہی ملا
بونوں کے درمیاں تو شمشاد ہم ہوئے

بیلنس کے واسطے ہی سہی فون تو کیا
صد شکر ہے کہ آپ کو کچھ یاد ہم ہوئے

شادی شدہ تھے شادی شدوں کی طرح رہے
کب رائے دینے کے لئے آزاد ہم ہوئے

## نوید ظفر کیانی

کب کسی کو رہنما درکار ہے
ووٹروں کو بس گدھا سرکار ہے
صرف موبائل کا بیلنس چاہیئے
یا سہاگن کو پیا درکار ہے
اب یہی مخلوق پائی جاتی ہے
مجنوں لیلیٰ نما درکار ہے
مئے نہیں تو آبِ سادہ ہی سہی
ایک ساغر ساقیا درکار ہے
کہہ اُٹھے ذکرِ تجرد پر میاں
زندگی میں یہ خلا درکار ہے
ہم میاں کم شاعروں پر زیست کا
تنگ ہے کچھ قافیہ، درکار ہے
عاشقِ صادق کی حاجت تو نہیں
آپ کو چکنا گھڑا درکار ہے
ہر کوئی ہیرو ہے اپنی رائے میں
ہر کسی کو آئینہ درکار ہے
شاعروں کو شعر سننے کے لئے
شوہروں سا بے نوا سرکار ہے
لیلیٰ مجنوں دوبدو ملتے نہیں
فیس بک کا رابطہ درکار ہے
شاعری مرہونِ پرفارمس ہوئی
شعر پڑھنے کو گلا درکار ہے

## روبینہ شاہین بینا

کہنے کو تو آفس میں وہ ذیشان بہت ہیں
گھر آ کے جو بیگم سے پریشان بہت ہیں
پانی ہے نہ بجلی ہے یہاں گیس نہیں ہے
ہاں پھر بھی وزیروں کے قلم دان بہت ہیں
بیوی کو بھی رستے سے ہٹانے کے ہیں ماہر
سب اہلِ سیاست کو بڑے خان بہت ہیں
تھے سالِ گذشتہ تو وہ سر کی تڑی میں
پر اب کے نئے عقد کے امکان بہت ہیں
ہلکی سی غذا چاہیے بیماری میں مجھ کو
بس ایک چکن روسٹ پلس نان بہت ہیں
بیگم کو تو اک سوٹ دلانا بھی غضب ہے
ہاں اور کوئی ہو تو یہاں تھان بہت ہیں
پلڑا ہے کہ جھک جاتا ہے زرداروں کی جانب
انصاف کے ہاتھوں میں گو میزان بہت ہیں
دیکھیں تو یہ انسان نما اور ہی شے ہے
"کہنے کو مرے دیس میں انسان بہت ہیں"
ٹیڑھا ہے سیاست کا یوں آنگن تو ازل سے
تم کھیلنا چاہو گے تو میدان بہت ہیں
پاپا کو سناتے ہیں صبح و شام سٹوری
بچے بھی مرے عہد کے شیطان بہت ہیں
بیناؔ کی غزل پر بھی ذرا داد کی شورش
ویسے تو زمانے میں سخن دان بہت ہیں

## روبینہ شاہین بینا

وہ کہ جن کو نری بلا کہیے
وہ بلائیں تو کیا تماشہ ہو
اُن کا منہ یوں بھی ہے غبارے سا
منہ پھلائیں تو کیا تماشہ ہو
بھول جانا تھا یاد سے کس کو
بھول جائیں تو کیا تماشہ ہو
یوں تو وعدہ کیا تھا آنے کا
وہ نہ آئیں تو کیا تماشہ ہو
کوے کرتے پھریں بنیرے پر
کائیں کائیں تو کیا تماشہ ہو
دندنانے لگے ہیں گلو میاں
گل کھلائیں تو کیا تماشہ ہو
گیس بجلی کی چوٹ کھائے لوگ
بلبلائیں تو کیا تماشہ ہو
سُر ملاتا ہے ٹام جیری سے
مل کے گائیں تو کیا تماشہ ہو
نیک شوہر ہیں ایک صاحب جی
بیگمائیں تو کیا تماشہ ہو
وہ کرپشن کا پوچھ بیٹھیں تو
سر کھجائیں تو کیا تماشہ ہو
مونگ پھلیوں سے دانت ہیں منہ میں
مسکرائیں تو کیا تماشہ ہو
میٹرو گھر کے پاس ہے بیناؔ
ہم نہ جائیں تو کیا تماشہ ہو

## سید فہیم الدین

کبھی اقرار منٹوں میں کبھی انکار منٹوں میں
وہ ہم سے کر رہے ہیں پیار کا اظہار منٹوں میں

بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی سے جھگڑا ہوا تو پھر
بنی ہے صحن میں اِک آہنی دیوار منٹوں میں

جو چھ گھنٹوں تلک بیگم نے راگِ بھیرویں گایا
ہماری تو جواباً ہو گئی ملہار منٹوں میں

اگرچہ چار گھنٹے ہو گئے، بیگم یہ کہتی ہیں
مجھے کیا دیر لگتی ہے، ہوئی تیار منٹوں میں

ضمیری بے ضمیری کیا؟ اُسے ڈالر تو دکھلاؤ!
بدل دے گی فہیم اس کو یہی جھنکار منٹوں میں

## سید فہیم الدین

مزاج اُس کا ذرا سا مضمحل ہونے ہی والا ہے
وہ لیڈر بن کے تھانے منتقل ہونے ہی والا ہے

یہ بہتر ہے کہ خنجر سے لگا دو آ کے پھر مرہم
پرانا زخم تو اب مندمل ہونے ہی والا ہے

وہ مل اونر تری ڈولی اُٹھا کر لے ہی جائے گا
محبت کا یہ غم اب مستقل ہونے ہی والا ہے

تجاوز کر گیا ہے اِس قدر اوقات سے اپنی
کہ کھوکھا بھی سڑک سے متصل ہونے ہی والا ہے

فہیم انکم تو اچھی ہے مگر اس گوشوارے میں
منافع جو کمایا ہے وہ نِل ہونے ہی والا ہے

## اقبالؔ شانہ

چلو گی گر مری جانِ جگر آہستہ آہستہ
سفر میں ہی رہو گی عمر بھر آہستہ آہستہ

حقیقت یہ ہے ڈیڈی آپ کے ہیں آپ سے بہتر
لگاتے ہیں وہ چانٹے گال پر آہستہ آہستہ

مسلسل گھورتے رہنے کا ٹی وی یہ نتیجہ ہے
ہماری ہو گئی دھندلی نظر آہستہ آہستہ

اگر اِک دوبیں اچھی سی لے کر غور سے دیکھیں
نظر آ جائے گی اُن کی کمر آہستہ آہستہ

اگر میں آپ سے ملتا رہا سنسان راتوں میں
نکل جائے گا شیطانوں کا ڈر آہستہ آہستہ

بخارِ عشق دونوں کو ہے لیکن فرق اِتنا ہے
اِدھر تیزی سے چڑھتا ہے، اُدھر آہستہ آہستہ

لگاتے رہنا کش سگریٹ کے شانہؔ بھول نہ جانا
تمہیں بیمار پڑنا ہے اگر آہستہ آہستہ

## اقبالؔ شانہ

محبت میں حد سے گزرنے لگے ہیں
لگاتار ہم اُن پہ مرنے لگے ہیں

چمن میں بہانہ ٹہلنے کا ہے جو
ہری گھاس دیکھی تو چرنے لگے ہیں

سفر میں نیا موڑ جب آ گیا ہے
وہ چلنے لگے ہم ٹھہرنے لگے ہیں

ہمیں بھی ضرورت ہے پانی کی لیکن
ہم اُن کا گھڑا پہلے بھرنے لگے ہیں

محبت کے ہجے ہمیں آ گئے ہیں
وہ جب سے ہمیں پیار کرنے لگے ہیں

سُنا ہے کہ وہ گھر آ رہے ہیں ہمارے
تو شانہؔ بھی سجنے سنورنے لگے ہیں

## محمد ظہیر قندیل

پہلے تو وہاں آگ لگا اُن کی گلی میں
پھر جا کے لگی آگ بجھا اُن کی گلی میں

پتھر جو مرے سر پہ لگا اُن کی گلی میں
مجنوں ہی سمجھ مجھ کو لیا اُن کی گلی میں

لیڈر ہیں اُنہیں سخت الرجی ہے دھوئیں سے
رڑ وٹ جا، یہ ٹائر نہ جلا اُن کی گلی میں

اب بیچ وٹامن کہ بجن تیرا ہے کمزور
سبزی کا تو ٹھیلا ہی لگا اُن کی گلی میں

عاشق ہیں اُسی ایک حسینہ کے، لڑیں کیوں
اب تو جا، مرا وقت ہوا اُن کی گلی میں

کل شیخ کے بیٹے کی تھی بارات وہاں پر
پر دیگ میں اک مرغا پکا اُن کی گلی میں

ہوئی جو پٹائی نہ کسی نے بھی چھڑوایا
ہنستے ہی رہے سب بے حیا اُن کی گلی میں

مردے جو گھڑے تھے وہ اکھیڑے ہیں یہاں پر
فرعون کو اُٹھنا ہی پڑا اُن کی گلی میں

رخصت ہوئی وہ کب سے ملو ہاتھ ہی اب تم
قندیل بُرا تم سے ہوا اُن کی گلی میں

## محمد ظہیر قندیل

باس جن کے قریب ہوتے ہیں
آدمی خوش نصیب ہوتے ہیں

بکریاں جب اُداس ہوتی ہیں
عید کے دن قریب ہوتے ہیں

سنتے ہیں والدین کی اب تک
ایسے بیٹے عجیب ہوتے ہیں

جن کا اپنا ڈرگ سٹور نہیں
ایسے بھی کچھ طبیب ہوتے ہیں

سن کے میری نئی غزل، بولی
سب ہی شاعر عجیب ہوتے ہیں

شعر گانے کی ہے بڑی قیمت
گو غزل گو غریب ہوتے ہیں

## عاجزؔ سجاد

جس کی صورت لگے جواری ہے
وہ اناڑی نہیں مداری ہے

رب نے صورت عجب اُتاری ہے
ہوں پریشاں کہ وہ ہماری ہے

نہ تو کمزور ہوں اُسے کہنا
اور نہ ہی مجھے بیماری ہے

ایک اور ایک ہیں مرے بچے
خیر سے بارھویں کی باری ہے

پھرتیاں دیکھ کر مری اُس نے
آج دل سے نظر اُتاری ہے

ڈیٹ پر ٹلپیے نے پکڑا جب
انگ انگ سے گئی خماری ہے

اپنے دادا کے ہو بہو جیسا
میرا بچہ بڑا فراری ہے

ایک بکری تھی مر گئی لیکن
ایک گائے ابھی ادھاری ہے

کھوتے کھانے لگے ہو تم صاحب
پہلے وقتوں کی یہ سواری ہے

میں ہوں شادی شدہ مگر سن لو
میری چاہت ابھی کنواری ہے

اُس جگہ دل لگا لیا عاجزؔ
جو ہماری ہے نہ تمہاری ہے

## ہاشم علی خان ہمدمؔ

نہ روٹی یاد رہتی ہے نہ کھانے یاد رہتے ہیں
سبھی اہلِ سیاست کو خزانے یاد رہتے ہیں

اسے دھڑکا لگا رہتا ہے بیوی کی عدالت کا
کہ جیسے چوہدری صاحب کو تھانے یاد رہتے ہیں

لگی ہے فکر روٹی کی عجب فنکار لوگوں کو
ترنم یاد رہتا ہے نہ گانے یاد رہتے ہیں

سنا ہے اس کو مشکل میں بھی نانی یاد آتی ہے
نہ دادے یاد رہتے ہیں نہ نانے یاد رہتے ہیں

تجلی پونیاں باندھے ، سنہری بالیاں پہنے
جو دیکھیں "برگری بچے" زنانے یاد رہتے ہیں

مہینوں میں ہوئی باتیں جواب سیکنڈ میں ہوتی ہیں
کہاں ان فیس بکیوں کو زمانے یاد رہتے ہیں

کہانی میڈیا پر ہے وہ جن کے ہر سکینڈل کی
انہیں کے دم سے منٹو کے فسانے یاد رہتے ہیں

پلاٹوں اور پلازوں میں پھنسی رہتی ہے جاں ان کی
کہاں غربت کے سب کو دن پرانے یاد رہتے ہیں

انہیں کب یاد رہتی ہے عوامی زندگی ہمدمؔ
انہیں تو پائے پھجے کے ہی کھانے یاد رہتے ہیں

## محمد شہزاد قیس

چائے میں بسکٹ گرا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
فوری چمچ نہ ملا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
خون پتلا تو گوالا مفت میں کرتا میاں
ڈاکٹر کا بل پڑھا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
عمر بھر اِس ڈاکٹر نے گورکن راضی کیے
ہاتھ میں آئی شِفا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
ہنستے ہنستے چال ہنس کی رات بھر کوا چلا
صبح جب پھر سے اُڑا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
سُرخ طوطی تعزیت کرنے گئی کوے کے گھر
کپڑوں کا طعنہ ملا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
ناپ ، پیدل لے رہا تھا موٹو کا دَرزی غریب
ناپ اَبھی آدھا ہُوا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
رُوحِ غالب ایک اَدبی بزم میں موجود تھی
شاعرہ نے کچھ پڑھا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
دوستوں کے طعنوں سے تنگ آ کے جب کنجوس نے
دِل کیا تھوڑا بڑا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
رات بھر دُولہا میاں گاتا رہا دُلہن کے گیت
صبح دَم جب منہ دُھلا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
نسخے میں تھا گیم کھیلو ، سَت سمجھا وِڈیو گیم
پہلا لیول حل کیا تو دِل کا دورہ پڑ گیا
راز یہ واعظ کے قتل کے بعد کھولا قیس نے
جونہی "جی اَچھا" کہا تو دِل کا دورہ پڑ گیا

## عثمانی بلوچ

وہ بن سنور کے نہ نکلے تو ایسا لگتا ہے
نکل کے آئی ہو ردی، کباڑ خانے سے

نکاحِ اربع نے مجھ کو شعور بخشا ہے
کہ بن بیاہے ہی، لگتے ہیں اب سیانے سے

یہ دیکھو ، ہوش میں آنے لگے سبھی پنوں
کہ فیس بک نے بچایا، جو تھے دوانے سے

خدا کے واسطے اپنا ریاض بند کرو
اُٹھیں گے قبر کے مردے تمہارے گانے سے

ہوئی جو پیار سے مجنوں جہاں میں تبدیلی
تو صرف آئے گی صحرا میں نل لگانے سے

وہ سارے اندھوں میں، کانا سر بھی تھا میرا
ہمارے یوں تھے وہ، راجا میاں بھی کانے سے

## مزمل حسین چیمہ

ہٹا کے پردے سبھی کہتے ہیں کہ پردہ ہے
محبتوں کا تو سمجھو ہوس ہی صیغہ ہے

میں جس جگہ بھی گیا ہوں تجھ ہی کو پایا ہے
کسی سے عشق ہوا ہے یا تو آوارہ ہے

تو جن کا طرزِ تکلم سمجھ نہیں پایا
یہ میرا لہجہ اُنہی لہجوں میں سے لہجہ ہے

کوئی سخن جو چراتا ہے تو چرا ثابت
محققین کا سرقہ کہاں کا سرقہ ہے

تمہارے شربتِ دیدار کو چلا تو ہوں
تمہاری اماں کے آجانے کا بھی خطرہ ہے

محبتوں کا بنایا مکان قسطوں میں
بہت سے خوباں کا شامل اِسی میں رقبہ ہے

پٹا کے رکھی ہیں پہلے بھی لڑکیاں خاصی
اب عورتوں کا ارادہ غزل میں پختہ ہے

## منیر انور

میں شاگرد تھا بھولا بھالا وہ چالاک استانی تھی
جس سے میرا دل اٹکا تھا دو بچوں کی نانی تھی

اک تصویر دکھائی مجھ کو منگنی جب ٹھہرائی گئی
عقد کے بعد کھلا یہ عقدہ سالہا سال پرانی تھی

تم سے کہا تھا شادی وادی کر کے تم پچھتاؤ گے
اب کیوں نیر بہاتے ہو جب میری بات نہ مانی تھی

وینا شینا ، نرگس ورگس ، میرا شیرا کچھ بھی نہیں
یارو اصل میں ساری انکل سام کی کارستانی تھی

میں نے سر کو منڈایا مجھ پر برسے اولے ڈھیروں ڈھیر
ورنہ سارے مجھ جیسے تھے سب کی ایک کہانی تھی

ہم نے خود ہی دعوت دی تھی خود پر فقرے کسنے کی
ورنہ کس میں ہمت تھی یہ کس نے ٹانگ اڑانی تھی

## خاوری

فیس بک پر اُس سے یاری ہوگئی
یعنی وہ لڑکی ہماری ہوگئی
اُس کی خاطر یہ بھی نوبت آگئی
دوستوں میں مارا ماری ہوگئی
جس کسی کو فیس بک کی لت پڑی
اُس کو سیلفی کی بیماری ہوگئی
جب حمیداں فیس بک پر آگئی
فلم کی مینا کماری ہوگئی
یہ کرشمہ فیس بک پہ ہو گیا
بچوں والی بھی کنواری ہوگئی
ٹویٹ کرتی ہے بلا سوچ و سمجھ
دخترِ شیریں مزاری ہوگئی
بیوی جس کو بھاری بھرکم مل گئی
زندگانی اُس کی بھاری ہوگئی
اُس نے اپنی گاڑی کا بتلا دیا
جو کٹارا تھی فراری ہوگئی
یہ کمالِ فوٹو ایڈیٹنگ ہے
بھدی صورت والی پیاری ہوگئی
جنس بھی تبدیل ہوتی ہے یہاں
فیس بک پر مرد ناری ہوگئی

## اسلام الدین

جب تلک جسم میرا چھو نہ گیا
بھنبھناتا رہا عدو نہ گیا

ہم بھی رکھتے ہیں اپنا میرؔ استاد
"جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا"

"سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں"
نہ گیا گھر سے اس کا پپّو نہ گیا

بلب پروانے نے ہے جب سے تکا
مڑ کے شمع کے روبرو نہ گیا

جب بھی تنخواہ میں کچھ ہوئی تاخیر
مُلا مسجد میں با وضو نہ گیا

ایڑیاں رگڑیں دھرنے والوں نے
آری آگئی رے تو نہ گیا

## شوکت جمال

"پیارا ہے مجھے دل، یہ مری جان غلط ہے"
لیکن یہ کروں مفت میں قربان غلط ہے

مانا کہ شبِ وصل بڑی دیر وہ ٹھہرے
پورے مرے دل کے ہوئے ارمان غلط ہے

عاشق ہوں ترا اِس لیے چوکھٹ پہ پڑا ہوں
شوہر ہوں ترا یا ترا دربان، غلط ہے

ہے رنگ مرا زرد کسی اور سبب سے
دشمن کا یہ کہنا کہ ہے یرقان، غلط ہے

بلّی نے مرا راستہ کاٹا ہے تو پھر کیا
ان باتوں سے ڈرتا ہے مسلمان، غلط ہے

روزہ ابھی اِک اور ہے، ٹی وی نے بتایا
آیا ہے پشاور سے جو اعلان، غلط ہے

بدلے میں وفا کے، وہ وفا تجھ سے کریں گے
بالکل ہی غلط ہے، ارے نادان غلط ہے

## شہباز چوہان

گر سب سوچیں سچی ہوتیں تو پھر رنگ نرالے ہوتے
وہ میری منکوحہ ہوتی اُس کے بھائی سالے ہوتے

سرگی جلدی اُٹھنے سے گر طاقت عقل اور پیسہ بڑھتا
دولت مند گوالے ہوتے یا اخباروں والے ہوتے

بچپن سے سُنتے آئے ہیں جھوٹ سے منہ پک جاتا ہے
گر یہ بات حقیقت ہوتی اُس کے منہ میں چھالے ہوتے

اگر سیاستدانوں پر بھی ہوتا اثر مہنگائی کا
اُن کی آنکھ میں آنسو ہوتے اُن کے لب پہ نالے ہوتے

# نسیمِ سحر

محبت میں نہ کچھ ایسی پریشانی نکل آئے !
کہ جس پر جان دیتا ہوں، وُہ مُلّانی نکل آئے

بیاضِ عشق کے اوراق مَیں جب بھی پلٹتا ہوں
کبھی زیبا، کبھی ریما، کبھی رانی نکل آئے

بیوٹی پارلر والوں سے دولھن چیک کرا لینا !
کہیں ایسا نہ ہو، بھینگی ہو، یا کانی نکل آئے

کبھی وہ چیختے ہیں، بھاگتے ہیں، لیٹ جاتے ہیں
ترے عشاق تو سارے ہی ہذیانی نکل آئے

اب اِس ترکِ تعلق پر تجھے الزام کیا دیں ہم !
یہ ممکن ہے کوئی اپنی ہی نادانی نکل آئے

جونہی تنخواہ ملتی ہے، دُعائیں مانگتا ہوں مَیں
کہ اِس قِلّت کے اندر سے فراوانی نکل آئے

تری آمد کی اُس تقریب میں جونہی خبر پھیلی
کئی تُک بند بھی بہرِ غزل خوانی نکل آئے

اکیلے پھر رہے ہیں یوسفِ بے کارواں ہو کر
حکومت چھوڑ کر جس دِن سے گیلانی نکل آئے

کسی شاگرد کا کیا حال ہوتا ہو گا، مت پوچھو
دولھن کے روپ میں گر اُس کی استانی نکل آئے

دلِ خوش فہم پاگل ہے، پکی ہے دال، اور چاہے
کُھلے جب دیگچہ، اُس میں سے بریانی نکل آئے

مَیں سادہ لوح اب تک منتظر ہوں شہر میں رہ کر
کسی انساں میں شاید خُوئے انسانی نکل آئے !

اِدھر دولہن کے ہونٹوں پر بھی کچھ مونچھیں دکھائی دیں
اُدھر دولھا کے کچھ انداز نسوانی نکل آئے

ہمارے دِل میں پلتی ہیں بہت سی خواہشیں ایسی
کہ ہم تربوز کو چیریں تو خوبانی نکل آئے

درِ جاناں پہ دستک دے کے تم محتاط بھی رہنا
یہ ممکن ہے کہ جاناں کی جگہ نانی نکل آئے

وُہ انکم ٹیکس افسر ہے، سو اُس میں ایسی طاقت ہے
نچوڑے سنگ تو اُس میں سے بھی پانی نکل آئے

وہ اپنے گھر سے جب نکلا ہے باہر عیدِ قرباں پر
تو بکرے بن کے عاشق بہرِ قربانی نکل آئے

اِسی اُمید میں غزلیں سُناتا ہوں حسینوں کو
کوئی ان میں سے شاید میری دیوانی نکل آئے

مزہ آئے نسیمؔ اُس کے جو کوچے میں قدم رکھوں
تو میری جیب سے ٹوپی سلیمانی نکل آئے

ڈائٹنگ کھیل نہیں چند دنوں کا بیگم — اِک صدی چاہیے کمرے کو کمر ہونے تک (سرفراز شاہد)

## طاہر محمود

جو تو نے پتھر اٹھا کے مجھ کو کبھی بھی مارا, تو میں تمھارا
وطن کو اب کے برس بجٹ میں ہوا خسارہ, تو میں تمھارا

میں تیرے کتے کو وٹا ماروں گا, اور بھاگوں گا برق جیسا
تمھارے کتے نے مجھ کو پکڑا, اگر جو مارا, تو میں تمھارا

وہ ایک بوسہ جو تم نے مجھ کو کبھی دیا تھا, ادھار کر کے
اگر کبھی زندگی میں تو نے دیا ادھارا, تو میں تمھارا

تمھارے چکر میں کتنی راتیں گزاریں تھانے کے بیچ میں نے
اگر کبھی بھی لگایا تو نے مزید لارا, تو میں تمھارا

وفا کے چکر میں ڈیٹ پہ بھی لیا تھا تیرا بس ایک بوسہ
تم اب کے ٹائے چڑھی تو پھر جو بھی ہو گا سارا, تو میں تمھارا

## ریاضؔ احمد قادری

ملی ہے لیلیٰ کو ساری طاقت ہوا ہے بے اختیار مجنوں
مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ ، یہ کر رہا ہے پکار مجنوں
نہ ایک لیلیٰ ملی مجھے تو ہزار دشتِ عرب ہیں ڈھونڈھے
ہر اک جگہ پھرتے میں نے دیکھے تمہارے جیسے ہزار مجنوں
بس ایک لیلیٰ ہے بے مروت، بس ایک لیلیٰ ہی بے وفا ہے
وفائیں لے لے کے پھر رہے ہیں جہان میں بے شمار مجنوں
قرار مجنوں کے دل کا لیلیٰ،سکون مجنوں کی جاں کا لیلیٰ
ملی نہ اس کو اگر یہ لیلیٰ تو کیسے پائے قرار مجنوں
یہ کالی لیلیٰ بھی ڈھونڈھتی ہے بہانہ میک اپ کا انجمن میں
اسی بہانے سے ڈھونڈھتا دیکھا خود کی خاطر نکھار مجنوں
ہے آج لیلیٰ بھی پاس اس کے، وہ کال مارے کہ ٹون چھینکے
مجھے بتاؤ بھلا طبیبو ہوا ہے کیوں بے قرار مجنوں
اسے ملاؤ، اسے بلاؤ،کہاں ہے لیلیٰ،یہاں وہ آئے
کہیں نہ لیلیٰ کے ہجر میں ہی نہ زیست دے اپنی ہار مجنوں
خزاں سے نکلے چمن میں آئے،وہ گلستانوں میں اس کو ڈھونڈھے
ہے آپ صحرا میں کیوں وہ بیٹھا نہ پائے ایسے بہار مجنوں
ہے راز کیا اس کے ہاضمے کا یہ راز لیلیٰ ہی جانتی ہے
ہے کھایا اس نے یہ کیسا چورن جو مارتا ہے ڈکار مجنوں
جو خون مانگا ہے تو نے اس سے، دیا ہے پھر اپنا خون اس نے
جگر کے خوں سے تری کہانی گیا ہے ایسے نکھار جگنو
نہیں ہے محتاج لیلیٰ تیری پکی ہوئی گھر کی ہانڈیوں کا
نہیں جو بھیجی ہے تو نے مرغی تو کھا رہا ہے اچار مجنوں
ریاضؔ تھا اس کا عشق سچا جبھی تو ہے نام زندہ اس کا
یونہی تو عشق و وفا میں ایسے گیا ہے ہستی گزار مجنوں

## عتیق الرحمٰن صفی

اب ہیں نادم سائبر تقصیر پر
مر مٹے تھے آن لائن ہیر پر
وہ تو بیلنس لے کے رخصت ہو گئی
اور ہمیں ٹرخا گئی تصویر پر
تم اُسے اِک پل میں ہی چٹ کر گئے
کب سے مکھیاں پھر رہی تھیں کھیر پر
گر حسیں ہیں آپ تو پھر دیکھیے
مت بھروسہ کیجیے گا پیر پر
شاعرانہ نیند اب آجائے گی
رکھ دیا ہے سر کلامِ میر پر
وزن سے خارج حسیں اِک شاعرہ
پا رہی ہے داد ہر تحریر پر
فیس بک کے شاعروں کا کیا کہوں
لڑ پڑے ہیں کاغذی جاگیر پر
بیسیوں فورم میں دے کر اِک غزل
کس قدر نازاں ہیں وہ تشہیر پر
ہڑبڑا کر اُٹھ گیا میں خواب سے
سٹ پٹا کے رہ گیا تعبیر پر
وہ مجھے ڈیلیٹ کر کے نس گئی
"آدمی کا بس نہیں تقدیر پر"
شوخ ماڈل کی ڈریسنگ دیکھیے
کس قدر اترا رہی ہے لیر پر
عارضی ہے عارضہ بھی عشق کا
کر لیا ہے غور اب تاثیر پر
برزمینِ داغؔ لکھی ہے غزل
فیس بک کے عاشقوں کی ہیر پر
آف لائن دیکھ کر اُس کو صفیؔ
غم زدہ بابے ہیں سب تاخیر پر

## نشتر امروہوی

ایسی آفت گلے میں پڑی خواہ مخواہ
ہوگئی اپنی کٹیا کھڑی خواہ مخواہ

تھی محلے میں جو گلچھڑی خواہ مخواہ
اُس سے شادی رچانی پڑی خواہ مخواہ

میں پٹاتا رہا چھوٹی والی مگر
مجھ پہ شیدا ہوئی تھی بڑی خواہ مخواہ

ویٹ پوچھا تھا بس عمر پوچھی نہ تھی
پھر بھی اِک دم سے وہ رو پڑی خواہ مخواہ

لگ رہی ہے اپار ایک چُھوٹا ہوا
پہلے لگتی تھی جو پھلجھڑی خواہ مخواہ

جب سے بیگم نے کی ہے شروع ڈائٹنگ
ویٹ اور بڑھ گیا دو دھڑی خواہ مخواہ

بحر تھی بھائی اقبال شانہ کی یہ
اور علوی نے لے لی پڑی خواہ مخواہ

پھر تو مجھ کو بھی کچھ شعر کہنے پڑے
ایسی گھومی مری کھوپڑی خواہ مخواہ

## احمد علوی

ہوئی خستہ بیگمِ سیم تن تیری شان جل جلا لہٗ
مجھے بخش دے کوئی گلبدن تیری شان جل جلا لہٗ

تو رقیب کو مرے دال دے، اسے سوکھی روٹی پہ ٹال دے
مجھے روز کھلوا مٹن چکن تیری شان جل جلا لہٗ

میں اہل ہوں پھول کپاس کا مرا وزن کے جی پچاس کا
مری اہلیہ مگر ایک ٹن تیری شان جل جلا لہٗ

رکھا بکریوں کی قطار میں ملی کیا کمی میرے یار میں
دئے کالی بھینس کو چار تھن تیری شان جل جلا لہٗ

بنا باپ پہلی ہی رات میں مجھے نیک بیوی کے ساتھ میں
دئے مفت بچے بھی اِک ڈزن تیری شان جل جلا لہٗ

جنہیں تونے بخشی ہے علیت، کریں دوسروں کی ملازمت
دیا اَن پڑھوں کو اپار دھن تیری شان جل جلا لہٗ

میرے سامنے جو ہے اک بھون وہاں سات آٹھ ہیں جانِ من
میرے گھر چڑیل ہے خیمہ زن تیری شان جل جلا لہٗ

## ڈاکٹر جاوید پنجابی

پھولتی جا رہی ہو سر تا پا
ہائے بیگم تمھارا موٹاپا

ڈارلنگ تم کو میں کہوں کیسے
تم تو لگتی ہو اب بڑی آپا

اب تمھاری کمر ہے یا کمرہ
تم نے شائد کبھی نہیں ناپا

لگ رہی ہو ذخیرہ آٹے کا
پڑ نہ جائے پولیس کا چھاپہ

ڈٹ کے کھاتی ہو خود، مجھے لیکن
ایک چائے کی پیالی، اِک پاپا

روز تکرار ہے مرے گھر میں
دھن دھنا دھن تا سارے گا ماپا

ہمارے گھر میں مولا جانتا ہے کچھ نہیں باقی
مگر مہمان پھر بھی منہ اُٹھائے آئے جاتے ہیں
(انعام الحق جاوید)

تین ایکٹ کا کھیل

پہلا ایکٹ

نوید ظفر کیانی / بی سی لیز

# اس طرح تو ہوتا ہے

## کردار

ڈک کمفرٹ: شادی شدہ لیکن اکیلا
جارج میریکیل: ایک نامہربان دوست
الیگزینڈر میڈر: کمفرٹ کا چچا۔ بد سے بدنام بُرا
جیمز ہیرس: کمفرٹ کا نوکر
مسز میڈر: کمفرٹ کی چچی
ایڈتھ: کمفرٹ کی بیوی
سلی: مسز میڈر کی ملازمہ

## پہلا ایکٹ

منظر: اسٹیج انتہائی نفاست سے سجائے گئے کمفرٹ کے کشادہ ڈرائنگ روم کے منظر پر مشتمل ہے۔ کمفرٹ بڑے انہماک سے ایک خط کا مطالعہ کر رہا ہے۔

کمفرٹ (ایک وقفہ کے بعد) اب میں کیا کروں۔۔۔ میڈر چچا اپنے خط میں فرما رہے ہیں کہ وہ ایک دن میرے ساتھ گزارنے آ رہے ہیں۔ چار برس پہلے جب اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنا وارث بنا رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ ہر برس پچیس سو ڈالر کی خطیر رقم مجھے دینا چاہتے ہیں تو میں نے کسی تعرض کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔۔۔ بلکہ سچ پوچھیں تو میرے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے لیکن پھر اُنہوں نے یہ شرط لگا دی کہ وہ یہ رقم مجھے اس شرط پر دیں گے کہ میں کبھی شادی نہ کروں۔۔۔ یہ تو دودھ میں مینگنیں ملا دینے کے مترادف ہوا۔۔۔ خیر یہ چار سال پہلے کا تذکرہ ہے، اُس وقت تو میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔۔۔ لیکن بھلا محبت کرنے میں بھی کوئی دیر لگتی ہے (اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور وہ بھی مجھ جیسے نوجوان کے لئے۔۔۔ ایڈتھ جیسی لڑکی سے، ظاہر ہے محبت کا انجام شادی ہی ہوا کرتی ہے چنانچہ چھ ماہ قبل جب میری ایڈتھ سے شادی ہوئی اُس وقت سے لے کر اب تک ایک پل بھی چین سے نہیں گزرا ہے، ہر لمحہ یہی خوف دامن گیر رہا ہے کہ کہیں اس کی خبر میڈر چچا کو نہ ہو جائے۔ اب چچا جان یہاں آ رہے ہیں، میں نے جو شیڈول اپنی زندگی کا بنا رکھا تھا، اُنہوں نے آ کر تھل پتھل کر دینا ہے۔ اُنہیں ایڈتھ کا پتہ چل جائے گا اور پھر میرے مستقبل کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔۔۔ اب کروں تو کیا کروں؟ (دوبارہ

خط پڑھنے لگتا ہے) ۔۔۔جمعرات تک پہنچ رہا ہوں۔۔۔ جمعرات؟؟ اور آج جمعرات ہی تو ہے۔۔۔اور انشاء اللہ شام کی ٹرین سے واپس روانہ ہو جاؤں گا۔۔۔شام کی ٹرین چار بجے روانہ ہوتی ہے (سوچتا ہے) اب مجھے کرنا کیا چاہیے؟ اگر میں کسی طرح سے ایسے حالات پیدا کر دوں کہ ایڈتھ اور چچا جان کے درمیان سامنا ہی نہ ہو پائے۔۔۔اگر میں چچا جان کے سامنے کسی چھڑے چھانٹ نوجوان کا کردار ادا کروں ،صرف ایک دن کے لئے، تو بچاؤ ہو سکتا ہے۔۔۔ٹرائی تو کرنی چاہیے مجھے۔۔۔یہی بچاؤ کی واحد صورت ہے ورنہ ۔۔۔نہیں، میں اپنا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتا، مجھے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔۔۔لیکن اِس ایڈتھ کا کیا کیا جائے؟؟

(مسز کمفرٹ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے)

**مسز کمفرٹ:** کیا آج تم میرے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟

**کمفرٹ:** نہیں ایڈتھ ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں آج مصروف ہوں!

**مسز کمفرٹ:** بظاہر لگ تو نہیں رہے ہو۔

**کمفرٹ:** آج کا دن میں نے اپنے کامیڈی ڈرامے کی نوک پلک سنوارنے کے لئے مختص کر رکھا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ کل اس کو جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ مجھے آج بہت محنت کرنی پڑے گی، ڈرامے کے پہلے ایکٹ میں بہت سی تبدیلیاں کرنی ہیں۔۔۔اس لئے مجھے اس وقت کچھ آرام کی ضرورت ہے۔

**مسز کمفرٹ:** افوہ۔۔۔پھر تم اُسی ڈرامے کو لے کر بیٹھ رہو گے ۔۔۔میں پوچھتی ہوں کہ اگر بالفرض پہلا انعام تمہیں مل بھی گیا تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟؟

**کمفرٹ:** فائدہ ۔۔۔ ارے میں راتوں رات مشہور ہو جاؤں گا۔

**مسز کمفرٹ:** اور اگر تم مشہور ہو بھی گئے تو پھر کیا ہوگا؟؟ کیا اس سے تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اپنی بیوی کو زیادہ وقت دے سکو۔۔۔اُس کی خوشیوں کا پہلے سے

## سیاستدان

جو نہ تھے وہ بنا دیا ہے اُنہیں
دے کے چابی چلا دیا ہے اِنہیں
یونہی چوڑے نہیں سیاستداں
میڈیا نے پھلا دیا ہے اِنہیں

نوید ظفر کیانی

باس کے آگے جھکا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں
اس لیے پھولا پھلا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں
(نیاز سواتی)

زیادہ خیال رکھ سکو؟؟

**کمفرٹ:** نہیں، ہرگز نہیں کیونکہ تم تو جانتی ہی ہو کہ تمہیں خوش دیکھنا میری سب سے بڑی خواہش ہے ۔۔۔میرے لئے تمھارے ساتھ ڈرائیو پر جانا سارا دن کام کرنے سے زیادہ پُرکشش ہے لیکن کیا جائے، کام کام ہے۔

**مسز کمفرٹ:** لیکن تمہارے لئے تو تمہارا ڈرامہ ہی سب کچھ ہے!

**کمفرٹ:** ایسا بھی نہیں ہے۔۔۔لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میں کسی عیاشی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں، یہ کام ہے اور خاصی مشقت والا کام۔۔۔ہاہاہا۔۔۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کھیل نہیں ہے لیکن کھیل ہے، بس اِسی قسم کے کام کی لت نے مجھے تمہاری نظروں میں ڈل قسم کا نوجوان بنا کر رکھ دیا ہے۔۔۔لیکن تم نے بہت اچھا سوچا ہے کہ کبھی ڈرائیو پر نکلا جائے۔۔۔بہت اچھا موسم ہے، میرا تو خیال ہے کہ تم قصبے میں چلی جاؤ اور آج کا خوشگوار دن اپنی ماں کے ساتھ گزار آؤ۔۔۔باقی جیسی تمہاری مرضی!!

**مسز کمفرٹ:** نہیں! اس طرح تو میرا آج کا سارا دن قصبے میں ہی گزر جائے گا۔۔۔واپسی پر خاصی دیر ہو جائے گی!!

**کمفرٹ:** تو پھر کیا ہو گیا!

**مسز کمفرٹ:** پچھلا سارا ہفتہ بھی میں قصبے میں گزار چکی ہوں۔۔۔نہیں! بالکل بھی نہیں، تم میرے ساتھ چلو گے تو جاؤں گی!! آج اِتنی لمبی ڈرائیو پر نہیں جا سکتی!!

**کمفرٹ:** لیکن ایڈتھ! میں تو چاہتا تھا کہ تم قصبے میں جاؤ تو میرا بھی ایک کام کر آؤ!! مجھے کچھ خالی پیپروں کی ضرورت تھی۔۔۔بلکہ خاصی زیادہ ضرورت ہے ان کی۔۔۔اگر اور خالی پیپرز نہ ہوئے تو میرا خیال ہے کہ میں آج اپنا ڈرامہ ہی مکمل نہ کر پاؤں گا۔

**مسز کمفرٹ:** لیکن تمہارے پاس تو پہلے ہی کافی پیپر پڑے ہوئے ہیں۔

(میز سے بہت سے پیپر اٹھا کر دکھاتی ہے)

**کمفرٹ:** (گڑبڑا کر) ہاں۔۔۔لل۔۔۔لیکن۔۔۔اس طرح کے پیپر نہیں۔۔۔دوسرے چاہئیں!!

**مسز کمفرٹ:** کس طرح کے پیپر چاہئیں؟

**کمفرٹ:** کسی بھی قسم کے۔۔۔بلکہ ایسا کرو کہ ہر سائز کا ایک ایک دستہ لے آؤ!

**مسز کمفرٹ:** لیکن ڈِک! تم ہیرس سے بھی تو منگوا سکتے ہو۔۔۔میں ہی کیوں؟؟

**کمفرٹ:** نہیں۔۔۔تمہیں ہو جو اس قسم کا کام کر سکتی ہو۔۔۔ہیرس کو کیا پتہ۔۔۔میری خواہش کہ تم آج ضرور قصبے میں جاؤ۔۔۔مم۔۔۔میرا مطلب ہے کہ۔۔۔وہ (کنفیوز ہو جاتا ہے) ایڈتھ! اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میری خاطر۔۔۔میری خاطر تمھیں ضرور جانا ہوگا!!

**مسز کمفرٹ:** ٹھیک ہے، اگر تم یہی چاہتے ہو تو ضرور جاؤں گی۔۔۔لیکن میں ٹرین پر جانا زیادہ مناسب سمجھتی ہوں، آج اس قدر لمبی ڈرائیو کا موڈ نہیں بن رہا ہے۔۔۔کتنے پیپرز چاہئیں؟

**کمفرٹ:** جتنے ہو سکے۔۔۔مجھے بہت سے پیپرز کی ضرورت پڑے گی!! جتنے لا سکتی ہو، لے آؤ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) جتنے زیادہ پیپرز خریدے گی، اُتنی ہی دیر لگے گی۔۔۔

**مسز کمفرٹ:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) بیچارہ۔۔۔کتنا کنفیوز ہو رہا ہے، کام کی زیادتی نے اس کے اعصاب کو مضمحل کر کے رکھ دیا ہے!

بج رہی تھی جس جگہ کل تک کتابوں کی دکان
اس جگہ اب "لکڑیوں کا ٹال" دیکھا جائے گا
(سید ضمیر جعفری)

## مشہور جگہ

لوسیون کے گھر کی زیارت کے اس سفر میں ساقی فاروقی بہت یاد آئے کیونکہ لندن میں اُن کا محبوب مشغلہ باہر سے آنے والے دوستوں کو مرحوم مشاہیر کے مکانوں اور اُن سے منسوب جگہوں کی سیر کرانا ہے، ایسی ہی ایک سیر کے دوران اُس نے مجھے، عطاء الحق قاسمی اور بڑے قاسمی یعنی احمد ندیم قاسمی صاحب کو ڈی ایچ لارنس، چالس ڈکنز، رابندر ناتھ ٹیگور، جان کیٹس اور ڈاکٹر جانسن سے منسوب مختلف جگہیں دکھائیں اور ساتھ ساتھ کمنٹری بھی جاری رکھی کی ان مشہور آدمیوں کے ان جگہوں سے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ اس عمل میں تین چار گھنٹے لگ گئے، زبان پر کانٹے اُگنے اور پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے مگر ساقی اپنے وفورِ اضطراب واشتیاق میں ایسا محو تھا کہ اسے ہماری حالت کی خبر ہی نہیں تھی۔ اچانک ایک جگہ رُک کر عطا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بہت سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔ "یار ساقی، یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں "مشہور لوگ" بیٹھ کر کھانا وانا کھایا کرتے تھے؟"

ساقی جو یوں بھی اپنی سیماب صفتی کے باعث متلاطم رہتا ہے اس بات پر لوٹن کبوتر بن گیا۔

امجد اسلام امجد کے سفرنامے "ریشم ریشم" سے اقتباس

**کمفرٹ** (دستی گھڑی کو دیکھتے ہوئے) نو بج چکے ہیں۔۔۔ تم اگر ابھی چل پڑو تو ٹرین پکڑ سکتی ہو۔۔۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے بگھی کا انتظام کرتا ہوں (پکارتا ہے) ہیرس! ہیرس!!

**مسز کمفرٹ** لیکن ڈک۔۔۔ ٹرین تو ساڑھے نو بجے روانہ ہوتی ہے!!

**کمفرٹ** تم۔۔۔ تم اُس وقت تک پہنچ جاؤ گی، اب دیر مت کرو (پکارتا ہے) ہیرس!

**مسز کمفرٹ** ابھی کافی وقت ہے۔ (کمرے سے نکل جاتی ہے)

**کمفرٹ** (باآوازِ بلند پکارتا ہے) ہیرس!!

(ہیرس کمرے میں داخل ہوتا ہے)

**ہیرس** آپ نے بیل دی تھی جناب؟

**کمفرٹ** (غصیلے انداز میں) میں نے بیل نہیں بجائی تھی بلکہ آدھے گھنٹے سے حلق تک بج بج کر تمھیں بلاتا رہا ہوں!!

**ہیرس** حکم جناب؟

**کمفرٹ** بگھی والے کو بلاؤ۔۔۔ فوراً!!

**ہیرس** بہتر جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) حضورِ والا تو بڑے رنگوں میں ہیں آج۔۔۔

(ہیرس کمرے سے نکل جاتا ہے)

**کمفرٹ** اگر ایڈتھ چچا جان کے آنے سے پہلے روانہ ہو جائے تو مزا آجائے۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا (میز سے سکرپٹ کے کاغذات اٹھاتا ہے) اور یہ سکرپٹ۔۔۔ ابھی بھی پورے دو ایکٹ ایسے ہیں جن میں خاصی کاٹ چھانٹ کرنی ہے، اور وہ بھی آج رات تک۔۔۔ یہ چچا جان کو بھی آج ہی آنا تھا۔۔۔ مجھے بھلا اُن کی خاطر داری کی فراغت کہاں ملے گی، (ہنستا ہے) خود ہی اپنے آپ کو اٹینڈ کرتے پھریں۔۔۔ خیر! اب موقع ملا ہے تو فائدہ اُٹھا لینا چاہیے، بعد میں جانے کیا حالات ہوں (مطالعہ کی میز والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دیکھوں تو سہی، کیا کچھ کرنا ہے؟ ہا۔۔۔ شکر ہے کہ پہلا ایکٹ تو مکمل ہے، اب دوسرے ایکٹ کو دیکھتے ہیں (قلم اٹھاتا ہے لیکن پھر ٹھہر جاتا ہے اور کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے) بگھی کے پہیوں کی آواز؟ کہیں چچا جان تو نہیں آن ٹپکے؟؟ (اٹھتا ہے اور سٹیج کی پچھلی طرف کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے) خدا کی پناہ! یہ تو وہی ہیں!! یہ تانگا اسٹینڈ والوں کی بگھی ہی ہے۔۔۔ اب کیا کیا جائے؟؟

**مسز کمفرٹ** (کمرے کے باہر سے آواز دیتی ہے) ڈِک!

**کمفرٹ** (اسٹیج کی سیڑھیوں سے نیچے آتا ہے) کیا بات ہے ڈیئر۔۔۔جلد بازی کی ضرورت نہیں، ابھی کافی وقت ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا (کمرہ نمبر ایک کے دروازے کو مقفل کر دیتا ہے) لو جی! پنچھی قید ہوگیا!!

(سٹیج کے بیرونی دروازے سے میڈر چچا داخل ہوتے ہیں)

**میڈر چچا** لو بھئی بھتیجے، ہم آگئے!

**کمفرٹ** آہا چچا جان، آپ کو دیکھ کر واقعی بہت خوشی ہو رہی ہے، ماشااللہ اب تو آپ کی صحت بہت اچھی ہوگئی ہے۔

**میڈر چچا** بالکل، کبھی اتنی اچھی صحت نہیں رہی میری جیسی اب ہے۔۔۔اب تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیئے کہ مجھ سے نجات پا سکو گے۔۔۔کم از کم چند ایک برس تک تو بالکل بھی نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم مدتوں سے اسی انتظار میں ہو، بڑے بدمعاش ہو تم!!

**کمفرٹ** (شکایت بھرے انداز میں) یہ کیا کہہ رہے ہیں چچا جان۔۔۔اللہ نہ کرے!!

**میڈر چچا** ہا بھتیجے۔۔۔اتنے برسوں بعد تمہاری شکل نظر آئی ہے۔۔۔بہت خوشی ہو رہی ہے دیکھ کر، امید ہے کہ تم نے شادی وادی نہیں کی ہوگی۔۔۔کیوں؟

**کمفرٹ** کیا کہا۔۔۔شادی؟ نہیں چچا جان۔۔۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

**مسز کمفرٹ** (اسٹیج کے باہر سے آواز دیتی ہے) ڈِک!

(کمفرٹ زور زور سے کھانستا ہے)

**میڈر چچا** کسی نے تمہیں آواز دی ہے غالباً

**کمفرٹ** (بوکھلاتے ہوئے) نن۔۔نہیں چچا جان، یہ ہمسائیوں کا طوطا ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اب میں کیا کروں کہ ان دونوں کا سامنا نہ ہو پائے (میڈر چچا سے) چچا جان آپ بہت تھک گئے ہوں گے، اتنا لمبا سفر جو کیا ہے آپ نے (انہیں بازو سے پکڑ کر) میرا خیال ہے کہ آپ کو کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہیئے۔(ڈرائنگ روم کی طرف لے جاتا ہے) اِدھر تشریف لے چلیں!

**میڈر چچا** (ہچکچاتے ہوئے) لیکن بھتیجے، مجھے قطعاً تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

**کمفرٹ** (مکھن لگاتے ہوئے) یقیناً آپ نوجوانوں سے بھی زیادہ تندرست ہیں، لیکن پھر بھی۔۔۔

**مسز کمفرٹ** (باہر سے پکارتی ہے) ڈِک!

**کمفرٹ** (بوکھلاتے ہوئے) افوہ۔۔۔یہ طوطا بھی ناں، بڑا ہی شریر ہے یہ۔۔۔کیسا انسانوں جیسا بولتا ہے۔۔۔ہے ناں چچا جان؟

**میڈر چچا** پنجرے میں بند ہے کیا؟

**کمفرٹ** جی؟ جی ہاں!! محترمہ پنجرے میں بند ہے۔۔۔میرے کہنے کا مطلب ہے کہ طوطا پنجرے میں بند ہے۔۔۔اس طرف کو چچا جان (انہیں کمرے میں دھکیل دیتا ہے اور دروازہ بند کر کے مقفل کر دیتا ہے) لو جی یہ پنچھی بھی قید ہو گیا، اب میں ان کا کیا کروں، میرا خیال ہے کہ میں ایڈتھ سے پہلے نمٹوں اور کسی طرح اُسے نکال باہر کروں (کمرہ نمبر ایک کی طرف جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے اس کا تالا کھولتا ہے) ایڈتھ ڈارلنگ، تمھیں خاصی جلدی ہوگی (پکارتا ہے) ہیرس، ہیرس (اسٹیج پر مسز کمفرٹ نمودار ہوتی ہے، روانگی کے لئے نیا لباس پہن رکھا ہے)۔

**کمفرٹ** دیکھو کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے۔

(دائیں جانب سے ہیرس داخل ہوتا ہے)

**مسز کمفرٹ:** لیکن ڈک، ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ کافی وقت ہے ٹرین کی روانگی میں!

**کمفرٹ:** اُس وقت کچھ ٹائم تھا لیکن اب نہیں بچا (ہیرس سے) کیوں ہیرس، بگھی تیار ہے؟

**ہیرس:** بگھی دروازے پر کھڑی ہے جناب!

**کمفرٹ:** (تیزی سے) وہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں (مسز کمفرٹ سے) اچھا ڈیئر، خدا حافظ (بوسہ دیتا ہے) میرا خیال ہے کہ تمھاری واپسی شام سے پہلے ممکن نہیں ہے، ظاہر ہے بھلا تم اتنی دور جا رہی ہو، شام سے پہلے کیسے لوٹ پاؤ گی

(چچا میڈر کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

**مسز کمفرٹ:** (چونکتے ہوئے) ارے، یہ کیسی آواز تھی؟

**کمفرٹ:** (گھبرا کر) یہ۔۔۔یہ غالباً کتا ہے!

**ہیرس:** نہیں جناب، کتا تو ابھی ابھی باہر گیا ہے، میرے سامنے۔۔۔

**کمفرٹ:** ابے چپ رہ۔۔۔یونہی اُول فُول بکے جاتا ہے، فضول میں اوور اسمارٹ ہونے کی کوشش مت کرو (مسز کمفرٹ سے) اللہ حافظ ایڈتھ! (دوبارہ بوسہ دیتا ہے) آج کا دن مزے سے اپنی می کے گھر گزارنا، اللہ حافظ (دروازہ نمبر ایک سے اُسے باہر نکال دیتا ہے، ہیرس بھی اُسی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

**میڈر چچا:** (دروازے کو تھپتھپاتا ہوئے پکارتا ہے) رچرڈ!

**کمفرٹ:** یہ کتا تو بہت شور کر رہا ہے، شکر ہے ایڈتھ بروقت روانہ ہو گئی (دروازے کی چٹخنی کھولتا ہے) کیا بات چچا جان، کیا ہوا؟ (چچا میڈر اندر داخل ہوتا ہے) کہیں آپ اپنے آپ کو لاک تو نہیں کر بیٹھے تھے غلطی سے؟

**میڈر چچا:** (تیز لہجے میں) کیا کہا اپنے آپ کو لاک کر لیا تھا؟

> لاہور میں سید عابد علی عابدؔ صدارتی کرسی پر براجمان تھے۔ شعراء اپنا اپنا کلام سُنا کر باری باری رخصت ہو رہے تھے۔ یکلخت ایک خوش گلو شاعرہ منور سلطانہ لکھنوی اسٹیج پر آئیں اور بلند آہنگ ترنم سے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ہر شعر بلا کسی فرمائش کے بار بار پڑھا۔ ایک مصرع گویا اُن کے گلے میں اٹک گیا، مسلسل تکرار کرتے ہوئے صاحبِ صدر کو داد کے لئے متوجہ کرتی رہیں۔ مصرعہ تھا:
>
> شبِ وصال مرا ظرف آزما کے دیکھ
>
> جب چوتھی پانچویں بار عابد صاحب کو متوجہ کر کے یہ مصرعہ پڑھا تو عابد صاحب نے بے بسی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:
>
> یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

ہرگز نہیں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے، جب کہ لاک تو باہر کی جانب لگا ہوا ہے۔

**کمفرٹ:** (چابی کو انگلیوں پر گھماتے ہوئے) افوہ، واقعی چٹخنی تو دروازے کے باہر لگی ہوئی ہے، لگتا ہے ہیرس نے غلطی سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی تھی، نرا گدھا ہے وہ بھی۔۔۔ میں نے اُسے ہدایت کر رکھی ہے کہ دروازوں کو غیر ضروری طور پر کھلا نہ چھوڑا جائے، بس اُس نے اسی چکر میں دوروازے کو مقفل کر دیا اور آپ اندر بند ہو گئے۔

**میڈر چچا:** ٹھیک ہے تمھارے نوکر نے غلطی سے ایسا کر دیا ہے لیکن آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

**کمفرٹ:** امید ہے کہ آئندہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

**میڈر چچا:** تو کیا اِس بار ضرورتاً ایسا کیا تھا اُس نے؟

**کمفرٹ:** ارے چچا جان، ہی ہی ہی ہی۔۔۔آپ بھی کمال کرتے ہیں۔

**میڈر چچا:** (مشتبہ انداز میں) اور بھتیجے! میں نے کسی عورت کی آواز بھی سُنی تھی، کون تھی وہ؟

**کمفرٹ:** ارے چچا جان، وہ طوطا تھا۔

ملا ہے شاعری سے کیا کہ تم جہاں تھے ہو وہیں ۔۔۔ وہ بن گئے ادب پتی فلاں فلاں جگاڑ سے (احمد علوی)

میڈر چچا: لیکن طوطا اس کمرے میں نہیں ہے، وہ کوئی عورت ہی تھا، مجھے سو فیصدی یقین ہے، کوئی عورت کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی۔

کمفرٹ: (گھبرائے ہوئے انداز میں) اوہ اچھا وہ۔۔۔ وہ تو ساتھ والوں کی نوکرانی تھی جو ہیرس سے باتیں کر رہی تھی (بے چینی سے) لیکن چچا جان آپ نے سنا تھا کہ کیا باتیں ہو رہی تھی؟

میڈر چچا: نہیں۔۔۔ کچھ خاص نہیں سنا، ہاں البتہ میں نے کسی شخص کو خدا حافظ کہتے ضرور سنا تھا۔

کمفرٹ: جی جی۔۔۔ ہیرس اُس نوکرانی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا، دراصل وہ گاؤں جا رہی تھی۔

میڈر چچا: اور پھر کوئی کتے کی باتیں کر رہا تھا، کیا تم نے کوئی کتا بھی پال رکھا ہے؟

کمفرٹ: جی جناب، کوئی درجن بھر!

میڈر چچا: درجن بھر؟ اور طوطا تو تم نے خود ابھی ابھی کہا ہے کہ پال رکھا ہے۔۔۔ لگتا ہے کہ تمہیں گھر میں چڑیا گھر بنانے کا بہت شوق ہے۔۔۔ کوئی اور جانور بھی رکھا ہوا ہے؟

کمفرٹ: نہیں اور تو کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ جہاں تک شوقین مزاج ہونے کا تعلق ہے تو ایسا بھی نہیں ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میری زندگی کتنی خاموش اور الگ تھلگ ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ تقریباً کسی ریٹائرڈ شخص کی زندگی گزار رہا ہوں، ایسے میں کسی نہ کسی سنگت کا ہونا ازحد ضروری ہوتا ہے۔

میڈر چچا: تمہارے بیان سے تو لگتا ہے کہ تم معیار سے زیادہ مقدار پر یقین رکھتے ہو۔ بہرحال مجھے خوشی اس امر کی ہو رہی ہے کہ تم نے اپنی سنگت کے لئے اُن جانور کا انتخاب کیا ہے جو فطری طور پر تو وحشی ہوتے ہیں لیکن انسانوں کے وفادار ہوتے ہیں اور اُن کے پاس کوئی عقل یا سوچ نہیں ہوتی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہیں ہمیشہ جانوروں کی اُس نسل سے خبردار رہنے کی ہدایت کی ہے جو حیرت انگیز طور پر فکری اور عقلی طاقت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے جانوروں کی نظروں میں ہم انسان لوگ وحشی ہوتے ہیں۔

کمفرٹ: ارے چچا جان، ایسا بھی نہیں ہے۔

میڈر چچا: بہرحال یہ سچ ہے، اب تم اپنے ملازم ہی کو لے لو (ہیرس سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے) اپنی تمام تر حماقتوں کے باوجود وہ بہرحال بھرپور قوت۔۔۔

ہیرس: جناب کمفرٹ۔۔۔

کمفرٹ: (اُس کی طرف مڑتے ہوئے) کیا ہے بے!

ہیرس: ایک صاحب۔۔۔

کمفرٹ: خاموش رہو!

ہیرس: ٹھیک ہے جناب لل۔۔۔ لیکن۔۔۔

کمفرٹ: میں کیا کہہ رہا ہوں؟

ہیرس: وہ تو ٹھیک ہے جناب لل۔۔لل۔۔لیکن میریگل صاحب فرما رہے تھے کہ میں۔۔۔۔

کمفرٹ: میریگل۔۔۔ جارج میریگل؟

ہیرس: یہ تو مجھے پتہ نہیں ہے لیکن وہ ابھی ابھی تشریف۔۔۔

کمفرٹ: ابے پہلے کیوں نہیں بتایا؟

ہیرس: میں بتانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن۔۔۔

کمفرٹ: تم بھی بہت ماٹھی چیز ہو۔

ہیرس: جی جناب!

کمفرٹ: اب میریگل کو فوراً بلا لاؤ۔۔۔ اب یہ نہ پوچھ بیٹھنا کہ کتنا فوراً؟ (ہیرس سامنے والے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

کمفرٹ: (چچا میڈر سے) جارج میرا لنگوٹیا یار ہے، لیکن

کڑپہ (جنوبی ہند میں) میں کُل ہند مشاعرہ تھا، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، حسرت جے پوری اور ہم ایک مقامی رئیس جلال صاحب کے ہاں ٹھہرائے گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو شام ہو رہی تھی، سفر کی تکان کو دور کرنے کے لئے سب لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو گئے، صاحب خانہ نے ہمارے آرام کے خیال سے دروازہ بند کر دیا تھا مگر گھر کے بچے (درجن کی تعداد، اچھی خاصی تھی) دروازے کو کھول کر ذرا سا جھانکتے اور ہماری طرف اشارہ کر کے کچھ سرگوشیاں کرتے اور پھر بھاگ جاتے۔ شکیل صاحب تفریح کے موڈ میں تھے، اس لئے جیسے ہی بچے جھانکتے، زور سے "ہاؤ" کرتے اور بچے ہنس پڑتے۔ ایک مرتبہ شکیل صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی، دبے پاؤں دروازے کے قریب پہنچے اور پاٹوں پاٹ دروازہ کھول کر زور سے "ہاؤ" کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے ساتھ ہی کئی سُریلی چیخیں گونجیں اور کچھ لڑکیاں گرتی پڑتی اندر کو بھاگیں۔ شکیل صاحب ٹپٹا گئے۔ واپسی میں وہ راستے بھر یقین دلاتے رہے کہ میں انہیں بچے ہی سمجھا تھا مگر خمار انہیں چھیڑتے رہے کہ میں بھابی سے ضرور تذکرہ کروں گا کہ لڑکیوں کو دیکھ کر تم پر ایسا بھی "دورہ" پڑ جاتا ہے۔

کاناپھوسی از کیف رضوانی

مدتوں سے میری اُس سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک کچھ یاد کرتا ہے) باپ رے باپ، میں تو بھول ہی گیا تھا، اُسے تو میری شادی کا علم ہے۔۔۔ کہیں چچا جان کے سامنے پھوٹ ہی نہ دے، میں تو تباہ ہو جاؤں گا (زوردار آواز میں) چچا جان آپ نے آرام تو کیا ہی نہیں ہے، چلئے کچھ دیر مزید آرام کر لیجئے (اُنہیں بازو سے پکڑ لیتا ہے) چلئے۔

**میڈر چچا:** لیکن میں آرام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

**کمفرٹ:** تو پھر باہر کا ایک چکر لگا آئیں، بہت لطف آئے گا آپ کو۔۔۔ اس طرف کو چلئے (اُنہیں داہنی جانب لے جاتا ہے)

**میڈر چچا:** نہیں رچرڈ، میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔

(سامنے کے دروازے سے میریکیل داخل ہوتا ہے، جابجا لباس پر کیچڑ کے چھینٹے ہیں)

**میریکیل:** آہا، ڈکی۔۔۔ میری یار، میرے جگر۔۔۔ مجھے ازحد خوشی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر ؎
وصالِ یار کی لذت بتا نہیں سکتا

**کمفرٹ:** ہاں یار، عرصہ دراز کے بعد تیری صورت نظر آئی ہے، سچ پوچھو تو ٹھنڈی سی پڑ گئی ہے سینے میں۔

**میریکیل:** بالکل یار، کم از کم سال سے تو زیادہ عرصہ ہو گیا ہے تم سے ملے ہوئے، سچ بتاؤ، میری شکل بھی خاصی بدل گئی ہو گی؟

**کمفرٹ:** شکل تو خیر وہی ہے لیکن اس وقت تم مجسم زمین سے تازہ تازہ نکلے ہوئے آلو لگ رہے ہو۔

**میریکیل:** ہاہاہا، مجھے پتہ تھا تم یہی کہو گے، یقین مانو یہ سارے کیچڑ کے دھبے میں تمہاری اپروچ روڈ سے چنتا ہوا آیا ہوں۔ کیا بتاؤں کیسے سفر کر کے آیا ہوں اس راستے پر، ایمان سے تھکا مارا ہے کمبخت نے، سارا راستہ پیدل مارچ کرتے ہوئے کاٹا ہے، ڈپو میں ایک ہی بگھی تھی وہ بھی گاؤں کے کسی مشروٹ نے پہلے سے بُک کرا رکھی تھی ناچار اپنی دونوں ٹانگوں پر سوار ہو کر آنا پڑا ہے (چچا میڈر کو دیکھتا ہے، منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے کہتا ہے) لو جی، یہ بھی ٹپکے ہوئے ہیں (کمفرٹ سے) آپ کی تعریف؟

**کمفرٹ:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مارے گئے، اس سے تو چھٹکارا ممکن نہیں (چچا میڈر سے) چچا جان میں آپ سے اپنے ایک پرانے لنگوٹیے سے

تعارف کروانا چاہوں گا۔۔۔یہ میریکیل ہیں!

**میریکیل:** آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ڈک کے خبطی چچا ہیں، مسٹر دولت خان ہوں گے صاف صاف۔

**میڈر چچا:** (خفگی کے انداز میں) میں نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا ہے۔

**میریکیل:** جی جناب، آپ کا بڑا پن ہے۔

**میڈر چچا:** (پُروقار انداز میں) آپ نے جوابھی ابھی مجھے طعنہ دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت نامناسب ہے۔

**میریکیل:** اوہو، تو آپ نے سُن لیا کہ میں نے آپ کو ''بوڑھا خبطی'' کہا ہے۔۔۔ارے اس پر ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہر بوڑھا آدمی اعصابی کمزوری کا شکار ہوتا ہے، آپ بھی اس خصوصیت سے مستثنٰی نہیں!

**میڈر چچا:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) خاصا کھُلا ڈُھلا بندہ لگتا ہے۔

**کمفرٹ:** (میریکیل کو منظر سے ہٹانے کے لئے بہت بےچین ہے) یار جارج! مجھے پتہ ہے کہ تم نے یہ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے ہوں گے۔۔۔کیوں؟

**میریکیل:** نہیں یار، ابھی تو تم سے اچھی طرح ہاتھ بھی نہیں ملائے ہیں (کمفرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) میرا ارادہ کچھ عرصہ یہیں قیام کرنے کا ہے۔ ابھی تو میں اپنے ایک اور دیرینہ دوست سے ملنے جارہا ہوں، ویسے یہاں چلت پھرت کرنا خاصا دشوار ہے میرے لئے، لیکن خیر، کچھ دنوں میں عادی ہو جاؤں گا۔۔۔ہا، ڈکی۔۔۔کتنا عرصہ ہو گیا ہے تم سے بات کئے ہوئے، لگتا ہے صدیاں بیت گئی ہیں۔۔۔کیسے ہریل طوطے ہوا کرتے تھے تم شادی سے پہلے!!

**کمفرٹ:** ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔شائد پہلے۔۔۔

**میڈر چچا:** ہیں۔۔۔شادی؟

(کمفرٹ بُری طرح کھانستا ہے)

**میریکیل:** زیادہ شرمانے کی ضرورت نہیں (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کہاں چھپا رکھا ہے تم نے بھابی کو؟ میں تو ابھی تک اُنہیں دیکھ بھی نہیں پایا ہوں۔۔۔تم نے منگنی کا اعلان کیا تھا تو میری پوسٹنگ ہندوستان میں ہوگئی تھی۔ میں اُنہیں دیکھے بغیر ہی ہندوستان چلا گیا تھا۔

(کمفرٹ دوبارہ کھانستا ہے)

**میریکیل:** اس قدر کھانسی۔۔۔تم تو واقعی بوڑھے ہوگئے ہو ڈکی!

**میڈر چچا:** کیوں جی میریونڈ! یہ آپ کس کی شادی کی بات کررہے ہیں؟

**کمفرٹ:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کہ میرا تو قصہ ہی بیباق ہوگیا۔

**میریکیل:** ظاہر ہے جناب! میں ڈک کی بات کر رہا ہوں۔ عجیب احمق شخص ہے یہ ڈک بھی۔۔۔کالج میں بھونڈ مشہور تھا، کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اسے کسی لڑکی سے اسقدر جذباتی انسیت ہو سکتی ہے کہ اُس سے شادی پر ہی تُل جائے، اس کی شادی کی خبر ہم سب دوستوں کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں تھی۔

**میڈر چچا:** کیوں رچرڈ، تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا؟ (سخت لہجے میں) کہیں تم مجھے دھوکہ تو نہیں دیتے رہے ہو؟؟

**کمفرٹ:** اوہ چچا جان۔۔۔اللہ کا نام لیں، میں بھلا ایسا کر سکتا ہوں؟

**میڈر چچا:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) شادی کے

ذکر سے تو یہ چڑ ہی گیا ہے (زوردار آواز میں) کیوں ڈک؟ کیا نسبت برقرار نہیں رہ پائی تھی؟ اس کا بھی وہی انجام ہوا تھا جو ایسی حماقتوں کا ہوتا ہے؟

**کمفرٹ** جج، جی چچا جان۔۔۔ کیسی نسبت اور کہاں کی شادی، جیسی طے پائی، ویسی فوراً ٹوٹ بھی گئی، قریباً چھ ماہ قبل کی بات ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے آنکھ مارتے ہوئے) اُس وقت میں شادی شدہ تھا (میریکیل سے) میرا خیال ہے کہ تمھیں اب اپنے کپڑے تبدیل کر لینے چاہئیں!!

**میریکیل** وہ تو ٹھیک ہے یار لیکن میں تو کپڑے لایا ہی نہیں! یہی کپڑے ہیں جو پہنے ہوئے ہیں!

**کمفرٹ** میں تمھیں اپنے دے دیتا ہوں (پکارتا ہے) ہیرس!

**کمفرٹ** مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھیں تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ خصوصاً شادی والے ذکر پر!!

**کمفرٹ** چھوڑو یار! لیکن اب مزید نہیں، ٹھیک ہے ناں!! (ہیرس سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے)

**کمفرٹ** (ہیرس سے) ہیرس! محترم میریکیل کو میری خوابگاہ میں لے جاؤ۔۔۔ اور میریکیل! میرا خیال ہے کہ میرا ایک استری شدہ سوٹ کرسی پر پڑا ہوا ہے، جب تک تمہارے کپڑے صاف نہیں ہو جاتے، تم وہی پہن لو!

**ہیرس** ٹھیک ہے جناب! (ہیرس اور میریکیل داہنی طرف والے دروازہ نمبر ۲ سے نکل جاتے ہیں)

**میڈر چچا** اب بتاؤ رچرڈ۔۔۔ تم نے مجھے اپنی اُس نسبت کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟

**کمفرٹ** (بوکھلائے ہوئے انداز میں) دراصل چچا جان۔۔۔ مم، مم میں بتانا چاہ رہا تھا آپ کو لیکن آپ اُس وقت گھر پر نہیں تھے، کہیں گئے ہوئے تھے!

**میڈر چچا** تو کیا بنا تھا اُس نسبت کا، ٹوٹ گئی تھی؟؟

**کمفرٹ** جی۔۔۔ اور باہمی مشاورت سے۔۔۔ مم میں کچھ زیادہ ہی حساس تھا اس معاملے میں، پچوئشن ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔

**میڈر چچا** مجھے خوشی ہوئی یہ بات سن کر۔۔۔ اور میں بتاؤں کہ بیوی کا کا کیا ہوتا ہے، صرف اور صرف مصیبتیں پیدا کرنا اور بس!

**کمفرٹ** جی، جی، یہی احساس تھا ہماری علیحدگی کا!!

**میڈر چچا** آئندہ ایسی کسی حماقت میں ملوث مت ہونا، مجھے تمہاری شادی کے متعلق کوئی خبر نہیں آنی چاہیے ورنہ۔۔۔

**کمفرٹ** نہیں چچا جان، اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب سے میری نسبت ٹوٹی ہے، میں نے کسی دوسری خاتون کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔

**میڈر چچا** بہت اچھے بھتیجے، اب تم عقل کی بات کر رہے ہو۔۔۔ یہ اگلی ٹرین کب تک آئے گی یہاں؟

**کمفرٹ** (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) پانچ منٹوں میں آنے والی ہے اگلی ٹرین!

**میڈر چچا** بس اسی ٹرین سے آ رہی ہے میری بیوی!

**کمفرٹ** (حیرانی سے) آپ کی بیوی؟ آپ کا مطلب ہے آنٹی کلی مینٹینا؟

**میڈر چچا** ظاہر ہے، تمہارا کیا خیال ہے، کتنی بیویاں ہیں میری؟؟

**کمفرٹ** آپ نے اُن کی آمد کا تذکرہ نہیں کیا تھا!

**میڈر چچا** ہیں؟ میں نے نہیں لکھا تھا اپنے خط میں اس بارے میں؟ بھئی مہا غلطی ہو گئی مجھ سے، اُنہوں

نے آنا تو میری والی ٹرین میں تھا لیکن پھر وہ کسی کام سے ٹھہر گئیں کہ اگلی ٹرین میں آجائیں گی۔

**کمفرٹ** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کہ آج کا دن استقبالوں کی نذر ہی ہوجائے گا۔

**میڈر چچا** اب اسی کو لے لو رچرڈ، تم نے یہ بات محسوس کی ہو گی اور اسی سے ضرور سبق سیکھا ہوگا کہ ہم میں ذرا سی غلط فہمی پیدا ہوئی تھی، اور اب تک ہم میں بات چیت بند ہے۔

**کمفرٹ** اوہ۔۔۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔

**میڈر چچا** ارے نہیں بھتیجے، میرے حق میں تو بہت ہی اچھا ہوا ہے۔ تم شائد اسے میری عادت سمجھ رہے ہو لیکن جب عادت پختہ ہوجائے تو فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟؟

**کمفرٹ** جی چچا جان۔

**میڈر چچا** اور اگر تمہاری چچی، یعنی میری بیوی تم سے یہ کہے کہ تم اس شخص کو، یعنی مجھے جانتے ہو تو تم بخوشی کہہ سکتے ہو کہ نہیں جانتے۔

**کمفرٹ** کیا مطلب ہے آپ کا، کیا میں بالکل ہی اجنبیت کا اظہار کردوں؟

**میڈر چچا** ارے نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ بس جب وہ پوچھے تو برات کا اظہار کردینا۔۔۔ وہ تمہارے جواب سے خوش ہو جائے گی اور یقین مانو اس سے میرے جذبات مجروح نہیں ہوں گے، میں خود جو تم سے ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں، یہی اُس کی فطرتِ ثانیہ کا تقاضہ بن گیا ہے۔ ہاں البتہ اگر تمہیں اس پر اعتراض ہے تو ہم یہ بیویوں والا باب ہی بند کردیتے ہیں۔

**کمفرٹ** یہ ٹھیک رہے گا چچا جان۔

**میڈر چچا** اور ہاں، وہ تمہارا طوطا، کریسوٹس نسل کا ہے، یا ایریتھیکس ہے وہ؟

عصبیت، سازشِ غنیم، نفاق
کھا رہے ہیں تمام دست و پے

سونڈیاں اِس قدر ہوں جب درپے
تو شجر کا خدا ہی حافظ ہے

نوید ظفر کیانی

**کمفرٹ:** (شش و پنج میں) پتہ نہیں جناب، بس سیدھا سادا سا ہرے رنگ کا طوطا ہے، بولنے والا طوطا!!

**میڈرچا:** بہت جی چاہ رہا ہے اُسے دیکھنے کا۔

(ہیرس داہنی طرف والے دروازہ نمبر۲ سے داخل ہوتا ہے)

**کمفرٹ:** (پریشان ہوکر) مم۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں جناب۔۔۔ مم مگر۔۔۔

**میڈرچا:** اگر مگر مت کرو بھتیجے، تمہارا یہ بندہ اُسے لے آئے گا (ہیرس سے) جیمز، طوطا اُٹھا لاؤ!!

**ہیرس:** (حیرانی سے) کون سا طوطا جناب؟

**میڈرچا:** طوطا۔۔۔ ط و ط ا لف طا، طوطا

**ہیرس:** (کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کمفرٹ کی طرف دیکھ کر) میرا خیال ہے جناب کہ۔۔۔

**کمفرٹ:** (تیزی سے) خیال۔۔۔ لو بھئی اب اِن کا بھی کوئی خیال ہونے لگا۔۔۔ ابے خیال ویال کو چھوڑ اور طوطے کو اٹھا کر لے آ۔۔۔

**ہیرس:** آپ کا مطلب ہے کہ لائبریری سے اُٹھا کر لے آؤں۔۔۔ وہ جو بھس بھرا طوطا ہے، اُون والا؟

**کمفرٹ:** کیا مطلب ہے تیرا۔۔۔ ابے ماٹھی سرکار! وہ جو اصلی پروں والا ہے وہ اُٹھا کے لا۔

**ہیرس:** (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) جج جی جناب۔۔۔

**کمفرٹ:** ابے جلدی بھاگ اور اُس کے بغیر منہ نہ دکھانا۔۔۔

**ہیرس:** جج جج جی جناب (سامنے والے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

**میڈرچا:** کیا تمہارے پاس ایک سے زیادہ طوطے ہیں؟

**کمفرٹ:** جی ہاں۔۔۔ کوئی درجن بھر ہوں گے، دوسروں کو تو میں بھول ہی گیا ہوں۔

(میریکیل داخل ہوتا ہے، جوکروں والے کپڑے پہنے ہوئے ہیں)

**میریکیل:** کیا اس سے بہتر کپڑے نہیں تھے میرے لئے؟

**کمفرٹ:** ارے، یہ کیا پہنا ہوا ہے تم نے؟؟

**میریکیل:** کیا کہہ رہے ہو یار، تم نے کہا تھا کہ کرسی پر رکھے ہوئے کپڑے پہن لوں، کرسی پر تو یہی رکھے ہوئے تھے۔ تمہارا بندہ میرے کپڑے اُٹھا کر لے گیا، وہاں اِن کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ نہ پہننے سے تو بہرحال بہتر تھا کہ یہی کپڑے پہن لوں!

**کمفرٹ:** شکر ہے کہ تم نے کچھ بھی نہ پہننے کو ترجیح نہ دی، میرے کہنے کا مطلب ہے کہ میں نے اس سوٹ کے بارے میں نہیں کہا تھا، یہ تو خول پارٹی میں پہننے کے لئے ہوتا ہے (قہقہہ لگاتا ہے) یار، تم تو بالکل جوکر لگ رہے ہو اس میں۔

**میریکیل:** وہ تو لگنا ہی تھا، ظاہر ہے تم یہی چاہتے تھے کہ میں جوکر نظر آؤں۔

**کمفرٹ:** (بدستور ہنستے ہوئے) معاف کرنا یار۔۔۔ اب براہِ مہربانی ان کپڑوں کو اُتار ہی دو تو بہتر ہے۔

**میریکیل:** نہیں نہیں، مجھے اس میں بڑا مزا آرہا ہے، دیکھو، دیکھو میں پھر جوان ہوگیا ہوں، (رقص کرنے کے انداز میں میز کے گرد ایک چکر لگاتا ہے، اُس کی نظر کارنس پر پڑی ہوئی مسز کمفرٹ کی تصویر پر پڑتی ہے، وہ رُک کر اُسے دیکھنے لگتا ہے)

**میڈرچا:** یہ انتہائی بچگانہ انداز سے نوجوان بننے کی کوشش کر رہا ہے، ذرا دیکھو تو سہی رچرڈ!

**میریکیل:** (تصویر کو دیکھتے ہوئے) کیوں ڈِک، یہ کون ہے؟ بڑی خوبصورت لڑکی ہے!!

**کمفرٹ:** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) میری بیوی کی ہے اور کس کی ہے (بُری طرح کھانستا ہے اور پھر جلدی سے کہتا ہے) تو میں آپ کو بتا رہا تھا چچا جان کہ مجھے طوطے پالنے کو بہت سے بھی کچھ

زیادہ شوق ہے۔۔۔ بلکہ میں تو انہیں دوسرے تمام پالتو جانوروں پر ترجیح دیتا ہوں اور یہ جو سبز رنگ والے طوطے ہیں، یہ تو میرے فیورٹ ہیں۔۔۔ کتنے۔۔۔ کتنے سبز ہوتے ہیں واہ!

**میریکیل** (سٹیج کے نچلے والے حصے میں کمفرٹ کی طرف آتا ہے، تصویر اب بھی اُس کے ہاتھ میں ہے) کیا کہا تھا تم نے کون ہے یہ، کوئی رشتہ دار ہے یہ تمہاری؟

**کمفرٹ** (جان بوجھ کر لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے) کیا؟ رشتہ دار؟؟ کیسا رشہ دار؟؟ کس کا رشتہ دار؟؟

**میریکیل** ارے یہی جو من موہنی سی لڑکی ہے (تصویر چچا میڈر کو دکھاتا ہے اور کمفرٹ کو شرارت سے کمر پر ٹھوکا دیتا ہے) خوبصورت ہے ناں؟

**کمفرٹ** (تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے! یہ کہاں سے ملی تمہیں؟

**میریکیل** کارنس سے اور کہاں سے، کون ہے یہ؟

**کمفرٹ** (شش و پنج میں کہ کیا کہے) یہ۔۔۔ اچھا اچھا یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو ملازمہ کی تصویر ہے، جی ہاں ہماری ملازمہ ہے یہ!!

**میریکیل** ملازمہ؟ کیا بدنصیبی ہے، اتنی خوبصورت لڑکی اور ملازمہ، ارے یہ تو کسی شہزادی سے ہرگز ہرگز کم نہیں لگتی (تصویر چچا میڈر کے حوالے کر دیتا ہے) آپ خود ہی ایمان سے کہیں بزرگو، کیا یہ کسی شہزادی کی تصویر نہیں ہے؟؟

**میڈر چچا** لیکن رچرڈ! ایک ملازمہ کی تصویر تمہارے نشست والے کمرے میں کیا کر رہی ہے، مجھے تو تمہارا ذوق قطعاً پسند نہیں آیا۔

**کمفرٹ** مم مجھے نہیں پتہ۔۔۔ پتہ نہیں یہ یہاں کیسے آ گئی، ہو نہ ہو یہ ہیرس کے کام ہیں، وہی اسے وہاں بھولے سے رکھ گیا ہوگا۔ یقیناً ملازمہ نے اُسے دی ہوگی اور وہ اسے یہاں چھوڑ گیا ہوگا، یہ جارج کچھ ایسا ہی بھلکڑ ہے!

**میڈر چچا** بہت ہی ماٹھا ہے یہ جارج بھی!

**کمفرٹ** بالکل جناب، سو فیصد ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔

**میریکیل** (تصویر پر نظر جمائے ہوئے ہے) اس پری کا نام کیا ہے ڈِکی؟

**کمفرٹ** نن نام۔۔۔ سس، سیلی، جی ہاں سیلی نام ہے اس کا!

**میریکیل** کیا مجھے دیدار کرا سکتے ہو اس کا؟ یار نکالو کہاں چھپا رکھا ہے یہ حُسن کا خزانہ!!

**کمفرٹ** ناممکن!

**میریکیل** نہیں یار بس ابھی کے ابھی، پلیز!

**کمفرٹ** میں نے کہا ناں کہ اس وقت یہ ممکن نہیں۔۔۔ یہ قصبے میں گئی ہوئی ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) آج تو اتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں کہ اگلے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے ہوں گے۔

**میریکیل** واپس کب لوٹے گی؟

**کمفرٹ** (قدرے غصے سے) ایسا لگ رہا ہے میریکیل کہ تم میری۔۔۔ میری، میری ملازمہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہو۔

**میریکیل** بالکل، یہ چیز ہی کچھ ایسی لگ رہی ہے۔

**کمفرٹ** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) میں اس بدبخت سے ٹھیک ہی ڈر رہا تھا، ایک دو سوال اور کیے اس نے تو سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آ جائے گا۔

**میریکیل** کیوں ڈِک، تم نے بتایا نہیں کہ۔۔۔؟

**کمفرٹ** (بات کاٹتے ہوئے) نن نہیں اس تذکرے کو چھوڑیں، اس وقت مجھے ایک اور فوری مسئلہ

در پیش ہے **(منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے)** لو جی ایک اور جھوٹ کے لئے تیار ہو جائیں، واہ! کیا شیطانی دماغ پایا ہے میں نے بھی، لیکن کیا کیا جائے اس مشروٹ کی بے لگام تیغ زنی سے بچنے کا اور کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے، یہ شخص اُس وقت تک منہ بند نہ کرے گا جب تک بات کے موضوع کو ہی تبدیل نہ کر دیا جائے **(باآوازِ بلند)** میں آپ دونوں سے کچھ دیر کے لئے معذرت چاہتا ہوں، بس تھوڑی دیر بعد حاضر ہوتا ہوں۔

**(سامنے کے دروازہ نمبر۲ سے باہر نکل جاتا ہے)**

**میریکیل:** کیوں انکل جی! کیا یہ قابلِ افسوس بات نہیں ہے کہ اس قدر حسین لڑکی اپنی زندگی کو ملازمہ کی حیثیت سے برباد کر رہی ہے، آپ کیا کہتے ہیں اس معاملے میں؟

**میڈر چچا:** **(قدرے تلخی سے)** میں اُس معاملے میں کچھ نہیں کہتا **(اپنے کوٹ کی داہنی جیب سے اخبار نکالتا ہے اور کرسی پر دراز ہو کر پڑھنے لگ جاتا ہے)**

**میریکیل:** مجھے پتہ تھا جناب کہ آپ یہی کہیں گے کہ آپ اس معاملے میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں، وہ تو میں خود بھی نہیں ہوں، لیکن ذرا سی دیر کے لئے یہی سوچ لیں کہ اس جیسی حسین و جمیل دوشیزہ ملازمہ کی حیثیت سے کیسے زندگی گزارتی ہو گی، کیسی کرب ناک زندگی ہو گی اس کی، یک و تنہا، جیسے صحرا میں کوئی اکیلا آدمی **(جواب کا انتظار کرتا ہے)** ذرا اپنے آپ کو اس ملازمہ کی جگہ رکھ کر سوچیں، آپ کو پسند آئی گی ایسی زندگی؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اس قسم کی زندگی سے لطف اندوز ہوں گے؟ لطف اندوز ہونے سے میری مراد۔۔۔میرا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔**(چچا میڈر کی طرف دیکھتا ہے جو مطلقاً توجہ نہیں دیتے ہیں)** **(منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے)** میرا خیال ہے کہ اس وقت میرے بات کا کوئی مطلب نہیں نکل سکتا اس لئے کہ یہ موصوف تو مجھے قطعی طرع پر نظر انداز کرنے کے چکر میں ہیں **(کچھ توقف کے لئے چپ چاپ کھڑا رہتا ہے پھر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)** خاصا ماٹھا کر کے رکھ دیا ہے یہاں کی آب و ہوا نے بھی۔۔۔

**(ہیرس سامنے والے دروازے سے داخل ہوتا ہے، اس کے پیچھے مسز میڈر اور اس کی ملازمہ سیلی ہیں، ہیرس اعلان کرنے والے انداز میں کہتا ہے)** مادام کلی مینٹینا میڈر **(چچا میڈر چونکتے ہو جاتے ہیں لیکن بدستور لاتعلقی سے اخبار پڑھتے رہتے ہیں، میریکیل اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)**

**مسز میڈر:** **(تقریباً چیختے ہوئے)** اوئی سارا۔۔۔یہ کیا چیز ہے؟

**سیلی:** کسی سرکس کا جوکر لگتا ہے مادام!

**ہیرس:** ہو سکتا ہے کہ ہیریکیل صاحب نے بھیس بھر رکھا ہو **(ہیریکیل سے)** میں اِنہیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا جناب!

**میریکیل:** بھیس بھرا ہوا ہے؟ چل بے!! **(مسز میڈر سے جھک کر کہتا ہے)** میں جارج میریکیل ہوں مادام، آپ کا خادم!!

**مسز میڈر:** میرے خادم۔۔۔ہاہاہاہا، تم بھلا میری کیا خدمت

منیر نیازی ''پردے'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ جوشِ خطابت میں کہنے لگے۔
''میں پردے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو پردہ کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے'' ایک لمحے کے لئے رُکے اور اپنا فقرہ یوں مکمل کیا ''سوائے ایک کے۔۔۔اور وہ ہے کشور ناہید (اُس کی بیبا کیوں کی وجہ سے)۔۔۔میں نے کہہ رکھا ہے کہ سوائے کشور ناہید کے کسی سے پردہ نہ کرنا!!''

کر سکتے ہو؟؟

**میریکیل** مادام، یہ جمفرٹ صاحب کے دوست جارج میریکیل ہیں (میریکیل سے) معذرت جناب، میرا خیال تھا کہ شائد آپ نے خول پارٹی کے لئے بھیس بھرا ہوا ہے۔

**مسز میڈر** اوہ تو یہ کمفرٹ کا دوست ہے!

**ہیرس** جی مادام، یہ کمفرٹ کے دیرینہ دوست ہیں۔

**مسز میڈر** سارا، کیا واقعی ہیرس نے یہی کہا ہے کہ یہ کمفرٹ کا دوست ہے؟

**سیلی** جی مادام، سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔

**مسز میڈر** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اگر یہ کمفرٹ کا دوست ہے تو اس کا دشمن کیسا ہوگا ؟

(ہیرس سامنے والے دروازے سے ہنستا ہوا چلا جاتا ہے)

**میریکیل** مادام، میں معذرت چاہتا ہوں اگر میری کسی بات سے آپ کو یا آپ کی بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف پہنچی ہو۔

**مسز میڈر** میری بیٹی؟ یہ میری فرانسیسی ملازمہ ہے۔

(سیلی آداب کہنے کے انداز میں جھکتی ہے، چچا مینڈر ہونٹ سکوڑ کر ہلکی سی سیٹی بجاتے ہیں)

**مسز میڈر** (قدرے غصے سے) کیوں سارا! یہ کون صاحب ہیں؟

**سیلی** پتہ نہیں مادام، مجھے تو سیٹی بجانے والا کوئی باگڑ بلا قسم کی چیز دکھائی دیتی ہے۔

(چچا میڈر اپنی بے عزتی کے احساس سے سرخ پڑ جاتے ہیں اور سیٹی بجانا بند کر دیتے ہیں)

**میریکیل** ارے آپ نہیں جانتیں؟ یہ ڈِکی، میرا مطلب ہے کہ کمفرٹ کے چچا ہیں۔

**مسز میڈر** کیوں سارا؟ کیا اس نے کمفرٹ کا نام لیا ہے؟

**سیلی** سنا تو میں نے بھی یہی ہے مادام!

> محشر بدایونی سے ہماری ملاقات ٹنڈو محمد خان کے کل پاکستان مشاعرے میں ہوئی تھی، اس کے بعد ایک طویل عرصے تک ہم محشر صاحب سے نہ مل سکے۔ کئی ماہ بعد کراچی کے ایک مشاعرے میں ملے تو کہنے لگے "یہ تو یاد ہے کہ آپ کیف رضوانی ہیں مگر یہ قطعاً یاد نہیں آتا کہ آپ سے ملاقات کہاں ہوئی تھی۔"
>
> ہم نے کہا۔
>
> اِک ذرا چٹکی تو لیجے حافظے کی ران میں
> ہم ملے تھے آپ سے ٹنڈو محمد خان میں
>
> اور محشر صاحب نے لپک کے ہمیں گلے لگا لیا۔
>
> کانا پھوسی از کیف رضوانی

**مسز میڈر** مجھے تو یہ صاحب ایسے چگادڑ دکھائی دیتے ہیں جو اپنے آپ کو عقاب کہہ رہے ہوں، لیکن میں دھوکہ نہیں کھا سکتی کیونکہ میں نے چگادڑ کو دیکھا ہوا ہے (چچا مینڈر سے) سُن رہے ہو تم؟

**میڈر چچا** جی جی، بالکل سُن رہا ہوں، ایک ایک لفظ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لیکن یہ کہہ کیا رہی ہے آخر؟

**سیلی** چگادڑ تو میں نے بھی دیکھ رکھا ہے مادام۔

**میریکیل** اور میں نے بھی (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اس سے زیادہ عزت افزائی اس بڈھے کی اور کیا ہوگی (مسز مینڈر سے) میں آپ سے صاحب کا تعارف کرانا چاہوں گا مادام (چچا مینڈر بے چینی سے پہلو بدلتا ہے)

**مسز میڈر** خاموش! تم کیا جانتے ہوں ان کے بارے میں!!

**میریکیل** نہیں مادام میں جانتا ہوں اِن۔۔۔

**مسز میڈر** یہی ناں کہ یہ صاحب اور میں اجنبی ہیں؟

**میریکیل** جج جی مادام لل لیکن۔۔۔

**مسز میڈر** اور میں چاہوں گی کہ ہم بدستور اجنبی ہی رہیں (چچا مینڈر سے) سُن رہے ہیں اجنبی صاحب؟

کرشن چندر نے دورانِ ملاقات اپنی نئی کتاب "ایک گدھے کی سرگزشت" کنہیالال کپور کو پیش کی۔
کنہیالال کپور نے کتاب لے کر کرشن چندر کو یوں داد دی۔
"تم نے اچھا کیا، افسانے لکھتے لکھتے اپنی سوانح بھی لکھ ڈالی۔"

**میریکیل** معذرت خواہ ہوں مادام، میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں آپ پر اِن بزرگوار کی واقفیت زبردستی تھوپنا نہیں چاہتا ہوں لیکن میں بس اِتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صاحب بہت اچھے اخلاق و عادات کے مالک ہیں اور اُن کی محبت میں خوش رہیں گی۔۔۔تاہم، جیسی آپ کی مرضی (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) عجیب گڑبڑ گھوٹالہ ہے بھئی ان خاتون کا مزاج بھی۔

**مسز میڈر** سارا۔۔۔میرا خیال ہے کہ یہ جو اجنبی صاحب ہیں یہ اپنے متعلق میرے خیالات سے بخوبی واقف ہوں گے، کیوں؟

**سیلی** اگر ان میں کامن سینس ہے تو یقیناً واقف ہوں گے مادام!

(چچا میڈر دوبارہ ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجانا شروع کر دیتے ہیں)

**مسز میڈر** دیکھو، دیکھو، اس نامعلوم شے نے پھر شونکنا شروع کر دیا ہے! میرے تو دست و پے میں چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں یہ آواز سن کر!

**سیلی** (چچا میڈر سے) کیوں جناب، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سیٹی بجانے کے شوق کو کسی دوسرے خوشگوار لمحوں کے لئے موقوف فرما دیں، یہ معزز خاتون احتجاج کر رہی ہیں۔

(چچا میڈر سیٹی بجاتے رہتے ہیں، کمفرٹ سامنے والے دروازہ نمبر ۲ سے ظاہر ہوتا ہے)

**کمفرٹ** آخاہ۔۔۔محترم چچی جان! مزاج شریف؟

**میریکیل** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ایں؟ ڈک کی چچی؟ یہ کیا گیم ہے بھئی!

**کمفرٹ** مجھے امید ہے کہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا ہو گا۔

**مسز میڈر** (کمفرٹ کو آغوش میں لیتے ہوئے) کیا حال ہے بچے! کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمھیں دیکھے ہوئے!!

**کمفرٹ** مجھے امید ہے کہ میرے دوست میریکیل نے آپ کو خاصا محظوظ کیا ہو گا۔

**مسز میڈر** تمھارا دوست؟ کیا واقعی یہ تمھارا دوست ہے (سیلی سے) کہیں میرے کان دھوکہ تو نہیں دے رہے، میں نے ابھی ابھی رچرڈ کو کہتے سُنا ہے کہ یہ شخص۔۔۔یہ سامنے والا شخص اس کا دوست ہے؟

**سیلی** جی مادام، آپ نے بالکل ٹھیک سُنا ہے، ماسٹر کمفرٹ نے اِنہیں دوست ہی کہا ہے۔

**مسز میڈر** ہائے رچرڈ، تمھارا معیار کتنا گر گیا ہے۔۔۔ٹھیک کہا ہے کسی نے، ہر آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔۔۔کیا اب تم سرکس کے جوکروں اور بازیگروں سے بھی دوستی کرنے لگے ہو؟

(کمفرٹ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکتا ہے)

**میریکیل** لل۔۔۔لیکن محترمہ۔۔۔میں۔۔۔

**کمفرٹ** نہیں چچی جان آپ غلط سمجھ رہی ہیں، محترم میریگل نہ تو سرکس کے جوکر ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے بازیگر، بلکہ خاصا معزز قسم کا خوش پوش، یار باش انسان ہیں۔ان کے کپڑوں پر کیچڑ لگ گیا تھا، چنانچہ اِنہیں اپنے کپڑے اتارنے پڑے، غلطی سے یہ میرے خول پارٹی والا لباس پہن گئے ہیں۔۔۔خاصے مضحکہ خیز لگ رہے ہیں، ہیں ناں؟

(کمفرٹ ہنستا ہے، چچا میڈر بھی اُن کی ہنسی میں شریک ہو جاتا ہے)

**میڈر چچا** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ویسے سرکس کا جوکر قرار دینے والا آئیڈیا بُرا نہیں، بلکہ اس شخص کی شخصیت سے تو خاصا میل بھی کھاتا ہے یہ لقب۔۔۔سرکس کا جوکر۔۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔

**مسز میڈر** (پُروقار انداز میں) حیرت ہے ڈک۔۔۔تم کہہ رہے ہو کہ یہ شخص کوئی معزز شخص ہے، چلو مانا کہ ایسا ہی ہوگا، لیکن یہ کیسا معزز شخص ہے جس کے لباس پر کیچڑ لگا ہوا تھا۔۔۔اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم نے اس قسم کا جوکروں والا لباس اپنے گھر میں کیوں رکھ چھوڑا ہے؟

(چچا میڈر ہنستے ہیں)

**مسز میڈر** اور، رچرڈ، یہ کون شخص ہے؟

**کمفرٹ** یہ۔۔۔کک۔۔۔کیا آپ نہیں جانتی کہ یہ کون ہیں۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔(اچانک اُسے چچا میڈر کا کہا یاد آ جاتا ہے) نن۔۔۔نہیں چچی جان، مجھے نہیں پتہ کہ یہ کون ہیں!

**میڈر چچا** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) بال بال بچا ہے بچو نگڑا۔۔۔

**میر یکیل** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ ڈک کہہ کیا رہا ہے؟ باؤلا ہو گیا ہے کیا؟

**مسز میڈر** شکر ہے کہ تم نہیں جانتے اِسے۔۔۔جب سے میں یہاں آئی ہوں، یہ میرا مذاق اُڑائے جا رہا ہے۔

**کمفرٹ** ایں۔۔۔مذاق اُڑا رہا ہے آپ کا؟

**سیلی** جی جناب! جب سے ہم لوگ یہاں داخل ہوئے ہیں، یہ مالکن کو چڑائے جا رہے ہیں۔

**مسز میڈر** خاصی متنازعہ قسم کی شے ہے یہ۔۔۔رچرڈ! اِسے کسی بھی طور یہاں سے چلتا کرو!

(چچا میڈر سیٹی بجانے لگتے ہیں)

**کمفرٹ** (انداز میں نخوت پیدا کرتے ہوئے زور سے)

## آج کل کی دوستی
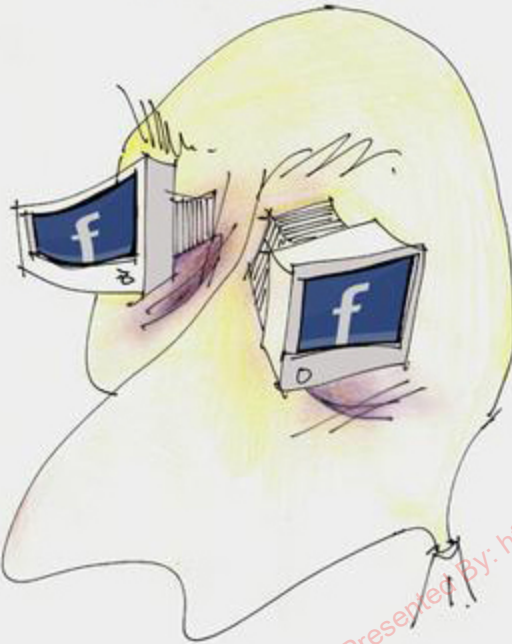
ٹھیک ہے کہ مدتوں سے آپ ہیں ہمسائے میں
بات پھر بھی یہ مرے پلے ذرا پڑتی نہیں

کس طرح ممکن تھا ربطِ باہمی، جب آپ نے
فیس بک پر دوستی کی استدعا بھیجی نہیں

کیوں محترم! آپ تشریف لے جائیں گے یہاں سے؟ **(منہ پر ہاتھ رکھ کر چچا میڈر سے عاجزی سے)** چچا جان! سٹنگ روم میں سگار کی نئی ورائٹی آپ کی منتظر ہے!!

**میڈر چچا** **(اُٹھتے ہوئے)** مجھے سگار وگار کا کوئی شوق نہیں لیکن چلیں، یہاں سے جانے کا بہانہ ہی سہی!!

**(سامنے والے دروازے سے نکل جاتا ہے)**

**کمفرٹ** **(میریکیل سے)** جارج۔۔۔ مجھے علم ہے کہ تمھیں سگار خاصے پسند ہیں!

**میریکیل** ہاں ڈک، تمھاری معلومات میرے بارے میں بالکل صحیح ہیں، میں تو سگار کا دیوانہ ہوں اس لئے میں بھی چلا چچا میڈر کے پاس!! **(وہ بھی سامنے والے دروازے سے نکل جاتا ہے)**

**مسز میڈر** **(کمفرٹ کے گرد لاڈ سے اپنی باہیں حمائل کرتے ہوئے)** آہ رچرڈ۔۔۔ میری زندگی تو افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔

**سیلی** نہیں مادام۔۔۔ ایسا نہ کہیں!

**مسز میڈر** **(درشتی سے)** سارہ! تم میری سرپرست بننے کی کوشش مت کرو!!

**سیلی** سوری مادام، میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا، میں کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کمال کا صبر رکھتی ہیں۔

**مسز میڈر** بالکل درست کہا ہے سارہ تم نے، یہ میری شال اور ہیٹ پکڑنا۔۔۔

**(دونوں چیزیں اُسے پکڑاتی ہے اور خود رونا شروع کر دیتی ہے)**

**مسز میڈر** میری زندگی ایک سائے سے بندھی ہوئی ہے، ہر گزرتا لمحہ مجھ پر کوڑے برسا رہا ہے۔۔۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے رچرڈ کہ میڈر مجھ سے کیسا سلوک کر رہا ہے۔

**کمفرٹ** یہ تو بہت بُرا ہوا۔۔۔ کیا آپ دونوں میں اکثر جھڑپ رہتی ہے۔

**مسز میڈر** **(روتے ہوئے)** جھڑپ؟ ارے جھگڑوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ کہو!

**سیلی** جناب! مادام صحیح فرما رہی ہیں، بہت زیادہ جھگڑے ہوتے ہیں دونوں میں، مادام صاحب سے ہر وقت لڑتی رہتی ہیں۔

**مسز میڈر** **(ڈانٹتے ہوئے)** سارا؟ میں کب لڑتی ہوں اُن سے؟

**سیلی** **(جلدی سے)** جج، جی مادام! آپ ان سے جھگڑا نہیں کرتی ہیں، وہی آپ سے ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔

**مسز میڈر** **(کمفرٹ کے گرد بازو حمائل کرتی ہیں اور اُس کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہیں)** وہ مجھ سے اتنی بے اعتنائی برتتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا یہ تھکا ماندہ سر کس کے کاندھے پر رکھوں!

**کمفرٹ** **(منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے)** لگتا ہے خاصی پریکٹس کرتی رہی ہیں محترمہ اِس ایکٹ کے لئے۔

---

شاہد دہلوی اکبر آبادی کا شگفتہ مزاجی اور فی البدیہہ شعر گوئی میں کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک محفل میں مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت، سلیمان ادیب اور راقم الحروف موجود تھے، خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ مخدوم نے شاہد صدیقی سے پوچھا "یار وہ میر کے شعر کا مصرعۂ اولیٰ کیا ہے؟"

شاہد صاحب نے پوچھا "کون سا شعر؟"

مخدوم نے جواب دیا "وہی":

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

شاہد صدیقی نے ایک لمحہ غور کیا اور جواب تیار تھا۔

یہ بات کہہ کے میر تقی میر مر گئے
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

کانا پھوسی از کیف رضوانی

---

**مسز میڈر** خود میرا شوہر بھی مجھے بوجھ سمجھتا ہے۔

**کمفرٹ** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) محترمہ ہیں بھی تو خاصی وزنی۔۔۔

**مسز میڈر** میں تو اُن کے نزدیک ملازمہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

**کمفرٹ** (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اِن محترمہ نے تو مجھے بینگر ہی سمجھ لیا ہے۔

**مسز میڈر** تم شادی شدہ نہیں ہو ناں رچرڈ، ورنہ تم میرے دکھ کو باآسانی سمجھ جاتے۔

**کمفرٹ** (چونک کر) ایں! کیا کہا؟ شادی شدہ؟؟ شادی اور میں۔۔۔ ہاہاہاہا

(سامنے والے دروازے سے مسز کمفرٹ داخل ہوتی ہے)

**مسز میڈر** لیکن تم نے کبھی نہ کبھی شادی تو کرنی ہی ہے۔

(سامنے والے دروازے سے چچا میڈر اور میریکیل بھی داخل ہوتے ہیں، میریکیل کے منہ میں سگار ہے)

**کمفرٹ** لیکن چچی جان نہ تو میری شادی ہوئی ہے اور نہ ہی میں مستقبل میں ایسی کسی حماقت کا ارادہ رکھتا ہوں۔

(مسز کمفرٹ صدمے سے چیخ پڑتی ہیں)

**مسز میڈر** (مڑ کر اُس کی طرف دیکھتی ہے) کیوں رچرڈ، یہ کون عورت ہے؟

**کمفرٹ** (بوکھلائے ہوئے انداز میں) اوہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کون ہو سکتی ہیں، ہاں ہاں ارے یہ تو میری ملازمہ ہیں۔

(سامنے والے دروازے سے ہیرس داخل ہوتا ہے، صندوق اور بہت سے پیک سے لدا پھندا ہے، مسز کمفرٹ اس کے پیچھے جھکی ہوئی ہے)

پردہ گرتا ہے۔

## بلاعنوان

محمد خلیل الرحمٰن

# جیون میں اک بار آنا سنگاپور

اگلی صبح جب ہم نہا دھوکر تیار ہوچکے تو ہوٹل کے ریسٹورینٹ میں ناشتے کے لیے پہنچے۔ چودھری صاحب بھی ابھی کچھ ہی دیر پہلے پہنچے تھے۔ ہم دونوں نے ایک اچھی سے میز تلاش کی جہاں سے ہر طرف نظر رکھ سکتے، اور اس پر براجمان ہوکر دہن ونظر کا ناشتہ شروع کیا۔ لذتِ کام ودہن کے ساتھ ساتھ لذت ذہن ونظر کا بھی وافر مقدار میں انتظام ہوتو کیا کہنے۔ ہوٹل دنیا بھر کے سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ پاکستان سے باہر کی حوریں اعضاء کی فی البدیہہ شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ہنسنا بولنا سب شاعرانہ انداز میں ہوتا ہے۔ ہائے! نہ ہوئے ہم نقاد، ورنہ کیسے کیسے بخیے اُدھیڑ تے۔ اِدھر چودھری صاحب نے ہمیں ایک فارمولے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ ناشتہ ہوٹل کی جانب سے فری ہے اور ساتھ ہی یہاں پر حلال اشیاء (صرف ناشتے کے لیے) وافر مقدار میں موجود ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ڈٹ کر ناشتہ کریں، خدا جانے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ میسر آئے نہ آئے۔ تجویز چونکہ معقول تھی اس لیے ہم نے جلدی جلدی ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا، لیکن دو انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کے صرف دو ہی سلائیس کھا سکے البتہ آرینج جوس کے ساتھ خوب دشمنی نبھائی اور کئی گلاس بغیر ڈکار لیے ہضم کر گئے۔

ادھر چودھری صاحب بات کے پکے نکلے اور انھوں نے ناشتے کے لیے موجود تمام اشیاء کے ساتھ خوب انصاف کیا۔

دورانِ ناشتہ وہ ترنگ میں آکر کچھ اور کھلے اور بتایا کہ کل رات انھوں نے ایک مساج سنٹر فون بھی کھڑکایا تھا اور بھاؤ تاؤ وغیرہ کے تمام مراحل بحسن وخوبی سر کر لیے تھے۔ ہم نے انھیں معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ان سے سوال کیا" ذرا بتانا تو! اپنے کمرے کا کیا نمبر تم نے انھیں لکھوایا تھا؟"

اب تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے لہٰذا شرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ انھوں نے ہمارے کمرے کا ہی نمبر لکھوا دیا تھا۔ البتہ اس بات نے ان کی حیرت اور خوشی کو دوبالا کردیا کہ ان کی فون کال کا نتیجہ اتنی جلد نکل آیا تھا۔ اب انھوں نے راز دارانہ انداز میں ہمیں تاکید کی کہ آئندہ اگر فون آیا تو ہم انھیں بلا لائیں اور ان کی بات کروادیں۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو پتہ چلا کہ کرائے کی ایک ویگن ہمیں ٹریننگ سنٹر تک چھوڑنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اور اس طرح ایک نہایت خشک قسم کی تربیت کا آغاز ہوا، جو ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر سہ پہر پانچ بجے تک جاری رہتی۔ سوائے اسکے کہ یہی تربیت ہمارے سنگاپور آنے اور اس سفرنامے کے لکھنے کا سبب بنی تھی کوئی اور قابلِ ذکر بات اس میں نہیں تھی جس

کا ذکر کر کے ہم اپنے قارئین کو بور کر سکیں۔ ہاں البتہ ایک واقعہ ایسا بھی گزرا جس کا ذکر کیے بغیر آگے بڑھ جانا نری زیادتی ہوگی۔ ایک دن ہم اپنے ٹریننگ سنٹر میں اپنی معمول کی تربیتی سر گرمیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہماری تجربہ گاہ میں بہار آگئی۔ ایک خوبصورت سی چینی نژاد سنگاپوری حسینہ اس خشک ماحول میں چودھویں کے چاند کی مانند طلوع ہوئی۔ ہم حیران تھے کہ

الٰہی یہ کیا ماجرا ہوگیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا

ہم نے مشینوں پر خاک ڈالی اور اِس حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اُس کے گرد جمع ہوگئے۔ اس حسینہ نے اطمینان کے ساتھ اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا چپٹا بکس میز پر رکھ دیا اور اسے کھول کر ہمارے معائنے کے لیے پیش کر دیا۔ اس بکس میں قسم قسم کی خوبصورت گھڑیاں موجود تھیں۔ ہم نے گھڑیاں دیکھیں تو میکانیکی انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔ یہ گھڑیاں یقیناً قیمتی ہوں گی، اور ہم انھیں خریدنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ چند لمحے ہمیں سنجیدگی کے ساتھ دیکھتے رہنے کے بعد وہ حسینہ ہنس پڑی۔ ہمیں اسکے یکا یک ہنسنے کی وجہ تو بعد میں پتہ چلی لیکن اُس وقت اس کے ہنسنے کا یہ انداز بہت پیارا لگا۔ ہم نے بھی جواباً مسکرا کے اس کو دیکھا اور منتظر رہے کہ دیکھیں دستِ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ سب گھڑیاں نقلی تھیں۔ پھر کیا تھا۔ ہم سب ہم جماعت اس قیمتی مجموعے پر ٹوٹ پڑے اور سب دوستوں کی طرح ہم نے بھی دو گھڑیاں مول لے لیں۔ وہاں بھاو، تاو کیا کرتے، جو اس نے کہا مان لیا اور فوراً جیب سے پرس نکال کر مطلوبہ ڈالر اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

یہ وہ زمانہ تھا جب نقلی گھڑیاں ابھی نئی نئی آئی تھیں، لہٰذا ایک انوکھی شے سمجھ کر ہم خرید لائے اور گھر والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیں۔ پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو شوکیسوں میں سجی گھڑیوں کو گھنٹوں تکا کرتے لیکن خریدنے کی سکت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ اب جو یہ نقلی گھڑیاں ہاتھ آئیں تو گویا وارے نیارے ہوگئے۔ خیر صاحب یہ تھی ہماری ٹریننگ کی داستان۔ شام کو تربیتی مرکز سے نکلتے، سرکاری ویگن ہمیں سیدھے ہوٹل لیجاتی، جہاں پر ہم اپنا بیگ کمرے میں پھینکنے کے بعد فوراً ہوٹل سے باہر نکل جاتے، رات دس گیارہ بجے تک سڑکوں اور شاپنگ سنٹرز کے چکر لگاتیاور جب تھک کر چور ہو جاتے تو واپس ہوٹل کی راہ لیتے۔ ہفتے کے اختتامیے (ویک اینڈز) ہم نے مشہور سیر گاہوں کی سیر کے لیے مخصوص کر دیے تھے۔

سنگاپور استوائی خطے میں واقع ہے لہٰذا اس کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ بارشیں خوب ہوتی ہیں۔ دن کا اوسط درجہ حرارت تقریباً تیس درجے سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ ہریالی خوب ہے۔ سال کے بارہ مہینے آپ ایک عدد ٹی شرٹ میں گزارہ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہر روز ایک ہی ٹی شرٹ نہ ہو۔ یہاں آپ کو گرم کپڑوں کی بالکل ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ یہاں پر گرمی کی وجہ سے تمام دفاتر، زیادہ تر شاپنگ سنٹر اور ہوٹل وغیرہ ائر کنڈیشنڈ ہوتے ہیں، جسے یہاں ائر کون کہا جاتا ہے، کسی بھی بلڈنگ کے اندر آپ کو گرم سوئٹر کی ضرورت پڑ سکتی ہے لہٰذا حفظ، ماتقدم کے طور پر سنگاپور آتے ہوئے ایک عدد سوئٹر ضرور رکھ لینی چاہیے۔

سنگاپور میں کئی قومیتوں اور رنگ و نسل کے لوگ بستے ہیں۔ سب سے زیادہ چینی نژاد ہیں جو آبادی کا تقریباً پچھتر فیصد ہیں۔ باقی پچیس فیصد میں ملائین، ہندوستانی، پاکستانی، سری لنکن عرب وغیرہ ہیں۔ بڑے مذاہب میں بدھ ازم، ہندومت، اسلام اور عیسائیت ہیں جن کے عبادت خانے بھی نظر آتے ہیں۔ حکومت کا انداز جمہوری ہے لیکن کسی بھی شخص کو دوسرے کے مذہب پر تنقید کا حق نہیں ہے۔ ملک میں سیاحت ایک انڈسٹری کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کی ہر شے وہاں موجود ہے اور سستی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سیاح سنگاپور آئیں اور زرِ مبادلہ کمایا جاسکے۔ پورا سنگاپور ایک بہترین تفریح گاہ، ایک سیاحتی مرکز اور ایک بہت بڑا اور اعلیٰ درجے کا بازار ہے۔ ابھی حال ہی میں (۲۰۱۰ء) سنگاپور کے تفریحی جزیرے سینٹوسا آئی لینڈ میں بھی ایک

بنگال میں لوگ عموماً "ظ" کو "ج" اور "ج" کو "ظ" کے تلفظ پر بولتے ہیں۔ ڈھاکہ میں ایک سامع نے ظریف جبل پوری کی مزاحیہ شاعری سے متاثر ہو کر اُن کا نام پوچھا۔ اُنھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "جریف ظبل پوری!" اُن کے ساتھی شاعر نے ٹوکا "تم نے اپنے ممدوح کو اپنا نام غلط کیوں بتایا؟" ظریف جبلپوری بولے "اگر صحیح نام بتاتا تو یہ سمجھ نہ پاتا، اب سمجھ گیا ہوگا۔"

عدد کسینو بنایا گیا ہے جہاں پر سیاحوں کا داخلہ مفت ہے جبکہ سنگاپوری شہریوں کیلیے داخلہ فیس ہی ایک سو ڈالر ہے۔

سنگاپور کا جو انداز سب سے پہلے آنکھوں کو بھاتا ہے وہ یہاں کی صفائی ستھرائی ہے۔ ہمیں تو سنگاپور یورپ سے بھی زیادہ صاف وشفاف نظر آیا، جس کی تائید ہمارے جرمن انسٹرکٹر نے بھی کی۔ صاف، شفاف، چمکتی ہوئی سڑکیں، عمارتیں اور پارک دل کو بھاتے ہیں۔ سنگاپوری شہریوں کے بقول ان کا ملک ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہے، جس پر وہ بجا طور پر فخر کرتے ہیں یہاں پر کوڑا کرکٹ پھیلانے پر سخت سزا اور جرمانے کا رواج ہے۔ یہ جرمانہ ۵۰ سے ۵۰۰ ڈالر تک ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنے معاشرے کے متعلق سوچا جہاں پر اس حدیثِ نبوی ﷺ پر ہمارا ایمان ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے، لیکن اس صفائی سے مراد ہم گھر کی صفائی لیتے ہیں اور اس کا اطلاق اپنے گھر کی دہلیز سے باہر نہیں کرتے۔ ہمارے گھر سے باہر دراصل ہماری ذمہ داری ہی نہیں ہے بلکہ حکومتِ وقت کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے پہلے دن کے اختتام پر اپنی قمیص کی کالر کی حالت دیکھنی چاہی، وہ بالکل صاف تھی۔ اسی طرح ان تین ہفتوں میں ہمیں اپنے جوتوں پر پالش کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، وہ اسی طرح چمکتے ہوئے ہی ملے، جس طرح پہلے روز نظر آئے تھے۔ اب جب ۲۰۱۰ میں، اتنے سالوں بعد ہم دوبارہ سنگاپور پہنچے تو پتا چلا کہ سگریٹ اور چیونگم پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ دراصل ایم آر ٹی کے چلنے کے بعد ایک مرتبہ سنا کہ کسی نے چیونگم کو چبا کر ٹرین کے آٹومیٹک دروازمیں چپکا دیا تھا جو دروازہ کھلنے میں تاخیر کا سبب بنا، لہٰذا چیونگم کے خلاف یہ کارروائی عمل میں لائی گئی۔ سگریٹ سنگاپور میں بہت مہنگی ہے، البتہ چنگی ائر پورٹ کے انٹرنیشنل لاونج میں سستی۔ دفتروں، شاپنگ سنٹرز اور بس اسٹاپوں، ریلوے اسٹیشن وغیرہ پر سگریٹ نوشی کی سختی سے ممانعت ہے۔ سگریٹ کے دھویں کو بھی وہ آلودگی تصور کرتے ہیں۔

لاہور سے ہمارے ایک سینئر انجینئر نے ایک صاحب کا نام اور ٹیلیفون نمبر دیا تھا کہ ان سے رابطہ قائم کر کے سلام کہہ دینا۔ ہم نے انھیں کال کیا اور اپنے لاہوری دوست کا سلام وپیغام پہنچایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں لینے کے لیے ہوٹل آگئے۔ یہ صاحب پاکستانی تھے لیکن ایک سنگاپوری حور پر دل ہار بیٹھے تھے۔ اب اس سے شادی رچا کر گزشتہ سالہا سال سے سنگاپوری شہریت اختیار کر کے یہیں بس گئے تھے۔ اب تو ان کا ایک جوان بیٹا بھی تھا۔ انھوں نے ہمیں اپنے گاڑی میں بٹھایا اور ایک لمبی ڈرائیو پر نکل گئے۔ ہائی وے پر پہنچے اور ہمیں سنگاپور سے متعلق بتاتے ہوئے سنگاپور کی ہوائی سیر کروائی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے بیٹے نے کہیں اپنی یونیورسٹی کیکسی اخبار میں اسرائیل کے خلاف اور فلسطینیوں کی حمایت میں ایک مضمون لکھ مارا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے مسجد کمیٹی کی اپنی رکنیت سے مستعفی ہو جانا پڑا تھا۔ صحیح یا غلط، ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کسی کی بھی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اس ملٹی ایتھنک ملٹی ریشیل قسم کے ملک کے لیے یہی پالیسی بہتر ہے ورنہ ہر روز کوئی نہ کوئی گروہ جذبات میں آ کر اور مشتعل ہو کر ہنگامہ آرائی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں بہت سی باتیں غلط ہو رہی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے ہم جوش میں آ کر اپنے ہی سکون کو کیوں غارت کر لیں۔ ان صاحب نے ہمیں گھر لے جا کر چائے وغیرہ پلوائی اور پھر ہوٹل چھوڑ دیا۔

اُن دنوں ہم ہوٹل سے باہر نکلتے تو زیادہ تر بس میں سفر کرتے تھے، اس لیے کہ ٹیکسی مہنگی پڑتی تھی اور ایم آر ٹی ابھی بنی نہیں تھی۔ سنگاپور میں آج تک ڈبل ڈیکر بسیں چلتی ہیں۔ ہم بس اسٹاپ پر آ کر کھڑے ہو جاتے اور ڈبل ڈیکر کا انتظار کرتے اور جوں ہی ڈبل ڈیکر بس میسر آتی، فوراً اس میں سوار ہو کر اوپر کی منزل کی

## پولیس کی نوکری

آپ نے ایک سردار جی کا لطیفہ تو سُنا ہوگا کی ایک ایکسیڈینٹ میں اُن کے سر پر سخت چوٹ آئی۔ فوری طور پر آپریشن کیا گیا اور کچھ دنوں بعد سردار جی صحت یاب ہو کر اسپتال سے روانہ ہوگئے۔ اُن کے جانے کے بعد ڈاکٹروں کو پتہ چلا کہ جلدی میں وہ کھوپڑی میں بھیجا رکھنا تو بھول ہی گئے ہیں، چنانچہ اُن کی تلاش شروع ہوئی اور دو ماہ بعد اُن کا سراغ ملا تو ڈاکٹر نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے بتلایا کہ غلطی سے کھوپڑی میں بھیجا نہیں رکھا جا سکا ہے۔ اس پر سردار جی نے شانت لہجے میں کہا ''اب اس کی ضرورت نہیں یارا، میں نے پولیس کی نوکری کر لی ہے۔''

کانا پھوسی از کیف رضوانی

جانب لپکتے۔ اوپر جا کر وہاں سے سنگاپور کا نظارہ کرتے تھے، یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ ہمیں اپنے بچپن میں کراچی کی سڑکوں پر چلتی ہوئی ڈبل ڈیکر بسوں کا بھی ہلکا سا دھیان ہے۔ ہمیں سب ہے یاد ذرا ذرا۔ اسی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہم نے سنگاپور کی ڈبل ڈیکر میں خوب سفر کیا اور خوب مزے لے لے کر کیا۔ اس زمانے میں انڈر گراونڈ ٹرین کی تیاری اور سرنگوں کی تعمیر چپکے چپکے کی جا رہی تھی، البتہ کہیں کہیں اس کے اسٹیشن ابرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس بارے میں مقامی لوگوں سے خاصا سننے کو مل جاتا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں جب ہم تیسری بار سنگاپور پہنچے تو یہی انڈر گراونڈ ٹرین بن کر تیار ہو چکی تھی اور اس نے اپنا کام بھی شروع کر دیا تھا لیکن ہمیں اسے دیکھنے اور اس میں سفر کرنے کا اتفاق ۲۰۱۰ء میں ہوا۔

ہم نے سنگاپور پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کاغذ پینسل سنبھال کر بیٹھ گئے اور ایک مکمل بجٹ بنا لیا کہ ہمیں جو زرِ مبادلہ دیا گیا تھا، اس میں سے ہمارا اصل حصہ کتنا ہے اور کس قدر رقم ہمیں واپس لوٹا دینی ہے۔ پھر اپنے حصے میں سے ہم نے ہوٹل اور ٹیکسی کا حساب علیحدہ کر لیا تا کہ کھانے کے لیے اپنی ذاتی رقم کا اندازہ ہو سکے۔ ذاتی یوں کہ اسی میں سے ہم کچھ رقم پس انداز کر سکتے تھے اور اپنی ذاتی خریداری کر سکتے تھے۔ پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو اسی طرح ہم نے اپنے کھانے میں سے کافی رقم پس انداز کی تھی اور ایک عدد کمپیوٹر خریدا تھا۔ یہاں سے بھی ہم نے ایک عدد کمپیوٹر خریدنے کا پروگرام بنا لیا۔ سنگاپور میں یوں تو ساری دنیا کی طرح اچھے ریسٹورینٹ کافی مہنگے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے یہاں پر جگہ جگہ کھانے کے سستے اسٹال لگائے گئے ہیں۔ جہاں پر درمیان میں ایک مناسب بیٹھنے کی جگہ کا انتظام کیا گیا ہے اور چاروں جانب کھانے کے اسٹال ہیں جہاں سے کھانے والے اپنی مرضی کی اشیاء خرید کر کھاتے ہیں۔ یہاں پر بیرے (ویٹرز) نہیں ہوتے بلکہ لوگ خود اپنی مدد آپ (سیلف سروس) کے تحت اپنا کھانا خود ہی اپنی میز تک لے آتے ہیں۔ یہ بندوبست فاسٹ فوڈ ریسٹورینٹوں یعنی میکڈلنلڈ اور کے ایف سی سے بھی سستا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جگہ جگہ انڈین مسلمانوں یا ملاین مسلمانوں کے حلال کھانے کے ڈھابے بھی نظر آجاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری دو عدد ترکیبیں ایسی تھیں جو ہماری بچت میں سراسر اضافے کا باعث تھیں۔ پہلی ڈٹ کر ناشتہ کرنا اور دوسری چودھری صاحب کے لائے ہوئے فوڈ کینز سے فائدہ اٹھانا۔ پہلی ترکیب پر ہم سے زیادہ چودھری صاحب عمل کر پاتے تھے اور دوسری ترکیب پر عمل پیرا ہونے میں ہم چودھری صاحب کے شانہ بشانہ شریک ہوتے تھے۔

ہماری دوسری لسٹ خریداری کی تھی۔ اس دوسری لسٹ میں سرِ فہرست تو جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا ایک عدد کلون کمپیوٹر تھا۔ پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو ایک عدد کموڈور ۶۴ کمپیوٹر مول لے آئے تھے۔ ادھر کچھ ماہ سے آئی بی ایم کلون کمپیوٹر عام ہو گئے تھے اور سستے ہونے کی وجہ سے عام آدمی کی پہنچ میں تھے۔ باقی اشیاء کا دارومدار اس بات پر تھا کہ کمپیوٹر خریدنے کے بعد ہمارے پاس کتنی رقم بچ رہتی ہے۔ اس میں ہمارے اپنے کپڑوں کے علاوہ گھر والوں کے لیے کچھ تحفے تحائف وغیرہ شامل تھے۔ روز آنہ رات کو سونے سے پہلے ہم ان دونوں لسٹوں کو بلا ناغہ اپڈیٹ کر لیتے تھے۔ تا کہ ہر وقت ہمیں اپنی جیب کی حیثیت کا احساس رہے اور ہم اپنے بجٹ سے زیادہ خرچ نہ کر سکیں۔

ہم نے جا کے بیچ دیے جس کے زیورات
وہ سال بھر تو دال نہ دے گی بگھار کے
(محمد طہٰ خان)

# میرے بچپن کے دن

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

دانت جھڑنے لگے ، ہاتھ ہلنے لگے
قلب مُضطر اُلٹ چال چلنے لگے
گل خزاؤں میں یوں رنگ بھرنے لگے
آنکھ میں موتیا اب اترنے لگے
ہر طرف بے بسی کے ہی سین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

ہے بہ فیضِ ملاوٹ یہ حالت مری
ہانپ کر طے ہوئی ہے یہ آدھی صدی
کون جانے کہ کب ہوگی فُل سنچری
ہے حوادث سے معمور یہ زندگی
آھنی ہاتھ تھے جو کبھی ، ٹین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

گال پچکے ہوئے آنکھ ہے زرد زرد
ہے ہر اک جوڑ میں آجکل میرے درد
چھوڑ کر اپنے پیچھے میں سالوں کی گرد
کھینچتا ہوں صبح و شام اب آہِ سرد
یوں بڑھائے قدم جانبِ دین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

زندگی ہے رواں بس یونہی دم بہ دم
ہر نیا دن کرے اس کو کچھ اور کم
اب نہیں راستے میں کوئی پیچ و خم
سوئے پینشن بڑھائے ہیں ہم نے قدم
عمر کے رخش پہ بیٹھے بے زین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

یہ نہیں کہ مرے گھر میں ٹی۔وی نہیں
دال روٹی نہیں چینی اور گھی نہیں
ہے سبھی کچھ مگر اب وہ دل ہی نہیں
مانتی کوئی بھی بات بیوی نہیں
دے رہی ہے تڑی بچے "دفتین" ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

کب کسی سے تھی یاں دوست داری مری
نوکری ہی سے تھی صرف یاری مری
عمر گزری ہے کرسی پہ ساری مری
آئے گی کب بھلا دیکھو باری مری
گورکن سارے مائل بہ تدفین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

کی جو بھی بات خیر سے وہ کی عناد کی — سچ پوچھیے تو لیڈری جڑ ہے فساد کی (بشیر احمد چونچال)

# اِسی گھر میں

تضمین مصطفیٰ زیدی

مدت سے رہائش ہے کرائے کے مکاں میں
''بیٹھا ہوں سیاہ بخت و مکدر اسی گھر میں''

نہ رنگ ، نہ روغن تھا ، در و بام سیاہ تھے
''اترا تھا مرا ماہِ منور اسی گھر میں''

سٹاپ بھی نزدیک نہ تھا ہائے صد افسوس
''آتے تھے بڑی دور سے چل کر اسی گھر میں''

مالک سے جھڑپ ہوتی تو ہر بات پہ اک بات
''رہتی تھی رقیبانہ بھی اکثر اسی گھر میں''

نقشہ تھا مرے گھر کا بس اک نظمِ معرا
''اشعار در اشعار تھا ہر در اسی گھر میں''

ہر بار صدا دے کے وہ لے جاتے تھے روپیہ
''چمکا تھا فقیروں کا مقدر اسی گھر میں''

افراد تھے پچیس ، غسلخانہ تھا بس ایک
لگتے تھے یونہی سینکڑوں چکر اسی گھر میں

نلکے تھے رواں ایسے کہ تھمتے نہ تھے اک پل
بجتے تھے صبح و شام کنستر اسی گھر میں

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

کپڑوں کی گرہیں روکتی تھیں آبِ رواں کو
رکتے نہ تھے ہرگز کبھی ''شاور'' اسی گھر میں

آجاتے تھے ہر ماہ کرائے کو بڑھانے
کر جاتے تھے مالک ہمیں ششدر اسی گھر میں

تھا صاحبِ خانہ کو ادب سے بھی لگاؤ
ہر سمت سے آتے تھے سخنور اسی گھر میں

بجتی جو کبھی بزمِ سخن نیچے کے گھر میں
اشعار سنے جاتے تھے اوپر اسی گھر میں

# ماڈرن ایکٹریس وائف

نہ تُو ''سِٹ کام'' کرتی ہے، نہ گھر میں کام کرتی ہے
زیادہ تر تُو اپنے رُوم میں آرام کرتی ہے
تُو ''بیوٹی پارلر'' میں دوپہر تا شام کرتی ہے
گزرتی ہے جہاں سے تُو ٹریفک جام کرتی ہے
جو میں ٹوکوں تُو انگریزی میں دیتی ہے مجھے گالی
میں اُردو بولنے والا تُو انگلش بولنے والی!

ترے ''فادر'' سے ڈرتا ہُوں ''مدر'' سے خوف کھاتا ہُوں
وہ انگلش بولتے ہیں ، میں یونہی گردن ہلاتا ہُوں
اگر وہ مسکراتے ہیں تُو میں بھی مسکراتا ہُوں
وہ جب جوتا اُٹھاتے ہیں تُو میں سر کو جھکاتا ہُوں
مجھے لگتا ہے میں اُلٹا بنا ہُوں ان کا سسرالی
میں اُردو بولنے والا تُو انگلش بولنے والی!

تجھے جب ''پین'' ہوتا ہے مجھے بھی درد ہوتا ہے
زیادہ درد بڑھ جائے تُو چہرہ زرد ہوتا ہے
دُکھی خاوند بھی سوسائٹی کا فرد ہوتا ہے
کوئی سالی نہ ہو تو بہنوئی کیا مرد ہوتا ہے
نہ جانے دِل کے صحرا میں اُگے گی کب یہ ہریالی!
میں اُردو بولنے والا تُو انگلش بولنے والی!

رقیب رُو سیہ تیری مجھے انگلش لگے خانم!
تُو گو تُو ''ہیل'' کہتی ہے میں گھر آ جاتا ہُوں جانم!
خجالت سے مرے اُردو نما رُخ پر ''نمی آنم''!
''زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم''!
بہت ناصف نے انگلش ''میڈ'' یہ تقریر فرمائی
یہ اُردو بولنے والا ، تُو انگلش بولنے والی!!

عبدالحکیم ناصف

# ادھیڑ عمر کا خواب

ڈھلتے شباب کی یہ حکایت ہے دوستو!
شوال کے مہینے کی دُھرپت ہے دوستو!

اِک "نوجواں" تھا شہر میں "چالیس سال" کا
شادی کا اُس کے سینے میں ارمان تھا بڑا

شوال کا مہینہ جب آیا تو خوش ہُوا
بے تاب ہو کے کرنے لگا ماں سے اِلتجا

امّاں مری بھی جلد ہی شادی کراؤ نا!
گھر میں بہو کو لانے کا چکّر چلاؤ نا!

ماں نے کیا نہ بات کا اُس کی کوئی خیال
بیٹے کو بے خیالی پہ بے حد ہُوا ملال

ماں نے جو ترچھی آنکھ سے دیکھا اُسے بدحال
تو مسکرا کے پیار سے بولی کہ میرے لال

شادی تری کروں گی میں فوراً سے پیشتر
جلوے کے بدلے حلوے پہ کچھ دن گذارہ کر

بیٹا! مزے سے بیٹھ کے حلوہ اُڑائے جا
چمچا پکڑ پلیٹوں کے چھکّے چھڑائے جا

بولا وہ "ینگ مین" میں کچھ جانتا نہیں
جلوے کے آگے حلوے کو گردانتا نہیں

شادی کو "پوس پون" نہ کر اب تو میری ماں!
اِک سال بعد پھر ہو خدا جانے کیا سماں

جب حد سے بڑھ رہا ہو تمنا کا "ایزی لوڈ"
لازم ہے عقد سے ہی یہ عقدہ کرو "ڈی کوڈ"
ہر خوان اس مہینے میں ہوتا ہے دستیاب
شوّال شادیوں کا مہینہ ہے لاجواب
شادی نوید لاتی ہے فصلِ بہار کی!
شادی شدہ پہ رحمتیں پروردگار کی!
القصہ! ماں نہ رام ہُوئی وہ نہ سو سکا
"سیتا" کا ایسا شوق تھا وہ جاگتا رہا
ماں کا تو "رضیہ بٹ" کی کہانی تلک تھا ذوق
بیٹے کا "فیس بک" سے سِوا ہو گیا تھا شوق
جب نیند آ گئی تو حسیں خواب آ گئے
رنگین، دلربا سے مناظر دِکھا گئے
شادی ہی ایسے روگ کا واحد تھا ایک حل
"تھیوری" کے بعد چاہیئے لازم "پریکٹکل"
کوئی کنوارہ بھوت بھی اُس پر سوار تھا
غصہ بھی امّی جان پہ اُس کو ہزار تھا
ماں سے وہ اِتنی بات پہ کر بیٹھا سرد جنگ
گھر چھوڑ کر چلا کہ "مری" میں تھی اُس کی "منگ"
تنہا تھی اپنے گھر پہ وہ بھی اِتفاق سے
آتے ہیں ایسے لمحے کبھی اِتفاق سے!
بیٹھی تھی پان، گنگا فروزاں کیے ہوئے
"جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے"
لُوٹا چمن اس کا بھی موجِ بہار نے
گھائل کیا تھا "میڈیا" کے "میڈوار" نے
فصلِ جنوں اُدھر بھی تھی پوری پکی ہُوئی
"دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہُوئی"

وہ بھی تھی تیس سال سے بحرف اُسکی منتظر
ایسے میں ہو گئی تھی "سنو فال" بے اثر
چلنے کو ساتھ اُسکے وہ بیباک ہو گئی
اور پاک سرزمین میں ناپاک ہو گئی
پھر دِل کے فیصلے کو نہ سوچا دماغ سے
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کر چراغ سے"
لڑکی بھگا کے ریشماں کا لال آ گیا
مرحوم کا خیال بہر حال آ گیا
ہر سمت جبکہ پھیل گیا نورِ ماہ تاب
ماں نے کہا ڈپٹ کے ابھی چھوڑ گھر شتاب
شادی تری میں جلد ہی اس سے کراؤنگی
اس کو تُو چھوڑ آ، میں تجھے پھر بتاؤنگی
لیکن کہاں تھی اُنکے لیے واپسی کی تھاں
وہ تو جلا کے آئے تھے ساحل پہ کشتیاں
اُلفت میں کام بے کسی ، یا بُزدلی کا کیا!؟
سر دیجے اوکھلی میں تو ڈر مُوصلی کا کیا!؟
اِتنے میں ایک شور ہُوا ، اُٹھ ارے کمال!!
مرحوم باپ کی او پسر! "شاپ" دیکھ بھال
"بزنس" میں "اِنٹریسٹ" ترا کیوں ابھی نہیں
بھتّے کی پرچیاں تو نہیں آ گئیں کہیں؟
اُٹھا وہ ہڑبڑا کے ارے کیا عذاب ہے؟
امّاں کی گالیاں ہیں وہی اِضطراب ہے
خوشبو ہے اور کہیں نہ معطر گلاب ہے
قسمت کا "آف" اب بھی وہی آفتاب ہے
ناصفؔ ادھیڑ عمر کا عہدِ شباب تھا
عمران خان جیسا کوئی انقلاب تھا

مثلث ، مسدس ، مربع بنوں گا
بنائے گا جو میرے ربا بنوں گا
پہ اگلے جنم میں نہ ابا بنوں گا
مسائل تمھیں دوستو کیا بتاؤں
''کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں''

انھیں دال روٹی میسر نہیں ہے
مہینوں میں بوٹی میسر نہیں ہے
بدن پر لنگوٹی میسر نہیں ہے
تو ہی اب بتا ان کو کیسے پڑھاؤں
''کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں''

سنبھلتے نہیں اپنے شیطان بچے
اور اُوپر سے آئے ہیں مہمان بچے
ذرا آ کے اپنے تو پہچان بچے
جو باقی بچیں گے میں اُن کو سُلاؤں
''کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں''

مرے پیٹ پر ایک لیٹا ہوا ہے
تو دوجے کو میں نے لپیٹا ہوا ہے
یہ آواز آئی کہ بیٹا ہوا ہے
بیک وقت میں تین جھولے جھلاؤں
''کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں''

گئے وقت میں کس قدر تھا توانا
کوئی پوچھتا ہی نہ تھا آنا جانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
نصیبوں پہ اپنے میں آنسو بہاؤں
''کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں''

# نان گوشت

ڈاکٹر نشتر امروہوی

جب بھی ہمارے سامنے آتا ہے نان گوشت
خوشبو سے اپنی دل کو لبھاتا ہے نان گوشت
ایسا دل و دماغ پہ چھاتا ہے نان گوشت
کھانے میں چار چاند لگاتا ہے نان گوشت

یوں تو مٹن ہے اور چکن بے حساب ہے
کھانے میں نان گوشت مگر لاجواب ہے

روغن میں تیرتی ہوئی بوٹی کا بانکپن
چلمن سے جھانکتی ہو کوئی جیسے گل بدن
ڈکری کی بوٹیوں میں ہے ایسا لجیلا پن
گویا حیا سے جھینپ رہی ہے کوئی دلہن

ڈونگے سے جب پلیٹ میں آتی ہیں بوٹیاں
بوڑھوں کو بھی جوان بناتی ہیں بوٹیاں

روٹی نکالتے ہوئے کانٹوں کی وہ کھنک
تندور کے دھوئیں میں بسی نان کی مہک
حوریں بھی تھیں فراق میں پانے کو اک جھلک
روٹی کو صرف دور سے تکتے رہے ملک

مہندی سے سرخ ہاتھ پہ ایسا گمان تھا
گویا کہ شیرمال کے قبضے میں نان تھا

وہ نان جس کے سامنے پھیکا پڑے کنول
وہ جس کے آگے میلا لگے مرمری محل
یہ چودھویں کا چاند بھی اس کا نہیں بدل
شاعر بھی اس کو دیکھ کے پڑھنے لگے غزل

یہ نان کب ہے یہ کسی شاعر کا خواب ہے
جو بھی ہے یہ خدا کی قسم لاجواب ہے

موقع کسی کی موت کا ہو یا خوشی کا ہو
چہلم کسی کا ہو یا عقیقہ کسی کا ہو
تیجا کسی ولی کا ہو یا بدعتی کا ہو
کھانا وہ مبتدی کا ہو یا منتہی کا ہو

اللہ میزبان کو اتنا شعور ہو
کھانے میں نان گوشت بھی شامل ضرور ہو

چاہے کڑاہی گوشت ہو اسٹو ہو یا مٹن
دل بھر گیا ہے روز ہی کھا کھا کے اب چکن
دوپیازہ کھا رہے ہیں تو ماتھے پہ ہے شکن
کھائیں اگر نہاری تو سینے میں ہو جلن

بریانی دیکھ دیکھ کے گھبرا رہے ہیں لوگ
دعوت میں نان گوشت ہی بس کھا رہے ہیں لوگ

سیاست گر ہمارے کب کسی کے یار ہوتے ہیں
انہیں کیا فکر گر رُسوا سرِ بازار ہوتے ہیں

الیکشن سر پہ آجائیں تو یہ ہشیار ہوتے ہیں
وگرنہ پانچ برسوں تک یہ بس "مُردار" ہوتے ہیں

یہی دیکھا ہے جیسے ہی یہ منصب دار ہوتے ہیں
انہیں یہ بھول جاتے ہیں جو واقف کار ہوتے ہیں

ہو بندر بانٹ کرسی کی یا ناجائز کمیشن کی
تہ زیرِ غور اپنے گھر ہی کے دو چار ہوتے ہیں

اگر پوری نہیں پڑتی ان کی اس طرح یارو
یہ بھتّے اور "ہفتے" میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں

کبھی اک سمت تو رہتا نہیں ہے قبلہ و کعبہ
حکومت کے کبھی حامی کبھی اغیار ہوتے ہیں

نکل آتے ہیں کابینہ سے اکثر روٹھ کر لیکن
پلٹ کر دو دنوں میں حاضرِ دربار ہوتے ہیں

سیاست کے لیے لازم نہیں ہے دین یا ایماں
ہوا کا رُخ جدھر کو ہو اُدھر پتوار ہوتے ہیں

نہیں ہے عار تلوے چاٹنے میں بھی ذرا ان کو
ضرورت ہو تو خادم کے بھی خدمتگار ہوتے ہیں

ہوں ایوانوں میں مجرے، تو لگاتے ہیں وہاں ٹھمکے
اسمبلی میں مگر جائیں تو "مکھی مار" ہوتے ہیں

الکشن جیتنا ہی آخری منزل نہیں ہوتی
وزارت کے لیے بھی یہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں

فقیرالدین کا ہے حال پتلا امیرالدین موٹا ہو رہا ہے (مجید لاہوری)

کسی ہوٹل میں دو احباب کھانا کھانے والے تھے
پھر اس کے بعد پکچر دیکھنے کو جانے والے تھے

نظر اِتنے میں باب الداخلہ پر اُٹھ گئی اُن کی
پریشانی سے حالت دید کے قابل ہوئی اُن کی

نظر آئیں اُنہیں دو لڑکیاں جو خوبصورت تھیں
لباسِ چست میں ملبوس گویا اِک قیامت تھیں

کہا اِک نے کہ بھاگو ورنہ اِک بھونچال آئے گا
اوراس کے ساتھ ہی آج ایک بھانڈہ پھوٹ جائے گا

مری محبوبہ ہے مدت سے وہ جو پہلی لڑکی ہے
جولڑکی ساتھ ہے اس کے وہ ظالم میری بیوی ہے

یہ سُن کر دوسرا بولا ''مجھے بھی ہے پریشانی!''
''چرا کارے کند عاقل کہ باز آئد پشیمانی''

جو پہلی لڑکی اُن دونوں میں ہے وہ ہے مری بیوی
اور اس کے ساتھ جولڑکی ہے وہ محبوبہ ہے میری

# تین بڑوں کا خواب

شاہد عدیلی

ایک محفل میں روز ولٹ، چرچل
کر رہے تھے بیان خواب اپنا
روزولٹ نے کہا کہ اللہ نے
مجھ سے وعدہ کیا کہ جا تجھ کو
میں بنا دوں گا صدر دنیا کا
سُن کے چرچل ہوا بہت بیتاب
کہا اُس نے کہ ''ہاں کچھ ایسا ہی
رات میں نے بھی خواب دیکھا ہے
اُس کا وعدہ ہے ساری دنیا کا
آج سے میں ''وزیرِ اعظم'' ہوں''
کر چکے خواب جب بیاں دونوں
روس کا مردِ آہن اسٹالن
مسکرا کر کہا یہ دونوں سے
''تم بڑے لوگ ہو بڑے جھوٹے
میں نے کب تم سے ایسا وعدہ کیا؟''

# تحفہ

شہباز چوہان

سوچ سوچ کے پاگل ہوتا جاتا ہوں
اپنی دوست کو میں کچھ دینا چاہتا ہوں

بیٹا وہ دِکھنے میں کیسی لگتی ہے
گال گلابی پھولوں جیسی لگتی ہے

چلتے سرو کو اُس کی ادائیں کہہ لینا
تم اُس کی زلفوں کو گھٹائیں کہہ لینا

آنکھوں کی تمثیل سمندر دے دینا
بیٹا اُس کو میرا نمبر دے دینا

روبینہ شاہین بینا

وہ کہتے ہیں
دسمبر آگیا ہے پھر
تمھیں تو شاعری کا خبط خاصا ہے
بہت سے شاعروں کی
اُن کتابوں کو بھی تم نے چاٹ رکھا ہے
جو اُن کے پاس ہوں گی
یا فقط تم نے خریدی ہیں
یہی سب نے لکھا ہے گا
دسمبر تو ازل ہی سے
محبت کرنے والوں کے لئے
اِک استعارہ ہے جدائی کا
سو جانِ من!
اجازت ہے
اگر چاہو تو یہ سارا مہینہ اپنے میکے میں گزار آؤ!

# نایاب مولوی اور وکیل

عورت نے یہ گلہ کیا جنت کے چیف سے
اس کے پیا کو اس کا بنایا نہیں ابھی
اس نے کہا میں راضی ہوں اُن کے نکاح پر
جنت میں مولوی کوئی آیا نہیں ابھی

برسوں کے بعد چیف نے آ کر اسے کہا
آ جائیں بی بی آپ ابھی میرے ساتھ ہی
میں آپ کا نکاح کراتا ہوں آج صبح
جنت میں ایک مولوی آیا ہے رات ہی

بد قسمتی سے شادی کے چھ ماہ بعد ہی
شوہر سے پیدا ہو گیا اس کا بڑا نفاق
تنگ آ کے بی بی پھر بھی اسی چیف کے حضور
کہنے لگی کہ اب مجھے دلوایئے طلاق

غصے میں چیف بولا یہ سُن کر مطالبہ
رکھتا ہوں التواء میں یہ مِس آپ کی اپیل
برسوں میں عقد کے لئے ڈھونڈا تھا مولوی
اب میں طلاق کے لئے ڈھونڈوں کہاں وکیل

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

# ساس اور بہو کی ڈیمانڈ

میں نے پوچھا ساس کو کیسی بہو کا شوق ہے؟
ہنس کے بولی خوبصورت، خوب سیرت ،مالدار

ہر سلیقہ اپنی گھرداری کا آتا ہو اُسے
گھر کے کاموں میں لگی رہنے کا جس کو ہو شعار

کپڑے دھونا،جھاڑو دینا اور برتن مانجھنا
گھر کے ان کاموں کو کرنے سے ملے جس کو خمار

صابر و شاکر ہو، میری بات کو سہہ لے سدا
غصہ آنے پر نکالوں جس پہ میں دل کا غبار

جانتی ہو اپنے رشتوں کا نبھانے کا ہنر
اپنی نندوں کے مزاجوں کو جو رکھے خوشگوار

سُن کے ماں کی بات میں نے اس کی بیٹی سے کہا
تم کو اپنی ساس کیسی چاہیے ، جانِ بہار؟

بیٹی بولی ایک ہی سادہ سی خواہش ہے مری
مجھ سے پہلے جا چکی ہو ساس اس دنیا کے پار

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

کہتی ہے اے ریاضؔ درازی یہ ریش کی
ٹٹی کی آڑ میں ہے مزا کچھ شکار کا
(ریاضؔ خیرآبادی)

# محبت اور زندگی
# کی تین نظمیں

دوست
بھی
اب تجھ سے زیادہ
بلڈ پریشر
اور
شوگر لیول کا پوچھتے ہیں

سوری
جان
بہت لیٹ خیال آیا تمھیں
اصل میں والدین کو تو
ہم نے راضی کر ہی لینا تھا
اب
بچوں سے
کون بات کرے

پلٹنا بھی
ممکن نہیں
بند گلی میں بھی داخل ہو گئے ہیں
لگتا ہے
اب کسی گھر میں
گھس کر
کوٹھا ہی ٹپنا پڑے گا

# منتشر نگار

تم نے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر
خلاف فطرت
رنگوں کی تابڑ توڑیوں سے
بھیانک شیڈ کی بدنمائی پھیلا کر
کریہہ الخلقت پس منظر کے کینوس پر
دو تین عشروں کے دوران
جتنی بھی لفظیاتی تصویروں کو نثر پاروں کا نام دے رکھا ہے
اگر مستقبل قریب یا دور میں
کوئی محقق
نثری بحور اور اوزان کی بھی
دریافت کو ایجاد کرنے اور ان کے اصول وضع کرنے میں کامیاب ہو گیا
تو یاد رکھنا
وہ سب سے پہلے
تمھارے تمام ورجنوں نثر پاروں کو
بیک جنبش قلم
اوزان سے ساقط اور بحور سے خارج قرار دے گا
یاد رکھنا
نثری عروضیوں کے ڈان
آئندہ کے ادبی افق پر تسلط کی منصوبہ بندیوں میں
ایک خفیہ مقام پر
کئی برسوں سے سر جوڑے
اپنا پیپر ورک بڑی سرعت سے مکمل کرنے میں مصروف ہیں
ہو سکے
تو تم جلد از جلد
اپنے تمام نثری کچرے کا بیمہ کرا لو

# ڈاکٹر عزیز فیصل

نوید ظفرؔ کیانی

اِک شاعرِ خوش رنگ ہے موجود یہاں بھی
نالاں ہے بہت جس سے بشیراں کا میاں بھی

اِس طور سُناتا ہے بشیراں کے فسانے
کھل اُٹھتا ہے بُھٹے کی طرح پیرِ مغاں بھی

ہر سمت ہے پھیلی ہوئی چہکار اِسی کی
ایف بی پہ تو سمجھو کہ یہاں بھی ہے وہاں بھی

یہ سب کو کھلا دیتا ہے اشعار کے پائے
گو شہرِ سخن میں نہیں پھجے کی دکاں بھی

لے جاتا ہے ہر روز ہمیں سیر کی خاطر
شوخوں سے ٹھساٹھس ہے جہاں شہرِ بُتاں بھی

آ جاتی ہیں کُڑیاں بھی دبے پاؤں کہیں سے
سیلفش نہیں ہوتا کبھی سیلفی کا بیاں بھی

بھاتے ہیں بہت یوں بھی چول سارے جہاں کے
سب مل کے بناتے ہیں اِسے قہقہہ داں بھی

آئینہ دکھاتا ہے مگر دیکھتا بھی ہے
خود اپنا ہدف بھی ہے یہ خود تیر و کماں بھی

ہم سب کو سُنائے چلا جاتا ہے مسلسل
بیوی کی حکایت "میاں والی" کا جواں بھی

# جب لاد چلے گا بنجارہ

تو جرنل نہ لے جرنل کو
کمزور سمجھ نہ کرنل کو
تو کتنا بگ منسٹر ہے
اوقات پتہ ہے میجر کو
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا
**جب لاد چلے گا بنجارہ**

خود ہو کے پیدا کرنا ہے
خود کھود کے پانی پینا ہے
ایوان بالا ،زیریں کی
یہ کابینہ نابینا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا
**جب کوئی رہے گا نہ چارہ**

تو کہتا جس کو ٹیڈی ہے
وہ اپنے باپ کا ڈیڈی ہے
مایوس ولد و والد سی
اک سی ون تھرٹی ریڈی ہے
سب ٹھاٹ پڑا رہجاوے گا
**جب آ کے رکے گا طیارہ**

یہ سالا سالی دیور بھابھی
ساڑھو سمدھی بیٹا بھی
جو بن کے خدا سے بیٹھے ہیں
ایواں کے اندر باہر بھی
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا
**جب "بوٹ" بڑھے گا دوبارہ**

# سیاست کی کہانی

انجینئر عتیق الرحمٰن

یہ کہانی سیاست کی ہے
اس کے کردار کھوٹے ہیں سب
بولتے ہیں روانی کے ساتھ
مدتوں کے یہ گھوٹے ہیں سب
کہتے ہیں ہم وفادار ہیں
جب پڑے وقت لوٹے ہیں سب
قد بڑھائے ہیں سب نے بہت
جب کرو غور چھوٹے ہیں سب
بے حسی ان میں بے انتہا
مال کھا کر وہ لوٹے ہیں سب
شیر ہیں سامنے جب عوام
فوج ہو تو بلوٹے ہیں سب

بات جاری ہے میری ابھی
کیوں خفا مجھ سے ہوتے ہیں سب

ہے عجب اب سیاست کا حال
جن کو دیکھو وہ جھوٹے ہیں سب
بن گیا ہے جب اگلا پلان
جیل سے تب وہ چھوٹے ہیں سب
ان کی جیبوں میں جو نوٹ ہیں
ملک ہی سے وہ لوٹے ہیں سب
آ گیا وقت جب فوج کا
جو بھی تھے خواب ٹوٹے ہیں سب
بات سچی کہی ہے جناب
پھر وہ کیوں مجھ سے روٹھے ہیں سب
ان کا دل تو بدل دے خدا
اس زمیں کے وہ بوٹے ہیں سب

# مجموعۂ کلام

اسد قریشی

**شاعری** اُردو ادب کی وہ صنف ہے جس سے کم و بیش سبھی کا کسی نہ کسی طرح واسطہ رہا ہے، بلکہ اگر یوں کہوں کہ انسان کی زندگی میں جیسے موسم گزرتے ہیں گرمی، سردی، خزاں، بہار ایسے ہی ایک موسم شاعری کا بھی آتا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ عمر کے ایک مخصوص حصے میں تقریباً ہر انسان ہی اس کی طرف راغب ہوتا ہے، خواہ وہ شاعری پڑھے یا از خود پامالی جذبات کا بدلہ لے، لیکن رغبت ضرور ہوتی ہے۔ سو ہمیں بھی اس موسم سے گزرنا پڑا، پر صاحب ہم اس موسم سے کیا گزرے کہ گزر ہی گئے یعنی ہم نے تو اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنا لیا۔ لیکن ہم پر یہ موسم ذرا دیر سے وارد ہوا۔ اس شوق میں پہلے تو بہت شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام اُٹھا لائے۔ دن ہو کہ رات، بس اِسی میں غرق ہیں، نہ کھانے کی فکر ہے نہ سونے کا پتہ، نہ دن کی خبر ہے نہ رات کا ہوش ہم ہیں اور شاعری کی کتابیں۔

جب اس پر بھی بس نہ چلا تو ہم نے انتقام کا ایک اور راستہ تلاش کر لیا۔ اب ہم نے خود شعر گوئی شروع کر دی۔ جہاں جگہ ملی وہیں شعر لکھ مارا اور کوئی سُنے نہ سُنے آپ ہی واہ واہ کیے جاتے۔ جب کچھ سیر حاصل کلام لکھ لیا تو سوچا کہ بھئی کوئی داد دینے والا بھی تو ہونا چاہیے، تو دوستوں کو شعر سنانے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوستوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی چلی گئی۔ ہم نے سوچا شائد ہماری نگارشات کی تاب نہ لا کر ہم سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں سو اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

ایک روز ایسے ہی احباب کی محفل میں بیٹھے تھے کہ ایک منچلے نے مشورہ دیا کہ بھائی اس قدر خوبصورت شاعری کرتے ہیں آپ اپنا مجموعۂ کلام کیوں شائع نہیں کرواتے تاکہ اہلِ دنیا کو بھی پتہ چلے کہ دستِ قدرت نے اُنہیں کس قدر عظیم شاعر عطا کیا ہے۔ یہ سُن کر ہمارا سینہ کچھ چوڑا ہو گیا لیکن پھر کچھ شاعرانہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے ہم نے کہا کہ بھئی اس جھنجھٹ میں کون پڑے۔ اب پہلے کتاب شائع کرانے کا مسئلہ پھر اس کی پبلیکیشن، ڈسٹری بیوشن، ہم کہاں گلی گلی اپنا کلام بیچتے پھریں گے؟

اُن صاحب نے بڑے جوش سے کہا ''ارے میاں آپ کیوں فکر کرتے ہیں، آپ صرف اپنا مسودہ مرتب کریں، باقی سب کام ہو جائے گا۔''

تو جنابِ عالی، ہم جٹ گئے اپنا کلام مرتب کرنے میں۔ دن رات ایک کر کے کوئی دو سو غزلیں اور پچاس نظمیں اپنے مسودے میں شامل کیں اور حضرت ''داغ'' کی خدمت میں پیش کر دیں۔

مسودہ دیکھ کر جناب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ''صاحب دیکھیں ابتدا میں آپ کو کچھ اشاعت و طباعت کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا اور جیسے ہی کوئی ڈسٹری بیوٹر مل گیا تو سمجھو آپ کی رقم واپس آپ کی جیب میں۔''

ہم نے کہا ''بھئی کل ملا کر کتنا خرچ بیٹھے گا؟ کچھ تخمینہ تو لگایا ہی ہوگا آپ نے!!''

کہنے لگے ''دیکھیں، آپ کی کتاب میں کم و بیش دو سو صفحات ہوں گے، سرِ ورق اور جلد ملا کر سمجھیں کہ ۱۰۰ روپے کی کتاب پڑے گی آپ کو، جو کہ با آسانی دو سو روپے کی ڈسٹری بیوٹر کے ہاتھ چلی جائے گی اور اگر میں کم سے کم بھی کروں تو کم از کم ۵۰۰ کاپیاں تو ضرور شائع کرنی پڑیں گی، تبھی مارکیٹ میں نام ہو

ایک شاعر نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "میں کیوں زندہ ہوں۔"
شاعر نے یہ نظم ایک رسالے کو پوسٹ کر دی۔
چند ہفتوں بعد شاعر کو ایڈیٹر کا جواب ملا، جس میں لکھا تھا "کیوں کہ آپ نے یہ نظم ڈاک سے بھیجی ہے، خود لیکر آتے تو زندہ نہ رہتے۔"

سکتا ہے اور کتاب تیزی سے نکل سکتی ہے۔ اب ۵۰۰ کاپیوں کا مطلب ہے کل ملا کر کوئی پچاس ہزار کا خرچ ہے۔ آپ دیکھ لیں، جتنی جلد آپ اس رقم کا بندوبست کر دیں گے، میں کام شروع کر دوں گا۔"

یہ کافی مشکل مرحلہ تھا، پچاس ہزار کی رقم کافی ہوتی ہے اور محض اپنے شوق کی خاطر لگانا کافی سے زیادہ دشوار بھی۔

تین دن لگاتار سوچنے کے بعد ہم نے ایک چیک پھاڑ کر پرنٹر کو دے دیا اور اشاعت کا کام شروع ہو گیا۔

شروع نے تو صاحب نے ہمیں ایک ہفتے کا وقت دیا تھا لیکن چار ہفتے گزر جانے کے بعد حضرت ایک روز وارد ہوئے اور فرمایا "وہ ایسا ہے کہ دیباچہ اگر کسی بڑے شاعر سے لکھوایا جائے تو بہت اثر رکھتا ہے اور قارئین میں شاعر کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "تو یہ بڑا شاعر ہم کہاں سے لائیں، شاعروں میں تو ازل سے ساس بہو کی رقابت چلی آ رہی ہے، ایک دوسرے سے بلا کا بغض و عناد رکھتے ہیں، اور یہ بات کوئی آج کی تھوڑی ہے، یہ تو مرزا رفیع الدین سوؔدا سے لے کر غالبؔ اور غالبؔ سے لے کر مجروحؔ سلطان پوری تک جاری رہی ہے بلکہ آج بھی جاری ہے۔ وہ ثمینہ راجہ ہوں یا ناہید ورک، وصی شاہ ہوں یا فرحت عباس شاہ سب کے سب ۳۶ کا آنکڑہ ہیں۔"

صاحب من نے ہماری یہ مشکل بھی آسان کر دی، کہنے لگے "دیکھیں کچھ پیسے اور خرچ ہوں گے، میں ایک شاعر کو جانتا ہوں، وہ کچھ پیسے لے کر دیباچہ لکھ دے گا۔"

"کتنے؟"

بس یہی کوئی پانچ ایک ہزار، زیادہ نہیں۔"

ہم نے سوچا کہ جہاں اِتنا خرچہ ہوہی رہا ہے وہاں پانچ ہزار کا کیا منہ دیکھنا، سو ہم نے نے بات مان لی اُنہیں منظوری دے دی۔

اچھا تو جناب، دو ہفتے مزید گزر گئے اور صاحب ایک روز پانچ سو کاپیاں ہمارے مجموعۂ کلام کی لے کر حاضر ہو گئے۔ فوری طور پر تو ہم نے اُنہیں اپنے ڈرائینگ روم کی زینت بنایا اور آئندہ کا لائحۂ عمل اُن سے دریافت کیا۔

کہنے لگے "دیکھیں جی، میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟"

ہم نے سوچا کہ بھائی اتنی بڑی چپت تو لگا دی آپ نے، اب مزید اخلاص کا بھی مظاہرہ کریں گے آپ تو کیجئے۔

گرین سگنل ملنے پر بولے "آپ ایسا کریں کہ آرٹس کونسل میں اپنی کتاب کی تقریب رونمائی کا انتظام کر لیں بلکہ میں تو کہتا ہوں نصف سے زیادہ کتابیں تو وہیں ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں گی۔"

ہم نے ایک سرد آہ بھری اور اُس وقت کو کوسا جب ہم نے اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا قصد کیا تھا لیکن کیا کرتے، اب اوکھلی میں سر تو دے ہی چکے تھے سو ہم آرٹس کونسل بھی گئے، وہاں کے منتظمین سے مل کر ہم نے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

حضرت نے نہایت خوش مزاجی کا مظاہر کرتے ہوئے ہمیں کل تخمینہ بیان کیا "دیکھیں، دوسو پچاس فی کس خرچہ آئے گا، جس میں چائے، ناشتہ وغیرہ شامل ہے، اسٹیک اور بینر کے ہم پانچ ہزار روپے لیتے ہیں۔ آپ چونکہ نئے شاعر ہیں اور ادب کی خدمت کے خواہاں ہیں تو آپ سے رعایت کر کے ہم چار ہزار روپے ہی لے لیں گے۔ آپ کی تقریب میں کم از کم سو مہمان ہوں گے۔ آپ اگر اپنے مہمان بلانا چاہیں تو ان کا خرچا الگ سے دینا پڑے گا۔"

اب دوسو پچاس فی کس یعنی پچیس ہزار روپے یہ اور ۴۰۰۰ روپے اسٹیج کے، کل ملا کر ۲۹۰۰۰ کا خرچہ، ہماری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہم اُن سے صاحب سلامت کر کے جلد از جلد وہاں سے نکل پڑے کہ کہیں یہ یہاں بیٹھے اور مشورہ فیس بھی نہ مانگ بیٹھیں۔

خیر صاحب ہم نے بیسیوں ڈسٹری بیوٹرز کی منت سماجت کی

بلڈانہ کے آل انڈیا مشاعرے میں مالی گاؤں کے مترنم شاعر، ارشد مینانگری غزل سنا رہے تھے۔ غزل ختم ہونے کے بعد کچھ اور پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔ ارشد صاحب دوسری غزل سنانے لگے۔ پھر فرمائش ہوئی کہ انہوں نے پھر غزل شروع کردی۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے دوسرے شعرا اور اناؤنسر بہت پریشان ہوئے کہ کسی طرح یہ مائک چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اتنے میں مختار یوسفی کو شرارت سوجھی، انہوں نے ایک پرچی لکھ کر ارشد مینانگری کو تھما دی۔ ارشد مینانگری غزل ادھوری چھوڑ کر مائک سے ہٹ گئے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

دیگر شعرا نے مختار یوسفی سے استفسار کیا کہ آخر آپ نے پرچی میں کیا لکھ دیا تھا۔ مختار یوسفی نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ "میں نے صرف اتنا ہی لکھا تھا کہ "ارشد صاحب آپ کی پتلون پھٹی ہوئی ہے۔"

اور اُنہوں نے ہم سے کتاب کا نمونہ بھی لیا تا کہ مارکیٹ کا ردِ عمل معلوم کرسکیں پر اس کے بعد ہم ہی اُن کا پتہ معلوم کرتے رہ گئے، اس طرح ڈرائنگ روم کا بوجھ کچھ کم ہوا اور تقریباً چار سو کاپیاں رہ گئیں۔

ہمارا مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے، یہ خبر ہمارے خاندان میں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، نتیجے کے طور پر ہمارے بڑے بہنوئی صاحب ہم سے ملنے آئے۔ مقصد تو بظاہر اُن کا ہمیں مبارکباد دینے کا تھا پر انداز کچھ "پرسہ" دینے سے کم نہ تھا۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے پان کی فرمائش کردی تو ہم اُن کا پان لینے چلے گئے۔ پان کی دوکان سے ہم اُن کے لئے پان لے کر چلے تو پُڑیا پر نظر پڑی، ارے واہ کیا خوبصورت شعر لکھا تھا۔ ہم نے گھما پھرا کر باقیماندہ اشعار بھی پڑھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ یہ تو ہمارا اپنا ہی شعر ہے۔ اُلٹے پاؤں پان والے کے پاس واپس گئے اور اُس سے پوچھا "بھائی یہ جو آپ نے ہمیں جس کاغذ کی پڑیا دی ہے اس کے باقی صفحات بھی ہیں آپ کے پاس؟"

پان والے نے تبسم فرماتے ہوئے کہا "کیوں جناب؟ کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا بھائی کچھ شاعری کا شوق رکھتے ہیں اور اس پر کچھ اچھا کلام لکھا ہے تو سوچا کہ پڑھ کر دیکھیں۔

تبسم اب تمسخر میں تبدیل ہو گیا اور پان والا یوں گویا ہوا "بھائی چھوڑیں، کسی دو ٹکے کے شاعر کا کلام ہے، آپ پڑھ کے کیا کیجئے گا!"

ہم تو آگ بگولہ ہو گئے، پورا زور لگا کر حلق سے آواز نکالی اور کہا "جاہل انسان، تجھے کیا تمیز شاعری کی۔۔۔ پنواڑی ہے، پنواڑی ہی رہ، نقاد نہ بن۔"

پان والے کے تاثرات یکسر تبدیل ہو گئے۔ بڑے نرم لہجے میں بولا "صاحب آپ تو خواہ مخواہ یوں ناراض ہو رہے ہیں جیسے کہ یہ خود آپ کا ہی کلام ہو۔"

ہم نے اُسی غصے سے کہا "جی ہاں! یہ ہمارا ہی کلام ہے اور ہم ہی وہ دو ٹکے کے شاعر ہیں۔"

یہ سن کر تو پان والے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ہاتھ کسی خودکار مشین کی طرح دراز میں گئے اور باقی ماندہ کچھ صفحات بنا کچھ کہے ہماری طرف بڑھا دئے۔ ہم وہ صفحات لے کر اپنے گھر کو چل دئے۔ جس قدر خوشی اپنے مجموعۂ کلام کو دیکھ کر ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ افسوس اس کے انجام کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

خیر یہ چار سو کاپیاں چار ماہ تک ہمارے ڈرائنگ روم کی زینت بنی رہیں جس کے نتیجے میں ہمیں ہر روز اپنی والدہ سے صلواتیں مفت سننے کو ملتی رہیں۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد ہم نے ایک ردی پیپر والے سے ایک ہزار روپے میں سودا طے کر کے اس عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کی اور آئندہ شاعری نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا،

جب سے کمپیوٹر کے ساتھ کیمرہ فٹ کیا ہے، شیو باقاعدگی سے کرنے لگا ہوں، کیا پتہ کب "کسی" کی کال آ جائے۔

اعظم نصر

ارشاد العصر جعفری

# زمانہ ظالم ہے

تب ہم میٹرک سے تازہ بہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔ کوئی کام تھا ہی نہیں لہٰذا راوی نے قسمت میں چین ہی چین لکھ دیا تھا۔ چند دن تو پر لگا کر اُڑ گئے مگر پھر گھر میں دل نہ لگتا۔ سارا سارا دن فارغ رہ کر بوریت محسوس ہوتی۔ "کیا کروں؟" یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ ایک دن یارانِ محلّہ نے بزبانِ خاموشی نئی راہ سجھا دی۔ ہم نے دیکھا کہ دو بجتے ہی محلے کے نوجوان سج سنور کر گرلز کالج کے سامنے والے سٹاپ پر جا کر کھڑے ہو جاتے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ کہیں آنا جانا چاہتے ہوں گے مگر بعد میں کچھ اور ہی منظر دیکھنے کو ملے۔ ہوتا یوں تھا کہ انجمن کنوارگانِ محلّہ کے اراکین نے اپنی اپنی پسند کے برقعے منتخب کر لئے تھے (یاد رہے کہ آٹھ دس سال پہلے مظفرگڑھ میں برقعے کا استعمال عام تھا جب کہ اب نوے فیصد خواتین نے برقع ترک کر دیا ہے) برقعے میں کیا چھپا ہے، اس کی خبر بہت کم مجنوؤں کو تھی اور پھر بس کے آتے ہی ان کے پیچھے اسی دروازے پر لٹک کر کنڈیکٹر کی ہیلپ help کرنے لگتے۔ طرح طرح کی بولیاں بولتے، آوازیں نکالتے، شائد اِن لوگوں نے چڑیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اسی لئے ایک دوسرے پر چاہت کا اظہار کرنے کے طریقہ کو بغور یاد کیا ہوا تھا۔ تبھی تو چوں چوں کی بولی بخوبی ادا کرتے تھے۔

ہم نے "صراط العشق" پر چلنے کو کمر باندھ لی۔ ہماری ابتدائی تعلیم کے لئے وی سی آر کا کورس دستیاب تھا۔ ہم نے ایک ایک دن میں پانچ پانچ فلمیں دیکھ لیں۔ اس سے پہلے ہم ٹی وی ڈراموں کو فضول سمجھتے تھے۔ کبھی ڈرامہ غور سے نہیں دیکھا تھا مگر اب مزید پختگی کے لئے ہم نے ٹی وی ڈراموں سے بھی استفادہ کیا اور عشق کی خود ساختہ سند خود ہی حاصل کر لی۔ تھیوری مکمل کرنے کے بعد ہم نے میدانِ عشق میں قدم رکھ دیا لیکن ہم فرسودہ طریقے سے عشق کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مجنوں نے لیلیٰ کو دیکھا اور لا حاصل طریقے سے صحرا میں بھٹکنے لگا۔ فرہاد نے شیریں کی ایک جھلک دیکھی اور پہاڑ کھودتے کھودتے مر گیا۔ مردہ چوہا بھی نہ نکال سکا۔ رانجھے نے ہیر کے ماں باپ کی خدمت کے بجائے اُس کی بھینسوں کی خدمت کی مگر ہیر تو ہیر، اُسے ایک پاؤ دودھ بھی نصیب نہ ہوا۔ میں اُن جیسا نہیں تھا۔ راکٹ کے زمانے کی پیداوار، ہر کام تیز رفتاری سے کرنے کا عادی۔

بس جناب، ہم نے موٹر بائیک نکالی اور چھٹی کے وقت انجمن کنواراں محلّہ کے جملہ اراکین کے ساتھ بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ اِدھر ہر قسم، ہر سائز، ہر قد کے برقعے نکلے، اُدھر انجمن کے اراکین کے لبوں سے "ہائے ہائے" کی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے تیز نگاہوں

سے جائزہ لیا۔ بس میں سوار ہونے والیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کیونکہ ان میں کوئی بھی ہمارے معیار کے مطابق نہ تھی۔ ہماری نظریں ایک سوزوکی وین پر جم گئیں۔ اس پر موجود ہر ایک پر نگاہیں جمائیں اور ''یا مجنوں المدد'' کا نعرہ لگا کر اُن کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ ایک دن، دو دن اور پھر ہفتہ گزر گیا لیکن وہ شعلہ بدن متوجہ نہ ہوئی۔ تھک ہار کر ہم کسی اور کا انتخاب کرنا چاہتے تھے کہ ایک دن اُس کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کو اُس کے محلے تک پہنچانے پہنچے تو شریر ہوا کے ایک جھونکے کو ہم پر رحم آ گیا اور ہماری آتشِ شوق کو بھڑکانے کے لئے نقاب سے اٹھکیلیاں کرنے لگا۔ پل بھر کے لئے نقاب ہٹا اور ہمارے دل پر بجلی سی کوندی۔ ہم جو پہلے صرف آنکھوں پر مر مٹے تھے اب چہرہ دیکھا تو وہیں بے ہوش ہونے لگے۔ وہ تو فوراً خیال آ گیا کہ اگر موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئے تو پھر یہ بیچاری مہ وش شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جائے گی۔ سو اُس کی ہمدردی میں بے ہوش ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اُس مہ وش کا چہرہ اُس چاند کی مانند تھا جو بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہو۔ ایسا قیامت خیز حُسن ہمارے وطن میں بھی ہے، ہم نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ ناحق مصریوں کو سر پر بٹھائے ہوئے تھے۔

اس دن کے بعد تو ہم صبح و شام اُس کے محلے کے چکر لگانے لگے۔ خون کے بدلے صرف چائے پیتے اور وہ آئے گی، اس آس پر اُس کے محلے کے ہوٹل میں کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے۔ ہم ہوٹل میں اِتنی دیر تک بیٹھے کہ ہوٹل والے بھی جان گئے تھے کہ یہ بھی کوئی اولادِ مجنوں ہے۔

اس دن بھی اسکول کے قریب ٹی اسٹال پر بیٹھے کڑوی کسیلی چائے حلق میں انڈیل رہے تھے کہ چھٹی کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہمارے قبیلے کے تمام افراد اُٹھ کھڑے ہوئے، پیدل مجنوں بس اسٹاپ کی طرف اور ہم اپنی بائیک کی طرف لپکے۔ اسی لمحے وین چلنے لگی۔ ہم نے بھی بائیک اسٹارٹ کی اور وین کا تعاقب شروع کر دیا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ اُس سندر ناری کا ہاتھ کھڑکی سے باہر ہوا۔ وہ رومال نکال کر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ بطور نشانی اپنا رومال ہمیں دینا چاہتی ہے۔ محبت میں تحفہ لینا اور دینا جائز ہے۔

''تُف ہے ارشاد تم پر، تمھیں آج تک تحفہ دینے کا خیال نہ آیا۔'' ہمیں اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ ہم نے اب تک اسے کوئی تحفہ کیوں نہ دیا۔ ہمیں تو فلم ''چاندنی'' کا وہ گانا بھی یاد آ گیا جس میں ہیروئن کہتی ہے۔

''محبوبہ سے ملنے خالی ہاتھ نہیں آتے''

ہم نے فوراً گنگنانا شروع کر دیا۔

آج مگر بھول گیا رکھوں گا یہ کل سے یاد
میں نے اِس دل پر لکھ دیا تیرا نام
چاندنی او میری چاندنی

حقیقت میں ہمیں بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے بائیک کی رفتار تیز کی اور رومال اُچک لیا۔ ایک سُریلی سی چیخ اُبھری۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ خوشی کا اظہار ہے۔۔۔ ہم بائیک کی رفتار آہستہ کر کے مسکرا مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔۔ تبھی ہم نے دیکھا کہ سوزوکی رُکی اور اُس میں سے ایک مسٹنڈا اُترا جو یقیناً ڈرائیور تھا۔ اُس نے آتے ہی ہمارا گریبان پکڑ لیا اور بولا ''کیوں بے! یہ کیا حرکت تھی؟''

جناب! شائستہ انداز اختیار کریں۔ ''ہم نے احتجاج کیا۔

تبھی سوزوکی میں سے ایک آواز ابھری ''ارے۔۔۔ یہ تو شائستہ کا نام بھی جانتا ہے۔''

ہم سمجھ گئے کہ شائستہ اُس پری وش کا نام ہے۔ ہم جلدی جلدی بالوں کو سیٹ کرنے لگے اور یہ بھی بھول گئے کہ کسی نے ہمارا کالر پکڑ رکھا ہے۔

اُس نے جھٹکا دیتے ہوئے کہا ''کیوں بے! شائستہ کا رومال کیوں چھینا ہے تو نے؟''

اسی وقت سندر ناری بولی ''انکل مجھے زکام ہے، میں ناک پونچھ کر سُکھا رہی تھی کہ۔۔۔۔۔''

تب ہمیں احساس ہوا کہ رومال منہ پر پھیرتے ہوئے گیلا گیلا کیوں لگا تھا۔ پھر کیا ہوا مت پوچھیں کہ ''زمانہ ظالم ہے۔۔۔''

کائنات بشیر، جرمنی

# انوکھا لاڈلا

تم نے پکارا اور ہم چلے آئے
دل ہتھیلی پر لے آئے رے

لگتا ہے اماں اور ابا نے مل کر کوئی دوگانا گایا تھا جو میں چلا آیا۔ اور وہ میری زندگی کا پہلا دن تھا جب اس دنیا میں پہلی بار میں نے آنکھ کھولی تو خود کو ہسپتال میں پایا۔

یا اللہ خیر۔۔۔ یہ تیری اتنی بڑی دنیا چھوڑ کر میں یہاں کیسے آ گیا۔ میری پیدائش تو کسی ہل سٹیشن پہ ہونی چاہیے تھی۔ تا کہ آنکھ کھولتے ہی سرسبز رنگین نظارے، خوبصورت پہاڑ، بہتی آبشار، رنگ برنگے، نیلے، پیلے، کاسنی، لال، گلابی پھول، جھومتے بادل، اڑتی تتلیاں، چیچہا کرتے بھنورے نظر آتے۔ کائنات کی رنگینی میرے سامنے ہوتی۔ میں آتے ہی ایک گہری سانس لے کر کہتا،

"یا اللہ تیرا شکر، جو تو نے مجھے مسافر بنا کر اس دنیا کی ٹرین میں چڑھا دیا۔ اب یہ ٹرین ایکسپریس ہے یا پسنجر؟ یہ تو ہی جانے، آخر تو ہی تو اس کا ڈرائیور ہے اور اسے چلانے والا ہے۔"

اور خود مزے سے گانے لگتا،

بھنورے کی گنجھل اے میرا دل
کب سے سنبھالے رکھا ہے دل

لیکن ہوا یہ کہ قدم دھرتے ہی اگلے پڑاؤ پر خود کو ہسپتال میں پا کر میں تو بری طرح گھبرا گیا۔ کیا دنیا میں آتے ہی میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا یا خدانخواستہ اس ٹرین کا، جس میں بیٹھ کر میں آیا تھا۔ سفید دیواریں، سفید بستر، سفید اوور آل پہنے ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ بوائے۔۔۔!

یا اللہ، تیری اتنی بے رنگ دنیا،
(یا اللہ، میں کسی ودھوا آشرم میں تو نہیں آ گیا)

پھر اماں بھی بستر پر سفید لباس پہنے لحاف اوڑھے چت پڑی تھیں۔ جیسے کوئی جنگ ہار کر پڑی ہوں۔ البتہ ان کے ہاتھ لحاف سے باہر نظر آ رہے تھے۔ تبھی میں نے اپنی زندگی کا دوسرا رنگ دیکھا۔ اماں نے اپنے سانولے سلونے ہاتھوں پر لال رنگ کی نیل پالش لگا رکھی تھی۔ میں نے گھبرا کر اماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شکر ہے اماں نے کوئی میچنگ لپ اسٹک نہیں لگا رکھی تھی۔۔۔ ورنہ، انھوں نے سر پر سفید پٹی بھی باندھ رکھی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟ وہ کسی ہڑتال پر تھیں یا سوگ منا رہی تھیں یا ہسپتال والوں کے خلاف کوئی احتجاج کر رہی تھیں۔ ویسے خاصی نڈھال نظر آ رہی تھیں۔ ادھر میں سفید چڈی، سفید بنیان اور سفید کپڑوں میں لپٹا سفید منی بستر پر بڑا فکر مندی سے اماں کو دیکھ رہا تھا۔ یا اللہ، اماں بیمار شیمار ہیں یا ابا کو دکھانے کے لیے پٹی باندھ رکھی ہے۔۔۔؟

رات بیت چکی تھی۔ اچھا خاصا دن چڑھ گیا تھا۔ اچانک میں نے ایک نیا نظارہ دیکھا۔ شیشے والی کھڑکی کے پار دور کہیں دور اوپر ہی

اوپر آکاش پر ایک سفید رنگ کا چمکتا ہوا گولہ نمودار ہوا۔ جس سے میں نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے چاندی جیسی کرنیں نکل کر پھیلنے لگیں اور کمرے میں داخل ہوگئیں۔ لیجیے کمرا اور بھی چٹا، نوان نکور ہوگیا۔ میں ابھی اس عجوبے پر غور شور فرما کر اک خوشگواریت محسوس کر رہا تھا کہ وہی چلبلی سی کرنیں مجھ سے نظر چرا کر اماں کے چہرے پہ جا پہنچیں۔ اماں نے ان سے نظریں ملائے بغیر بیزاری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرا لوگوں سے بھرنے لگا۔

میں پریشان سا ہوگیا۔۔

"یا اللہ، ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں۔ جو چھ ضرب چھ میٹر کے کمرے میں گھسے چلے آرہے ہیں۔"

یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ خاندان کے لوگ تھے۔ اونچی نیچی ناکوں والے۔۔ اپنی اپنی دولتوں، جاگیروں پہ گھمنڈ کرنے والے، سوٹوں والے، پگڑیوں والے، اپنی اپنی انا کے اَلم اٹھائے، خواندہ، ناخواندہ، کاروباریئے، دوکانوں اور جابوں والے۔۔ میں حیران تھا کہ یہ سب ایک پلیٹ فارم پر کیسے اکٹھے ہو رہے ہیں۔

یا اللہ، کہیں قیامت تو نہیں آنے والی۔۔؟

خیر ایک بات اچھی ہوئی کہ ان کے آنے سے کمرے کی سفیدی نیا ک انگڑائی لی اور قوسِ قزح کے رنگ اس کے پیرہن پہ پھیل گئے۔ اماں کے بستر کے پاس ایک آنٹی کھڑی تھیں۔ وہ مجھے بہت بھائیں۔ اس نے آتشی گلابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ گلابی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگا رکھی تھی۔ بالوں کا خوبصورت جوڑا بنا رکھا تھا۔ اتنی صبح گجرے کہاں سے ملتے ورنہ وہ بھی بالوں میں اٹکا لیتیں تو قسم سے اور بھی فرسٹ کلاس چکا چک لگتیں۔ ان کا اہتمام سے تیار ہو کر آنا مجھے بڑا اچھا لگا۔ ورنہ باقی سب تو اپنی اوقات کے مطابق تیار ہو کر آئے تھے۔ میں ذرا ٹوہ میں ہوا تو پتہ چلا کہ ان خاتون کا نام شاہدہ ہے اور وہ اماں کی کسی پھپھی شپھی کی صاحبزادی ہیں۔ اس کی گود میں پانچ چھ ماہ کی بیٹی تھی۔ پنک فراک میں پنکی پنکی، جس نے اپنی خوبصورت چمکتی شربتی آنکھوں سے دو تین بار مجھے دیکھا۔ پھر سر اپنی ماں کے شانے پہ ڈال دیا۔ واللہ، اس کی اس ادا پر میں تو قربان ہوگیا۔

اب کمرا اصطبل کی طرح بھر چکا تھا۔ نقار خانے میں اتنی آوازیں گونج رہی تھیں کہ کان پڑتی آوازیں سمجھ سے باہر تھی۔ لوگ ابا سے ہاتھ ملا کر مبارکبادیں دے رہے تھے۔ گلے لگا کر ایک زور کی دھپ ان کی پشت پہ رسید کر رہے تھے۔ جیسے ابا نے کوئی میدان مارا ہو۔ خاندان کا نام مزید روشن کر دیا ہو۔ جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ سب میرے اولادِ نرینہ ہونے کی بدولت ہو رہا ہے۔ ابا کے فلک شگاف قہقہے چھت پھاڑے دے رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا انھیں ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ مل گیا ہے۔ ورنہ اگر میں صنفِ نازک کی صورت ہوتا تو اتنے فوری نوٹس پر نہ تو لوگ جمع ہوتے۔ اور سب کموں کاروں کے بہانے کھسکے رہتے کہ بھئی، دیکھ لیں جا کر بچی کو، بچی کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔۔! ادھر میں کسی مسکین کی طرح پڑی رہتی۔ لوگ باسی کڑھی کی طرح تیسرے، چوتھے، چھٹے روز مجھے دیکھنے آتے اور میری قسمت کا رونا رو کر جاتے۔ لیکن اب تو ان احباب کو سارے کام دھام جھام چھوڑ کر

برسات کا موسم تھا۔ یونیورسٹی میں چاروں طرف گھاس اگ آئی تھی۔ گھسیارے گھاس کاٹنے میں جتے ہوئے تھے۔
ممتاز شاعر پروفیسر مجنون گورکھپوری کی کلاس جاری تھی۔ ایک گھسیارن کلاس کے سامنے والے برآمدے سے گزری۔ طلبا کی نظریں لامحالہ اس کی طرف اٹھیں۔ مجنون نے بھی اس جانب دیکھا اور بے ساختہ بولے:
"یہ کون ہے؟"
ایک گوشے سے آواز آئی۔۔۔۔۔ "لیلیٰ گورکھپوری"
یہ سننا تھا کہ سارے کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔

بے اجازت جو مچاؤ تو بصد شوق مچاؤ غل مچانے کی اجازت نہیں دی جائے گی (عنایت علی خاں)

بھاگ بھاگ کر آنا پڑا۔ ورنہ وہ دوسرے لوگوں کے اس خدشے کا شکار ہو سکتے تھے کہ لڑکے کی پیدائش کا سنتے ہی جل گئے۔

ادھر اماں شلجم جیسا پھیکا چہرہ لیے بیمار پڑی تھیں اور لوگ انھیں مبارکباد دے رہے تھے۔ میں حیرانی سے دنیا کا چلن دیکھ رہا تھا۔ خیر جلد ہی پتہ چل گیا جب بیچ میں میرا ذکرِ خیر ہونے لگا۔ لوگ ایک دم میری طرف پلٹ آئے۔ اس ہجوم غفیر کو اپنی اور بڑھتا دیکھ کر میرے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔

"یا اللہ تیرا ہی آسرا، اس ہجوم کو ذرا بریکیں لگانا۔"

یہ پہلی دعا تھی جو میں نے مانگی تھی لیکن شائد قبولیت کا وقت نکل چکا تھا یا میں نے آتے ہی کوئی گناہ کر دیا تھا کہ وہ سب میرے سر پہ آن کھڑے ہوئے۔ ہر کوئی مجھے ایسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے پہلے کبھی اس دنیا کے نئے باسی کو نہ دیکھا ہو۔ اب ان کے ہونٹ بھی ہلنے لگے تھے۔ میں سمجھا اب یقیناً مجھے میری لمبی زندگی، خوشیوں، صحت، کامیابیوں، اچھا مسلمان، والدین کا فرمانبردار اور جورو کا غلام نہ بننے کی دعائیں ملنے لگی ہیں۔ لیکن کہاں جی، غالباً ان دعاؤں کا قابل بننے کے لیے پہلے میرا تیا پانچا ضروری تھا۔ سو سب نے مجھے کٹہرے میں کھڑا کر لیا۔ میرا ناک نقشہ جانچنے اور اس پر تبصرے کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ن لیگ اور پی ٹی آئی کی طرح دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک پارٹی مجھے کھینچ کر ابا کے خاندان میں لے جانا چاہ رہی تھی اور دوسری اماں کے۔۔۔!

اسی دوران بطور ثبوت ایک حضرت نے میری ناک کو ابا کے خاندان کے لیے گواہی بناتے ہوئے چھو لیا۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ مجھے جیسے پتنگے لگ گئے۔ میں نے غصے سے ان حضرت کو گھورا،

" کیا تمھیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے کہ نوزائیدہ بچے کو ایسے چھوتے نہیں ہیں۔ جراثیم لگ جاتے ہیں۔ انفیکشن ہو جاتا ہے۔ اور کیا تم مجھے جراثیم تحفے میں دینے آئے ہو۔؟"

میرا دل بے اختیار چاہا تھا کہ کاش اس وقت کوئی ڈاکٹر یا نرس پاس ہوتی اور ان حضرت کی اچھی خاصی کلاس لگتی تو میرے کلیجے کو ٹھنڈ پڑتی۔ خیر، یہ ادھار میں نے مستقبل کے لیے رکھ لیا۔

یا اللہ تیرا صد شکر، کہ تو نے مجھے ہیرو ٹائپ پیدا کیا تھا اس لیے

ایک دفعہ ایک مشہور شاعر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ انہیں بھی ساتھ لیا۔ ہوٹل پہنچ کر شاعر صاحب نے پوچھا: "کیا کھاؤ گے؟"
ان صاحب نے جواب دیا، "میں تو کھانا کھا کر آیا ہوں۔ اگر آپ اتنا ہی اصرار کر رہے ہیں تو دودھ پی لیتا ہوں۔"
چناں چہ انہوں نے اپنے لیے مرغی اور دوست کے لیے دودھ منگوایا۔ جب شاعر صاحب مرغی کھا چکے تو اس کی ہڈیوں پر زور آزمائی کرنے لگے۔ جب ہڈیوں میں سے کڑاک کڑاک کی آوازیں آنے لگیں تو ان کے دوست نے ان سے طنزیہ پوچھا، "آپ کے شہر کے کتے کیا کرتے ہیں؟"
شاعر نے اپنے کام کو بڑے اطمینان و سکون سے جاری رکھتے ہوئے کہا، "بھئی وہ دراصل دودھ پیتے ہیں۔"

مہربان چاہ کر بھی ہماری ذات کو رسوا نہ کر سکے۔ دل میں تو شائد کوئلہ شوئلہ ہو گئے ہوں گے۔ لیکن انھیں منہ دیکھے کی تعریف کرنا ہی پڑی۔ دنیا اپنی جیب میں دیکھ کر میں مسکرانے لگا تھا۔

اب لوگ ٹولیوں میں بٹ کر کمرے میں بکھر کر راز و نیاز کر رہے تھے اور میں اس دنیا کی دنیاداری سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کچھ عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ جیسے میں کسی کی نظروں میں ہوں۔ خود کو زمانہ حال میں رکھ کر میں نے ادھر ادھر دھیان شیان کرنا شروع کیا اور لوگوں کو بغور دیکھا تو وہ لڈو، گلاب جامن، چم چم کھاتے ہوئے اپنی ہی لن ترانیوں میں مصروف تھے۔ میرا نام رکھنے کے لیے مردوں اور عورتوں میں کانٹے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ میرے لیے اماں ابا کا منتخب کردہ نام مسترد کر کے ایک طرف رکھ دیا گیا تھا کہ یہ اولڈ فیشن ہے۔ اب خواتین، ڈائجسٹ، ناولوں، فلموں کے ہیرو ٹائپ نام اپنے خزانے سے نکال رہی تھیں۔ اور مرد صاحبان میرے لیے اسلامی، شہنشاہی، باوزنی نام رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔ ادھر اصلی حقدار اپنا حق گنوا کر تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہے تھے اور میں کسی گمنام شاعر کی طرح پڑا تھا۔

تبھی وہ راز کھل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک چچا میاں کی گود میں ان کی دو اڑھائی سالہ بیٹی سوار تھی، جو مڑ مڑ کر بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اس کا اورا۔۔ میرے اورا۔۔ سے آ کر مل گیا

تھا۔ جب میں نے اس کی یہ چوری پکڑ لی تو۔۔،

اس کی پہلی نظر پہ میرے ہوش اڑ گئے۔۔

دوسری نظر پہ میں شرما گیا۔۔

تیسری نظر پہ کچھ کچھ ہونے لگا۔۔

اور چوتھی نظر پہ۔۔

ٹھہرو، ٹھہرو، میرے دماغ نے دل کو کنٹرول کیا۔ میں غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ ریلوے کے کالے انجن سے نکلتے دھوئیں سے مشابہ رنگ، سیخ سلائی جتنی پتلی۔۔ ہونہہ، میرے لیے تم ہی رہ گئی ہو چمگادڑ کہیں کی،

میں نے اپنے دل کو لعن طعن شعن کی کہ ابھی سے اتنا پھسلنے کی ضرورت نہیں۔ شائد اسی لیے روزِ اول سے بچے کو نیک بننے کی دعا دی جاتی ہے۔ اور تم کیا کرنے چلے تھے۔ کچھ تو خاندان کی ناک کا خیال کیا ہوتا اے دلِ ناداں۔ تو، تو میرے لیے ابا کی چھترول کا بندوبست کرنے جا رہا تھا۔

اماں کی طبیعت واقعی ناساز تھی۔ سو رات کو مجھے بچہ وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ پر وہ رات میں نرسوں کی گودیوں کا مہمان بنا انھیں اعزاز بخشتا رہا۔ میں نے اماں سے دوری پر خوب رو رو کر بچہ وارڈ سر پر اٹھا لیا۔ کورس نغمہ گانے کے لیے باقی بچے اٹھ گئے۔ نرسوں میں ہلچل مچ گئی اور ڈاکٹر سے ان کی صحیح کلاس لگی۔ اور میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ دراصل مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں ہسپتال والے میری اماں کو نہ بدل دیں۔ میرے دھواں دھار احتجاج پر مجھے صبح ہی صبح اماں کے پاس بھیج دیا گیا۔

آج بھی اماں کو ملنے اور مجھے دیکھنے لوگ آتے رہے۔ وہ چمگادڑ آج بھی چلی آئی۔ آج وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی ماں باتیں اماں سے کر رہی تھی اور ٹکٹکی مجھ پر باندھے ہوئے تھی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔

یا اللہ تیری اتنی نظر باز دنیا،

کہیں مجھے اس کی نظر نہ لگ جائے۔ ویسے ممکن ہے یہ میرے لیے چمگادڑ کا رشتہ لائی ہو۔۔!

اب ہسپتال سے میرا دل اوب رہا تھا۔ میں گھر جانے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ آخر جا کر دیکھوں تو سہی کہ ابا نے میرے لیے کیا محل چوبارے کھڑے کیے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ابھی گھر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ شائد ان کا بھی ہم سے دل لگ گیا تھا۔

چوتھے روز ایک بار پھر وہ آنٹی فرسٹ کلاس چلی آئیں۔ آج بھی وہ بہت اچھی طرح تیار شیار ہو کر آئی تھیں۔ مالٹے رنگ کی ساڑھی، اسی رنگ کی لپ اسٹک، کالی گھٹاؤں جیسے بالوں کا خوبصورت جوڑا، نازک ہیل والی جوتی، واللہ، اس کی تیاری آج پھر قیامت ڈھا رہی تھی۔

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا

ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

اس کی گود میں وہی۔۔ پنکی پنکی۔۔ تھی۔ میرا دل اسے دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ اس نے بھی مجھے ایک مسکراہٹ دی۔

اماں اور ان کی پھپھی زاد آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ اچانک میرے کان کھڑے ہوئے، جب وہ آنٹی آہستہ سے اماں سے بولیں،

"زاہدہ آپا، آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"بالکل یاد ہے وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔" اماں نے جواب دیا

"تو آپا یاد رکھیے گا۔ بھول لیے گا مت"

یا اللہ، یہ کونسا وعدہ نبھانے کی بات ہو رہی ہے۔ کہیں یہ وہی وعدہ تو نہیں؟ جو فلموں، ڈراموں اور ناولوں میں بہنیں یا کزنیں آپس میں کر لیتی ہیں۔ کہ میرے بیٹا ہوا اور تمہارے بیٹی ہوئی تو ہم ان کی شادی کر کے اِک نئے مضبوط بندھن میں بندھ جائیں گے۔ یا اللہ، تیرا ہی کرم۔۔ تیرا ہی آسرا۔۔! یہ وہی وعدہ ہو۔

"اماں میں ابھی سے بتا دوں۔

مجھے منظور ہے۔۔

منظور ہے۔

منظور ہے۔۔ پنکی،"

اور انوکھے لاڈلے نے کھیلنے کے لیے اماں سے چاند مانگ لیا تھا۔

خادم حسین مجاہد

# مزید شوخیاں

**دارِارقم** سکول سرگودھا میں ایک جہادی ترانے پہ ٹیبلو پیش کیا جا رہا تھا۔ جب ترانے میں شہیدوں کا ذکر آیا تو بچوں نے شہیدوں کی میتیں لا کر اسٹیج پہ رکھ دیں جن کے کفنوں پہ تازہ خون لگا ہوا تھا۔ ٹریلر ختم ہوا تو بچے جلدی سے بھاگ کر سٹیج کے پیچھے چلے گئے جو شہداء کی میتیں لائے تھے، وہ میتیں واپس اندر لے جانا بھول گئے، شہدا نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر خود ہی اٹھ کر کفن سمیت اندر چلے گئے، حاضرین ہنس ہنس کے دوہرے ہو گئے تو ڈائریکٹر محمد تاثیر مرحوم جو پروگرام کنڈکٹ کر رہے تھے ڈائس پر آئے اور بولے "اس میں حیرت والی کوئی بات نہیں، آپ کو تو پتہ ہے کہ شہید زندہ ہوتے ہیں اور یہ اس بات کا عملی مظاہرہ تھا۔"

پروف ریڈنگ کی طرح پیپر چیکنگ بھی نہایت بور کام ہے لیکن جیسے پروف ریڈنگ میں بعض اوقات ایسی غلطی سامنے آجاتی ہے کہ بندہ مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایسے ہی پیپر میں بچے نادانستگی میں کبھی کبھار ایسی غلطی کر جاتے ہیں کہ ہنسی روکے نہیں رکتی۔ پنجم کے پیپر میں "سرسبز و شاداب" مرکب کا جملہ اپنی طرف سے یوں لکھا کہ "ہماری کھیتیاں سرسبز و شاداب ہیں لیکن املاء کی غلطی کی وجہ سے وہ کچھ یوں لکھا تھا ہماری کھوتیاں سرسبز و شاداب ہیں۔" ایک بچے کو غلط کا متضاد صحیح نہیں لکھنا آتا تھا تو اس نے ٹک کا نشان لگا دیا جو استاد عموماً سوال درست ہونے پر لگاتے ہیں ہم اس بچے کی ذہانت پر عش عش کر اٹھے۔ ایک اور بچے نے مشہور معدنیات میں لوہے اور تانبے کو مولی اور گاجر بھی لکھ دیا تھا کہ وہ بھی زمین سے ہی نکلتے ہیں۔

ہمارے ابو کے کزن نواز کو بچپن میں پڑھائی سے شدید الرجی تھی مگر ان کے والد بہت سخت تھے اس لئے وہ پڑھائی سے بھاگ تو نہ سکتے تھے لہٰذا دوسرے عام بچوں کی طرح قاعدہ پھاڑ کر جان چھڑانے کی کوشش کرتے تھے ان کے والد جلد ساز بھی تھے اور ہمیشہ ان کو بڑی مضبوط جلد میں سی کر قاعدہ دیتے تھے مگر پھر بھی وہ ہر دوسرے دن قاعدہ پھاڑ کر برابر کر دیتے۔ تنگ آ کر ان کے والد صاحب دو ایک جیسے قاعدے لائے ان کی سوئیاں اتار کر اوراق الگ الگ کئے اور ایک جیسے اوراق کا ایک حصہ ایک سائیڈ پر اور دوسرا حصہ دوسری سائیڈ پر چسپاں کر دیا یوں تمام قاعدہ اوراق کی بجائے گتے کا ہو گیا پھر اسے باہر ڈبل گتہ لگا کر جلد کر دیا، اور برخوردار کے حوالے کر دیا۔ برخوردار اس قاعدے کو پا کر پہلے

حیران ہوئے اور پھر پھاڑنے کی کوشش میں ناکامی پر پریشان ہوئے۔ دو تین دن اِسی پریشانی میں گزر گئے چوتھے دن انہوں نے گھر میں پڑا کلہاڑا اٹھایا اور قاعدے کو یوں کاٹ دیا جیسے لکڑی کاٹتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان کا کیا بنا ہوگا۔ تو آج کل وہ امام مسجد ہیں۔ کیونکہ لائق بچوں کو ہم انجینئر ڈاکٹر بناتے ہیں اور ان جیسے بچوں کو ہم دینی مدرسوں میں ڈال کر امام مسجد بنا ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں تو دین کا یہی حشر ہوگا جو اب ہو رہا ہے۔

میرے بھانجے بھانجیاں ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے اور بڑے خوش تھے کہ اسی بہانے چند دن سکول اور ٹیوشن وغیرہ سے جان چھوٹی۔ اگلے دن صبح جب میں سکول جانے کے لئے نکلنے لگا ایک بھانجے نے ہم سے پوچھا "ماموں جان! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے بتایا "سکول!"

تو وہ حیران ہو کر بولا "آپ اتنے بڑے ہو کر اسکول جاتے ہیں؟"

میں نے کہا کہ "میں نالائق ہوں اور فیل ہو جاتا ہوں اس لئے مجھے اب تک سکول جانا پڑتا ہے تو اس نے پوچھا" آپ کا بیگ کہاں ہے؟؟؟؟"

میں نے کہا کہ اسکول میں پڑا ہے تو وہ بولا "پھر آپ ہوم ورک کیسے کرتے ہیں؟" میں نے کہا کہ میں ہوم ورک نہیں کرتا تو وہ حیران ہو کر بولا "آپ کو میڈم نہیں مارتی؟" میں نے کہا کہ مارتی تو ہے مگر مجھے درد نہیں ہوتا کیوں کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔

اس نے پوچھا جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو مجھے بھی درد نہیں ہو گا۔

میں نے کہا "بالکل۔"

اس نے یہ سارا قصہ بہنوں کو بھی بتا دیا۔ جب میں سکول سے آ کر لکھنے بیٹھا تو مریم بولی "آپ تو کہہ رہے تھے کہ میں ہوم ورک نہیں کرتا اور اب آپ کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "آج ذرا زیادہ کام ملا ہے اس لئے میں نے کہا ذرا کرلوں ورنہ میڈم زیادہ مارے گی تو پھر درد ہوگا۔"

وہ بولی "آپکو اتنا زیادہ کام کیوں ملتا ہے" میں نے کہا "اسلئے کہ میں بڑا ہوں۔"

بعد میں ان کی اماں نے انہیں بتا دیا کہ تمھارے ماموں تو بچوں کو پڑھانے جاتے ہیں جیسے میڈم تمھیں پڑھاتی ہے تو آمنہ میرے پاس آ کر بولی" ماموں ہمیں پتہ لگ گیا ہے کہ آپ تو "میڈم" ہیں۔

دعوۃ اکیڈمی کے تحت ملک بھر سے بچوں کے ادیبوں کا تربیتی کیمپ اسلام آباد میں منعقد ہوا کیمپ کے دوران سیر کے لئے مری لے جایا گیا۔ وہاں بے پناہ لڑکیوں کو دیکھ کر کوئٹہ کے رائٹر عرفی اور گوجرانوالہ کے شامی اوقات سے باہر ہوگئے اور گروپ سے الگ ہو کر بھونڈی میں مصروف ہوگئے۔ حتیٰ کہ کافی دیر گزر گئی اور وہ واپس نہ آئے تو ہمیں تشویش ہوئی، ہم دو تین ٹولیوں میں بٹ کر اُن کی تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ ایک فیملی نے انہیں گرفتار کر رکھا ہے، ان کی منتیں کر کے انہیں واپس لائے اور ماجرا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ تین لڑکیوں کا پیچھا کرتے رہتے تھے جس کا علم لڑکیوں کو بھی ہو گیا مگر انہوں نے محسوس نہیں ہونے دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک فیملی میں جا کر بیٹھ گئیں ہم ان کے بالکل پیچھے تھے، کہیں بھاگ نہ سکتے تھے ان کی ماں نے ہمیں بلایا اور بڑے پیار سے ہماری بے عزتی کی اور پھر انہیں ہماری بہنیں بنا دیا اور "بہنوں" نے آئسکریم کی فرمائش کر دی اور تمہیں پتہ ہے کہ یہاں آئسکریم کتنی مہنگی ہے اور ہماری جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ ان سب کو آئسکریم کھلا سکتے، اس پر انہوں نے ہمیں بے عزت کیا اور وہیں روک کر ہم سے گانے اور لطیفے سنے، اتنے میں آپ پہنچ گئے۔

بے روزگاری کے دور میں ہمارے دو ہی مشغلے تھے لکھنا اور مختلف محکموں کو نوکری کے لئے درخواستیں داغنا اور انٹرویو دینا۔ مگر

انٹرویو میں خوار ہوکر علم ہوتا کہ بھرتی تو کسی اور ہی میرٹ پر ہو چکی ہے۔

ایک دن ٹیلی فون آپریٹر کے لئے انٹرویو تھا۔ متعلقہ دفتر پہنچے تو شدید رش تھا اور باری آنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا، نوکری تو بعد کی بات تھی، اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا لڑکا رش سے پریشان ہو کر الگ تھلگ کھڑا تھا مجھے اس کے چہرے سے لگا کہ بندہ اپنی ہی برادری کا ہے میں نے آگے بڑھ کر نام، علاقہ اور تعلیم پوچھ کر سوال کیا کہ کہیں آپ شاعر یا ادیب تو نہیں؟ تو وہ حیران ہوکر بولا کہ میں ٹوٹی ہوئی شاعری کرتا تو ہوں مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ذہنی مریض دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں"

وہ ابھی حیرت کے عالم میں ہی تھا کہ میں نے اسے اپنا تعارف کرایا۔ ہمیں نوکری تو نہیں ملی مگر ایک اچھا دوست ضرور مل گیا۔

جن دنوں میں ماہنامہ سفید چھڑی سرگودھا میں معاون مدیر تھا ،کوئٹہ کی ایک خاتون رائٹر تحریروں کے ساتھ ایک مکھن بھرا خط ضرور لکھا کرتی تھیں جس میں اتنی چکناہٹ ہوتی تھی کہ دل کے مریضوں کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ خط میں وہ صاحبہ رسالے کو صفِ اول کا رسالہ، مدیر صاحب کو سب سے بڑا ادیب، شاعر اور مجلسِ ادارت کو عظیم دانشوروں کی سند پر فائز کرنے کے ساتھ لمبی چوڑی دعائیں اور القاب لکھا کرتی تھیں کہ مدیر و انتظامیہ کو کچھ نہ کچھ چھاپنا پڑتا۔ شاید وہ دیگر رسائل اور مدیران کو بھی ایسے ہی فیاضانہ خطوط لکھا کرتی تھیں جو ان کی اوسط درجے کی تحریریں بھی اہتمام سے چھپا کرتیں حالانکہ اگر وہ خط جتنی محنت اپنی تحریر پر کر لیتیں تو انہیں ایسا خط لکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ایک بار انہوں نے لکھا کہ مجھے اپنی شادی پر بلائیے گا، میں ضرور آؤں گی، میں نے لکھ دیا "اس وقت کیا فائدہ اس وقت میں پھنسا ہوا ہوں گا اور اس کے بعد مزید پھنس جاؤں گا اگر آپ نے آنا ہے تو پہلے آئیں!"

وہ نجانے کیا سمجھیں کہ پھر ان کا جواب ہی نہیں آیا، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

سرگودھا کے ایک تھری سٹار ہوٹل نے پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودھا کو پیشکش کی کہ ہم ایک مشہور گلوکار کا شو بلائنڈ کی فلاح و بہبود کے لئے کرنا چاہتے ہیں، ہم نے سوچا کہ ہوٹل کے اخراجات نکال کر جو آمدن ہوگی، وہ عوامی گلوکار اور ایسوسی ایشن میں برابر تقسیم کر دی جائے گی۔ صدر ایسوسی ایشن مان گئے اور ہوٹل والوں نے پبلسٹی کر کے خاصے ٹکٹ بیچ لئے جو مہنگے ہونے کے باوجود اس لئے بک گئے کہ تفریح کی تفریح اور ثواب کا ثواب۔۔۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ گناہ کے کاموں سے ثواب بھی مل سکتا ہے یا نہیں، بہر حال وہ گلوکار آئے تو انہوں نے کہا کہ وہ انگور کی بیٹی کے بغیر رات کا طویل پروگرام نہیں کر سکتے اور انہیں شو کے دوران مسلسل جام ملتے رہنے چاہئیں۔

انتظامیہ کو اس کا مہیا کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا، مسئلہ یہ تھا کہ بظاہر نیکی کا کام کیا جا رہا تھا جس کے درمیان سرِ عام شراب نوشی مناسب نہ تھی۔ بالآخر انتظامیہ نے اس کا حل یہ نکالا کہ اندرونی کمرے میں شراب کی ٹینکی بھر کر رکھ دی اور شو کے دوران چینک میں گلوکار کو سرو کی جانے لگی جو وہ کپ کے ذریعے پیتے رہے اور عوام یہ سمجھتی رہی کہ وہ جاگنے کے لئے چائے پی رہے ہیں جب محفل عروج پر پہنچی تو عوام جوش میں آگئے اور شیخ صاحب کی ہدایت پر ایسوسی ایشن کے ادبی شمارے سفید چھڑی کی جو پرانی کاپیاں ہم نے پبلسٹی کے لئے عوام میں مفت تقسیم کی تھیں، وہ انہیں پھاڑ پھاڑ کر ویلوں کی طرح ہوا میں اڑانے لگے یوں ان کا ویلوں کا شوق بھی پورا ہو گیا اور ان کا مالی نقصان بھی نہ ہوا۔

شیخ صاحب خصوصی نشست پر بے خبر بیٹھے تھے جب میں نے انہیں بے ادبوں کے ہاتھوں ادب کے ساتھ ہونے والے حشر کا بتایا تھا تو انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کافی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ مزید ہاتھ یہ ہوا کہ شو کی بیشتر آمدنی ہوٹل والوں نے اپنے اخراجات کی مد میں ہضم کر لی اور منہ میں زیرے کے برابر رقم شیخ

صاحب کو نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے لئے دے کر ایک بڑی رقم عوامی گلوکار کو دے دی۔ عوامی گلوکار نے بھی نیکی کے کام میں پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اپنا نصف معاوضہ شیخ صاحب کو دینے کا اعلان کر کے یہ جاوہ جا ہو گیا۔ شیخ صاحب بعد میں بھی فون کر کے انہیں وعدہ یاد دلاتے رہے مگر انہوں نے جو نیک نامی کمانا تھی وہ بغیر رقم کے ہی کما لی تھی، پھر وہ نقصان کیوں کرتے، البتہ شیخ صاحب بعد میں بھی عرصہ تک اس فراڈ کے صدمے سے نہ نکل سکے۔

ہمارے دونوں ماموں ایک دکان پر جانے کے لئے گھر سے نکلے تو محلے میں ایک جگہ صدمے کی حالت میں لوگ جمع تھے، دریاں بچھی تھیں، ماموں بھی محلے داری کے خیال سے وہاں جا کر اظہارِ افسوس کے لئے بیٹھ گئے کیونکہ محسوس یہی ہو رہا تھا کہ کوئی مرگ ہو گئی ہے جس کے صدمے سے ایک صاحب تو باقاعدہ دھاڑیں مار رہے تھے۔ ماموں نے بات چلانے کے لئے پوچھا کہ مرحوم کیسے فوت ہوئے؟؟ تو وہ دھاڑیں مارنے والے صاحب وقفہ کر کے بولے "پتہ نہیں، کل تو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت تھی بلکہ شام کو گھاس بھی کھائی تھی اور حسبِ معمول لید بھی کی تھی مگر صبح اٹھ کر دیکھا تو۔۔۔۔۔

اِس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتے، چھوٹے ماموں کو حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور وہ غصے سے بولے "ان کا گھوڑا فوت ہو گیا ہے اور تم ہنس رہے ہو؟؟؟"

چھوٹے ماموں جو سمجھ رہے تھے کہ مرحوم کوئی شخص تھا اس لئے ہنس پڑے تھے، بڑی مشکل سے اُنہوں نے ہنسی روکی اور بڑے ماموں ان لوگوں سے معذرت کر کے وہاں سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ معاملہ بگڑ نہ جائے، وہاں سے کافی دور آئے اور دونوں ماموں خوب مل کر ہنسے۔

کبھی استاد کا بڑا ادب ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ان کے ایک استاد ہوا کرتے تھے فضل احمد شائق صاحب۔ نہایت مختی، با اصول اور دبنگ قسم کے ٹیچر تھے انہوں نے شاگردوں کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ نہ تو نہر پر جانا ہے اور نہ ہی چلتے ٹرک پر لٹک کر سوار ہونا ہے۔

ایک دن والد صاحب اور ان کے دوستوں نے یہ جرم بیک وقت کر ڈالے لیکن شومئی قسمت، اس دوران اُنہیں دور سے شائق صاحب آتے دکھائی دیئے جو شام کی سیر کرتے کرتے اس طرف آنکلے تھے۔ شائق صاحب نے انہیں نہیں دیکھا تھا مگر یہ سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ٹرک سے اترے اور لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔ شائق صاحب نے آ کر پوچھا تو انہوں نے خود ہی اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا۔ شائق صاحب نے سزا سنائی کہ مرغے بن جاؤ اور منہ گھر کی جانب کر لو اور اسی حال میں نہر سے گھر تک کا فاصلہ طے کرو۔" اور یہ کہہ کر وہاں سے آگے نکل گئے مگر شاگردوں کی ایمان داری ملاحظہ ہو کہ وہ مرغا بنے ہی گھر پہنچے اور ان کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ کون سا استاد صاحب دیکھ رہے ہیں ہم کان چھوڑ دیں اور سیدھے ہو کر گھر چلے جائیں حتیٰ کہ انہوں نے بازار اور محلے والوں کے مذاق اڑانے پر بھی اپنی پوزیشن نہ بدلی۔ کہاں آج یہ حالت ہے کہ ادھر ٹیچر کی نظر چوکی اور مرغا بنے ہوئے لڑکے کان چھوڑ کر کلاس میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں سکول میں پڑھا رہا تھا کہ ایک محترمہ کی کال آ گئی جو کہ حسبِ توقع لمبی ہو گئی تو بچے بھی پڑھائی چھوڑ کر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ میں نے محترمہ سے کہا کہ میرے بچے شور کر رہے ہیں اس لئے بعد میں بات کر لیں گے تو اُس نے پوچھا کہ آپ کے کتنے

فیروز خان نون کی پہلی بیوی بیگم نون کے نام سے موسوم تھیں۔ جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کر لی تو ان کی ایک شناسا نے مولانا سالک سے بطور مشورہ پوچھا، "اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا؟"

مولانا نے بے ساختہ جواب دیا، "آفٹر نون۔"

بچے ہیں؟؟؟ میں نے کہا کہ تین۔۔۔تو وہ حیران ہو کر بولی آپ کی بیویاں کتنی ہیں؟؟؟ میں نے بتایا کہ بیوی تو ابھی ایک ہی ہے، مہنگائی دوسری کی اجازت نہیں دیتی، اس نے پوچھا کہ پھر اتنے بچے؟ میں نے جب بتایا کہ یہ تو دوسروں کی بیویوں کے ہیں، میں تو ان کا استاد ہوں۔ اس نے زور زور سے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

پریڈ کے دوران ورکشاپ کے لئے ہمیں گورنمنٹ ہائی سکول بھلوال پہنچنے کی چھٹی ملی۔ بھلوال کی ایک سڑک پر پہنچ کر ایک صاحب سے سکول کا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اسی سڑک پر سیدھے چلتے جائیں۔ آگے دلاور سینما آئے گا اس سے اگلا گیٹ سکول کا ہی ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ سکول کے ساتھ سینما، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے مسجد کے ساتھ میکدہ ہو یا ہسپتال کے ساتھ قبرستان۔۔۔ بہرحال، ورکشاپ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کم از کم چار گنا تھی۔ یعنی شرعی ضروریات کی تکمیل کے مکمل مواقع تھے لیکن غیر محرم سے محرم تک کا یہ مرحلہ اتنا آسان نہ تھا کہ یہ ایجوکیشن یونیورسٹی کی ریگولر کلاس نہیں بلکہ اوپن یونیورسٹی کی ورکشاپ تھی جو اوپن ہونے کے باوجود اتنی اوپن نہیں ہوتی۔ اور بعض اوقات تو کورس کے شرکاء کو اختتام تک ایک دوسرے کے ناموں تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ہال میں نظر دوڑائی تو بہت کم سیٹیں مکمل تھیں کسی کی پشت تو کسی کی نشست غائب تھی اور اگر یہ دونوں موجود ہوئیں تو بازو غائب۔۔۔ خیر ایک ایسی ہی معزور کرسی کا انتخاب کر کے بیٹھ گئے۔ تلاوت سے اسمبلی کا آغاز ہو چکا تھا اور اب ایک مولانا اپنے درس کے ذریعے ہمیں ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر نادان مردوں ہی نہیں عورتوں پر بھی کلام نرم و نازک بے اثر ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ورکشاپ کا آغاز ہوا اور ٹیوٹر حضرات بھی کچھ ایسی ہی کوششوں میں مصروف رہے حالانکہ ان میں سے ایک آدھ ہی داڑھی دار تھے ممکن ہے ان کی داڑھی پیٹ میں ہو۔ ایک ٹیوٹر نے بتایا کہ آج ہم چلتے بھی سائنس کی بدولت ہیں تو ہم حیران ہوئے کہ جب سائنس

جگر مرادآبادی کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے ایک زندہ دل نے ان سے کہا "حضرت آپ کی غزل کے فلاں شعر کو لڑکیوں کی ایک محفل میں پڑھنے کے بعد بڑی مشکل سے میں پٹنے سے بچا ہوں۔"
جگر صاحب ہنس کر بولے "عزیزم، میرا خیال ہے کہ اس شعر میں کوئی خامی رہ گئی ہوگی، ورنہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ پٹنے سے بچ جاتے۔"

نہیں ہوتی تھی تو لوگ کیسے چلا کرتے تھے؟

ہمارے انچارج نعیم گوندل صاحب تھے جو اوپن یونیورسٹی کے لچکدار سسٹم میں مکمل طور پر غیر لچکدار اصولوں کے مالک تھے اسی لئے جہاں ان سے بیگانے ناخوش تھے، اپنے بھی خفا رہے۔ دورانِ ورکشاپ اتفاقاً یا ہماری بددعاوں کے سبب بیمار تو ہوئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا کہ انہوں نے خود آرام کیا نہ ہمیں کرنے دیا لہٰذا امیر خوار پھرتے رہے کہ ان کے نمبر ٹو مشتاق احمد ضیاؑ تھے جو گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے حالانکہ زمانہ لاٹھی اور بھینس کا تھا مگر یہ لاٹھی کے استعمال کے بغیر بھینسوں کے آگے بین بجاتے رہے اور ان بھینسوں میں مرد و خواتین دونوں شامل تھے۔ جن میں سے بعض کی حاضری رجسٹر پر اور وہ خود بازار ہوتے تھے۔ تیسرے ٹیوٹر مہر نواز صاحب تھے جن کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا اور وہ پنجابی میں اُردو یا انگلش بولتے تو اور پیارے لگتے۔

میں ایک دوست کی دکان پر گیا تو کاؤنٹر پر اس کا چچا بیٹھا تھا جسے سب لالہ کہتے تھے اور اس کا یہ نام اتنا معروف ہو گیا کہ گھر میں سب چھوٹے بڑے بھی لالہ کہتے تھے حتی کہ بعض اوقات ان کی بیوی بھی روانی میں ان کو لالہ کہہ دیتی۔ وہ ویسے بھی ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ اس دوران ایک گاہک ان سے بادام لینے آیا اور پوچھا کہ بادام میٹھے ہیں؟ لالہ نے دو بادام توڑے اور بجائے گاہک کو دینے کے خود اپنے منہ میں ڈالے اور کہا کہ بہت میٹھے ہیں۔۔۔ پھر جلدی جلدی اسے بادام تول کر دیے اور جونہی اس نے کمر

دکھائی ، لالہ نے نالی میں تھوکنا شروع کر دیا۔ میں نے پوچھا "آپ تو کہہ رہے تھے کہ بادام بہت میٹھے ہیں؟"

بولے "اگر میں سچ کہہ دیتا تو کیا وہ بادام خریدتا لیکن بدقسمتی دیکھو کہ دونوں ہی کڑوے تھے، ایک بھی میٹھا ہوتا تو گزارہ ہو جاتا"

میں نے کہا "شکر کریں کہ وہ آپ کے چکھنے پر مطمئن ہو کر چلا گیا اگر خود چکھتا تو۔۔۔؟

ہمارے بڑے ماموں نے گاڑی رکھی ہوئی ہے جسے وہ بطور ٹیکسی چلاتے ہیں اور خود ڈرائیونگ کرتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ڈرائیور بے ایمانی کرتے ہیں اور ذاتی کاموں میں استعمال کر کے ناجائز پٹرول ضائع کرتے ہیں لیکن ان کے دوست اس کی وجوہات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ماموں کے کولہے پر پھوڑا نکل آیا جو اتنا بڑھا کہ اُنہیں چیرا ڈلوانا پڑا اور اس دوران انہیں عارضی طور پر ڈرائیور رکھنا پڑا لیکن مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ ڈرائیور کو دیکھ کر میں نے پوچھا کہ ماموں کہاں ہیں وہ ڈرائیوروں کی زبان میں بولا "نائیک صاحب نے انجن کرایا ہوا ہے اور آجکل وہ رِنگ پوری کر رہے ہیں۔"

میں نے اپنی طنز و مزاح کی دوسری کتاب "قلم آرائیاں" پہلی کتاب "دست و گریباں" کے دو سال بعد ۲۰۰۲ میں مرتب کی اور اس پر تین سینئر ادباء ڈاکٹر وزیر آغا، ضیاُ الحق قاسمی اور غلام جیلانی اصغر مرحوم کی رائے بھی لی جو بیک ٹائٹل پر چھپنا تھی مگر بعض مسائل کے باعث کتاب لیٹ ہوگئی اور ۲۰۰۸ میں چھپی۔ تب تک ضیاُ الحق قاسمی اور غلام اصغر جیلانی وفات پا چکے تھے اور ڈاکٹر وزیر آغا علیل ہو چکے تھے۔ اس پر بعض حاسدین نے اعتراض کیا کہ آپ مرحومین سے کیسے رائے لے لی؟؟؟۔۔۔تو میں نے بتایا کہ کشفِ قبور کے ذریعے ہرگز ان کی آراء نہیں لی بلکہ یہ آراء انہوں نے اپنی زندگی میں ہی دے دی تھی، یہ الگ بات ہے کہ یہ دو صاحبان کتاب چھپنے سے قبل ہی راہیِ عدم ہو گئے۔ اس میں کتاب یا صاحبِ کتاب کا کوئی قصور نہیں مزید یہ کہ تیسرے صاحب ڈاکٹر وزیر آغا بھی علیل ہیں اور اگر کل کلاں کو وہ بھی نہیں رہتے تو اس کی کوئی ذمہ داری ہم پر یا ہماری کتاب پر نہ ہوگی اور پھر وہی ہوا آغا صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے اور ہم انہیں روک بھی نہ سکے۔

ہمارے صحافی دوست عامر رانا نے تہذیب پر اس قدر مطالعہ کیا کہ ہر وقت تہذیب پر بات کرتے رہتے بلکہ ان سے جس بھی موضوع پر بات کی جاتی ، وہ اسے تہذیب کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ تنگ آ کر دوسرا راقم محمد تاثیر مرحوم نے ان کا نام ہی تہذیب رکھ دیا۔ اس کے بعد جب بھی ہمیں عامر رانا نظر آتا، ہم کہتے کہ وہ دیکھو تہذیب آ رہی ہے۔۔۔اس بات کا اسے بھی پتہ چل گیا تو وہ ہم سے کہنے لگا "تم لوگ مجھے تہذیب کہتے ہو، میں اس پر برا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہوں لیکن تم نے مجھے مونث کر دیا ہے حالانکہ میں اچھا خاصا مرد ہوں"

میں نے کہا "بھائی ! یہ ٹیکنیکل مسئلہ ہے اگر ہم تمھاری مردانگی دیکھ کر یہ کہیں کہ تہذیب آ رہا ہے تو گرامر کے لحاظ سے یہ جملہ غلط ہو جاتا ہے جسے گوارا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تہذیب مونث ہے" خاصی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ آئندہ اسے تہذیب نہ کہا جائے تا کہ نہ گرامر غلط ہو اور نہ اس کی مردانگی پر کوئی حرف آئے۔

ہمارے استاد پرفیسر ہارون الرشید تبسم صاحب نے اردو ادب میں پی ایچ ڈی تو بعد میں کی لیکن غیر رسمی طور پر کمپئرنگ وہی کرتے ہیں اور اگر کہیں کوئی پروگرام کسی اور کی کمپئرنگ میں ہو جائے تو ان کی نیند اور چین حرام ہو جاتے ہیں اور ان کے جذبات سوکنوں کی طرح نہایت دھواں دار ہو جاتے ہیں اور یہ اسے اپنی شدید حق تلفی تصور کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم کچھ نوجوان ادباء شعراُ نے اپنی ادبی تنظیم پاسبانِ ادب کے تحت مشاعرہ کروایا جس میں شاعر جواد حسن جواد نے

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جگر مرادآبادی غزل پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک قریبی دوست جب ان کی تصویر کھینچنے لگے، تو جگر صاحب بولے "میر تصویر ایسی نہیں آتی کہ تم گھر میں سجا سکو۔" (جگر صاحب بہت کالے تھے)۔
ان کے دوست نے کہا "تصویر سجانے کے لیے نہیں، بچوں کو ڈرانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

کمپئرنگ کی کیونکہ وہ تنظیم کے شعبہ شاعری کے انچارج تھے۔ تبسم صاحب نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں مگر ہم نے کہا کہ ہم نئے لوگوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل میں مسئلہ پیدا نہ ہو۔۔۔

تقریب کے بعد تبسم صاحب نے تنظیم کے ذمہ داران کے اعزاز میں ٹی پارٹی دی اور پیشکش کی کہ آپ نے آئندہ پروگرام کرانا ہو تو فوٹوگرافی اور پریس کوریج میں اپنے خرچ پر کرادوں گا، اگر آپ کمپئرنگ مجھے دیں۔ عامر رانا نے کہا کہ آپ وڈیو، ٹینٹ اور ریفریشمنٹ بھی اپنے ذمے لیں تو ایسا ہوسکتا ہے۔ تبسم صاحب تبسم فرماتے ہوئے بولے آپ "گویا آپ مجھے لوٹنا چاہتے ہیں؟"

ہم ایک زبان ہو کر بولے "آخر شاگرد کس کے ہیں؟۔۔۔
خرم کلیم، عاطف مرزا اور میں نے کھسروں کی ایک تقریب کا فرضی دعوت نامہ تیار کیا جس میں کمپئرنگ کے طور پر تبسم صاحب کا نام درج کرکے اس کی کاپیاں کرائیں اور ملک بھر کے شعرا ادبا کو بھجوا دیں، تبسم صاحب ہمیں ایک عرصے تک تلاش کرتے رہے مگر ہم لاہور بھاگ گئے تھے۔

سائنس ٹیچر نیوٹن کا تیسرا قانون حرکت پڑھا رہے تھے "کہ عمل اور رد عمل برابر ہے لیکن مختلف اجسام اور الٹ سمتوں میں ہوتے ہیں" لیکن احمد شیر سننے کی بجائے کھیلنے میں مصروف تھا۔ ٹیچر نے دیکھ لیا اور کھڑا کرکے پوچھا کہ ابھی میں نے کیا پڑھایا احمد شیر نے ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ مجھے سمجھ نہیں آیا، دوبارہ سمجھائیں تو بتاؤں گا۔ ٹیچر نے اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ لگایا اور سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو میں نے تمھیں تھپڑ مارا ہے اس میں میرے ہاتھ نے تمھارے گال پہ قوت لگائی ہے جس سے تمھیں درد ہوئی یہ عمل ہے۔ جواب میں اتنی ہی قوت مخالف سمت میں تمھارے گال نے میرے ہاتھ پر لگائی جس سے مجھے بھی درد ہوئی اور یہ ردعمل ہے۔ اگر اب بھی نہیں سمجھ آئی تو کسی کلاس فیلو کو تھپڑ مار کر دیکھنا، جواب میں وہ بھی اتنی ہی قوت سے تمھیں تھپڑ لگائے گا تو سمجھ آجائے گی۔

پنجاب حکومت نے سکولوں میں جسمانی سزا پر پابندی لگاتے ہوئے "مار نہیں پیار" کا سلوگن دیا اور میڈیا پر اس کی تشہیر کرنے کے ساتھ ساتھ ہر سکول میں اس کو لکھوا دیا جس سے تشدد پسند ٹیچر بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ بچوں کو بھی پتہ چل گیا کہ اب ٹیچر ہمیں مار نہیں سکتے تو انہوں نے بھی گھر کا کام کرنا اور سبق یاد کرنا چھوڑ دیا حتیٰ کہ ڈسپلن توڑتے ہوئے اساتذہ کی بے بسی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تو بعض اساتذہ نے دوبارہ ڈنڈے پکڑ لئے اور اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ یہ سلوگن "مار نہیں پیارا" نہیں ہے بلکہ "مار، نہیں پیار" ہے تو کچھ بچے راہ راست پر آئے وہ تو شکر ہے کہ ٹیچرز کی ہڑتال کی وجہ سے یہ سلوگن واپس لے لیا گیا ورنہ آج ٹیچر بچوں سے ڈر رہے ہوتے۔

ٹیچرز اکثر ماہر جنسیات ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہوتے ہیں جو اکثر اپنے نسخوں سے ساتھی ٹیچرز کو مستفید بھی کرتے رہتے ہیں اور سکول میں دواسازی کرتے رہتے ہیں ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی دواوں کی تو دور دراز شہر سے ہے۔ ایک دفعہ ایک ضلعی سطح کے افسر معائنے کے لئے اسکول پہنچے تو وہاں ایک ٹیچر دوا گھوٹ رہے تھے۔ جب افسر نے سرزنش کی تو بتایا کہ میں خالی پیریڈ میں یہ کام کر رہا تھا۔ افسر نے جواب طلبی کر لی تو یہ تیار دوا کے ہمراہ دفتر پہنچے۔ پی اے کو اس کے کمالات بتا کر تحفتاً پیش کیا اور باعزت بری ہوگئے۔

ہر سمت تیرنے لگیں "منصوبہ بندیاں" بادل جو ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا (مجید لاہوری)

ارشاد العصر جعفری کا تعلق رند قبیلے سے ہے اور میرا شیخوں سے ۔ایک بار ارشاد نے اسی پس منظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کشفی ملتانی کی ایک غزل کا یہ شعر ازراہِ شرارت مجھے لکھ بھیجا۔۔۔

رند بخشے گئے قیامت میں
شیخ کہتا رہا حساب حساب

میں نے فوراً اس کی پیروڈی کر کے واپسی خط بھیج دیا۔

رند پکڑے گئے قیامت میں
شیخ لیتا رہا حساب حساب

سعید رضا پہلی بار میرے ساتھ جواد حسن جواد کے پاس جا رہے تھے۔راستے میں میں نے سعید سے کہا کہ جواد کو اپنا اصل نام نہ بتانا کیونکہ میں تمھارا تعارف بطور کامی شاہ کراؤں گا۔ہم نے یہی کیا لیکن جواد نے کوئی شک نہ ظاہر کیا اور سعید رضا کو کامی شاہ تسلیم کرتے ہوئے کراچی کی ادبی سرگرمیوں اور شعراً اُدبا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔سعید کافی معلومات نہ ہونے کی بنا پر پریشان نظر آنے لگا تو جواد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب بتا دو یہ ذات شریف کون ہیں کیونکہ یہ کامی شاہ تو نہیں؟ میں نے ہار مانتے ہوئے کہا ''ہاں! یہ کامی شاہ نہیں بلکہ سعید رضا ہے مگر تمھیں کیسے شک ہوا؟''

جواد نے مسکراتے ہوئے کہا ''مجھے کبھی شک نہ ہوتا اگر پچھلے ہفتے کامی شاہ میرے پاس نہ آیا ہوتا۔''

ایک دفعہ میں نے پرنس کشمیری کو فون کیا تو یوں لگا کہ وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے تو میں نے اسے شرم دلائی کہ میں نے اتنی محبت سے فون کیا اور پیسے بھی میرے خرچ ہو رہے ہیں تو تم کیوں ٹال رہے ہو تو اس نے بتایا کہ کھانا آ چکا ہے اور تم جانتے ہو کہ کھانا میرے سامنے آ جائے تو مجھے دنیا کی کسی چیز کا ہوش نہیں رہتی۔ واقعی یہ سچ ہے کہ میرا بولنے میں اور کشمیری کا کھانے میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور اگر اس کے سامنے ایک طرف اس کی محبوبہ اور دوسری طرف کھانا رکھ دیا جائے تو وہ محبوبہ کی طرف دیکھے گا بھی نہیں اور کھانے پر ٹوٹ پڑے گا اور ہر کھانا وہ زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر ہی کھاتا ہے۔۔۔ میں نے غصے سے کہا کہ دوست کھانے سے زیادہ اہم ہوتے ہیں؟ وہ ڈھٹائی سے بولا ''درست ۔۔۔لیکن دوستوں کو کھایا تو نہیں جا سکتا جب بھوک لگی ہوئی ہو''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، دوستوں کو نہیں کھایا جا سکتا لیکن دوستوں سے کھایا تو جا سکتا ہے''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔''بھائی دوستوں سے ہی کھا رہا ہوں۔ اس وقت شاہین مغل کے گھر ہوں اور اگر تم سے باتیں کرتا رہا تو تمھاری باتیں ختم نہیں ہوں گی لیکن اتنی دیر میں یہ لوگ کھانا ختم کر دیں گے اور پھر میں کیا تمھیں کھاؤں گا؟؟''

میں نے فون بند کر دیا تو کھانا کھا کر اس نے ایک گھنٹہ کال کی۔

بزمِ پیغام پنجاب کے تحت سکول کے مصنفین بچوں کا شاہین کیمپ خانس پور ا ایوبیہ میں منعقد ہو رہا تھا اور ہمیں اس کیمپ میں پیغام ڈائجسٹ لاہور کی نمائندگی کرنا تھی ۔ لاہور گروپ کے انچارج عبدالطیف خان سجاول تھے جو کھانے کے معاملے میں کشمیری سے بھی زیادہ بدنام تھے حتیٰ کہ اُنہوں نے اپنی ڈیوٹی مطبخ میں لگوائی تھی جس میں وہ چکھنے کے بہانے کافی کچھ کھا جاتے۔پھر اپنے گروپ کے ساتھ کھاتے اور آخر میں منتظمین کے ساتھ بھی کھاتے۔کیمپ کے دوران ہماری ''سرپرستی'' میں ایک اخبار نکالا گیا جس کی ہیڈ لائن یہ تھی۔''لطیف خان سجاول چھپ کر ایک بچے کا کھانا کھاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے''

اس کو تفصیل میں بیان کیا گیا کہ لاہور گروپ کے انچارج اور ممبر مطبخ ایک بچے کا کھانا کھاتے ہوئے اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑے گئے جب بچہ کھانا رکھ کر ٹوائلٹ گیا ہوا تھا۔جب بچہ فارغ ہو کر آیا تو لطیف خان کھانا کھا کر فرار ہونے والے تھے مگر بچے کے شور مچانے پر پکڑے گئے ۔قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ وہ اس سے قبل اپنے معمول کے مطابق کھانا چکھنے کے علاوہ دو مرتبہ باقاعدہ کھا چکے تھے ۔کیمپ انچارج نے انہیں جرمانے کے ساتھ ساتھ ان کا

ایک وقت کا کھانا بند کر دیا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی خبریں بھی تھیں۔ مثلاً انچارج بہاولپور نہاتے ہوئے گرفتار۔۔۔ کیونکہ پہاڑوں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے نہانا منع تھا"

میں دارِ ارقم سکول کوٹ مومن میں پرنسپل ندیم صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ مہینے کے پہلے ہفتے کا دن تھا۔ اس لئے فیس وغیرہ آ رہی تھی۔ شاید اسی لئے ان کا ایک دوست آیا اور دس ہزار قرض مانگا۔ ندیم صاحب نے کہا۔ "بھئی یہ سکول ہے، کوئی بینک تو نہیں؟؟"

میں نے کہا "قصور ان کا نہیں شاید انہوں نے آپ کے سکول کا نام دارارقم کی بجائے "دار۔۔۔۔رقم" پڑھا ہے۔"

عربی میں فرشتے کو ملک کہتے ہیں جس کی جمع ملائکہ۔ ایک دن میں اور عنایت اللہ گلی میں جا رہے تھے کہ سامنے سے ملک برادری کے دو تین افراد آتے دکھائی دئے، عنایت اللہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ملائکہ آ رہے ہیں!"

عنایت اللہ عربی کے مدرس ہیں اس لئے انہوں نے رعایت لفظی سے یہ نقطہ پیدا کیا۔

ہم نے ایک عزیزہ کے لئے ایک دوست سے رقعہ لیا کیونکہ جہاں انہوں نے نوکری کی درخواست دے رکھی تھی، اس ادارے کے ڈائریکٹر ہمارے دوست فاروق کے دوست تھے۔ عمر فاروق نے روٹین کے مطابق لکھا کہ حاملِ ہذا ہماری عزیزہ ہیں اس لئے ان کی ہر جائز مدد کی جائے۔ میں نے رقعہ پڑھ کر کہا کہ حامل تو مرد کے لئے ہوتا ہے جبکہ عورت کے لئے حاملہ ہونا چاہئے۔ عمر فاروق نے کہا کہ اس کا مطلب بڑا خطرناک بنتا ہے، میں نے کچھ سوچ کر ان سے اتفاق کیا کہ حامل ہی رہنے دیں، مطلب تو واضح ہے۔ حاملہ سے تو واقعی مسائل پیدا ہو جائیں گے کیونکہ ابھی تو ان صاحبہ کی شادی بھی نہیں ہوئی۔

ہمارے ایک آفیسر بڑے پیدا گیر تھے اور ٹیچرز کی بے ضابطگیاں پکڑ کر مال بنانے میں ماہر تھے۔ ایک دن شدید سردی کے موسم میں صبح سویرے دور دراز کے ایک سکول پہنچے تو خلاف توقع پورا سٹاف بر وقت حاضر تھا۔ ادھر سے مایوس ہو کر ریکارڈ چیک کیا، وہ بھی درست، صفائی اور رنگ روغن بھی کیا گیا تھا، بچوں کا ٹیسٹ لیا تو ان کی حالت بھی تسلی بخش تھی۔ ادھر سے ہٹ کر دو اور سکول چیک کئے، وہاں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی لہٰذا بے نیل و مرام واپس دفتر پہنچے تو ان کے چہیتے کلرک نے پوچھا" کیوں صاحب، کیا رہا؟"

غصے سے جل کر بولے" آج تو فضول سردی میں مرا، اُلو کے پٹھے سارے حاضر تھے، ایک بھی کمینہ نہیں پھنسا۔

کالج میں ایف ایس سی کا سیشن ختم ہونے پر ہماری الوداعی پارٹی تھی جس کے آخر میں ساری کلاس کا ٹیچرز کے ساتھ گروپ فوٹو بھی ہوا۔ فوٹو گرافر کو ہماری کلاس کا شیطان طالب علم توقیر لایا تھا اور اس نے ساری کلاس کے نام ترتیب وار لکھ کر دینا تھے۔ جب فوٹو پرنٹ ہو کر آیا تو وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ کئی طلباء کے ناموں کے ساتھ واردات ہو چکی تھی مثلاً ہمارے طویل القامت کلاس فیلو تھے ذوالقرنین منگلا۔ ان کا نام لکھا ہوا تھا ذوالقرنین جنگلا جبکہ عبدالمجید غوری کا نام عبدالحمید فوری، عامر پراچہ کا نام عامر چاچا، اکرم رانجھا کا نام اکرم سانجھا ادب نواز چڈھر کا نام نواز بڈھر درج تھا۔ اتنی غلطیاں کمپیوٹر کی تو نہیں ہو سکتی تھیں مگر کلاس ختم ہونے کے باعث توقیر میاں کہاں ہاتھ آتے ناچار یہ صاحب فوٹو گرافر سے ہی بکتے جھکتے رہے اور وہ اپنی صفائیاں دیتا رہا۔ پھر امتحانات میں انہوں نے توقیر کو گھیر لیا اس نے کہا کہ میں نے یہ اس تصویر کو یادگار بنانے کے لئے کیا۔ اب جب بھی آپ تصویر دیکھیں گے تو مجھے ضرور یاد کریں گے، چاہے اچھے لفظوں میں یا برے لفظوں میں اور واقعی آج تک ہم اسے نہیں بھول پائے۔

# مونچھوں کے فائدے اور نقصانات

meemseenbutt@gmail.com

**مونچھیں** ہمیں اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی بری لگتی ہیں اور خواتین کی تو بالکل ہی اچھی نہیں لگتیں جو خواتین ہر میدان میں مردوں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیتی ہیں ان میں سے بعض کے چہرے پر مونچھیں بھی اگ آتی ہیں، تفنن برطرف مونچھ رکھنے کے جہاں بہت سے نقصانات پائے جاتے ہیں وہاں چند فائدے بھی ہیں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ مونچھوں کی وجہ سے دوسرے لوگ رعب میں رہتے ہیں جبکہ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خواتین زیادہ فری نہیں ہوتیں اور مونچھوں سے ذرا فاصلے پر رہتی ہیں، مونچھ نہ رکھنے کے بھی بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کلین شیو بندہ ان پڑھ بھی ہو تو پڑھا لکھا لگتا ہے البتہ کلین شیو ہونے کا ایک نقصان بھی ہے کہ بعض تصاویر دیکھ کر اس کے مونث یا مذکر ہونے کا علم نہیں ہو پاتا اور اگر ساتھ ہی ہم جیسا قلمی نام بھی ہو تو بالکل ہی پتا نہیں چلتا۔

کلین شیو طبقے میں سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے اور ادیب، شاعر، دانشور زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں البتہ صحافی بہت کم کلین شیو ہوتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ صحافی کام تو بڑے شہروں میں کرتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق دیہی علاقوں سے ہوتا ہے اور انہیں ہر ہفتے چھٹی گزارنے گاؤں جانا پڑتا ہے جہاں کی مقامی ثقافت "مچھ نئیں تے کچھ نئیں" قسم کی ہوتی ہے لہٰذا وہ خواہش کے باوجود کلین شیو نہیں ہو سکتے، ہمارے صحافی دوست اسلم

> سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کلین شیو بندہ ان پڑھ بھی ہو تو پڑھا لکھا لگتا ہے البتہ کلین شیو ہونے کا ایک نقصان بھی ہے کہ بعض تصاویر دیکھ کر اس کے مونث یا مذکر ہونے کا علم نہیں ہو پاتا اور اگر ساتھ ہی ہم جیسا قلمی نام بھی ہو تو بالکل ہی پتا نہیں چلتا۔

زبیر اور ستار چوہدری بھی ماضی میں لاہوری ماحول کی وجہ سے ایک بار جوش میں آ کر کلین شیو ہو گئے تھے مگر کھڈیاں خاص پہنچ کر انہیں دوبارہ عوامی حلیہ اپنانا پڑا تھا، استاد محترم عطاء الحق قاسمی نے دو برس قبل شاید کسی چھل دوست کے طعنے پر دلبرداشتہ ہو کر سینیٹر پرویز رشید کے سٹائل میں سفید مونچھیں رکھ لی تھیں تاہم وہ غالباً دانشور خواتین و حضرات کے اصرار پر جلد ہی دوبارہ کلین شیو ہو گئے تھے۔

ہمیں مونچھ اور ٹنڈ سے لڑکپن میں ہی نفرت سی ہو گئی تھی ہمارے بڑے بھائی امتیاز گڈو بٹ شوقیہ پہلوانی کیا کرتے تھے اس لئے "ضرورت شعری" کے تحت اکثر ٹنڈ کروائے اور سر پر ہیٹ جمائے رکھتے تھے لہٰذا دوست احباب انہیں "کو جک" کے نام سے پکارا کرتے تھے بعد ازاں جب ہم الطخانہ کے ساتھ

سعودی عرب گئے تھے تو عمرہ کی ادائیگی پر ٹنڈ کروانے سے صاف انکار کر دیا تھا والد مرحوم کی ڈانٹ ڈپٹ بھی ہمیں ٹنڈ کروانے پر مجبور نہیں کر سکی تھی جس پر وہ جاتے ہوئے چپکے سے نائی کے کان میں کہہ گئے تھے کہ زیادہ سے زیادہ بال کاٹ ڈالو، کٹنگ کے بعد ہم آئینہ دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتے رہے تھے اتنے چھوٹے بال ہم نے زندگی میں نہ اس سے پہلے کبھی کٹوائے تھے نہ بعد میں کبھی بنوائے ہیں۔

ہم میٹرک میں ہی کلین شیو ہو گئے تھے کالج کا زمانہ بھی ہم نے مونچھوں کے بغیر گزارا تھا مگر جب دو عشرے پہلے فیصل آباد

> عطاء الحق قاسمی نے دو برس قبل شاید کسی مچھل دوست کے طعنے پر دلبرداشتہ ہو کر سینیٹر پرویز رشید کے سٹائل میں سفید مونچھیں رکھ لی تھیں تاہم وہ غالباً دانشور خواتین وحضرات کے اصرار پر جلد ہی دوبارہ کلین شیو ہو گئے تھے۔

میں ایک قومی نظریاتی اخبار کے بیورو آفس میں پہلی بار رپورٹر بنے تھے تو "نظریہ ضرورت" کے تحت مونچھیں پالنے پر مجبور ہو گئے تھے اس زمانے کو اب ہم اپنا "دورِ جاہلیت" قرار دیتے ہیں ان دنوں کی تصویر دیکھنے پر ٹاپ ٹین ہی لگتے ہیں، ہمارے دادا مرحوم تلقین کیا کرتے تھے کہ مونچھیں کٹواؤ اور داڑھی بڑھاؤ! ہم نے بعد ازاں مونچھیں تو کٹوا دی تھیں مگر داڑھی رکھنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے سوچا تھا چلو آدھا اسلامی حکم مان لیا ہے بڑھاپے میں پہنچ کر باقی آدھا بھی مان لیں گے ویسے کیا پتا بڑھاپے کی نوبت بھی آتی ہے یا نہیں؟ دادا مرحوم نے تو نوے برس سے زیادہ عمر پائی تھی لیکن والد مرحوم ہی نہیں تایا اور چچا بھی بمشکل نصف صدی نکال پائے تھے، والد اور چچا مرحوم راجکپور سٹائل سے ملتی جلتی مونچھیں رکھتے تھے مگر تایا مرحوم زیادہ عرصہ کلین شیو رہے تھے البتہ آخری عمر میں انہوں نے داڑھی بڑھا لی تھی۔

مونچھوں سے ہمیں اس لئے بھی نفرت رہی ہے کہ انگریز حاکم خود تو کلین شیو ہوتے تھے لیکن اپنے غلام دیسی فوجیوں کو مونچھ بڑھانے پر الاؤنس دیا کرتے تھے وہ بھی اپنی بڑی بڑی مونچھوں

> آئین وقانون سے بغاوت کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے والے بیشتر فوجی جرنیل بھی مونچھیں رکھتے تھے اور فوجی حکمران بننے کے بعد امریکی غلامی کے حوالے سے ایک دوسرے کا ریکارڈ توڑتے رہے تھے۔

کا سارا رعب ہم وطن ہندوستانیوں پر ڈالا کرتے تھے جبکہ غیر ملکی آقاؤں کا ہر حکم بجالاتے تھے اور اب تک ان کے احکامات مان رہے ہیں آزادی کے بعد صرف آقا تبدیل ہوئے تھے اور انگریزوں کی جگہ امریکیوں نے لے لی تھی، تقسیم ہند کے بعد بھی غالباً فوج میں مونچھ بڑھانے کا الاؤنس جاری رہا تھا۔ آئین و قانون سے بغاوت کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے والے بیشتر فوجی جرنیل بھی مونچھیں رکھتے تھے اور فوجی حکمران بننے کے بعد امریکی غلامی کے حوالے سے ایک دوسرے کا ریکارڈ توڑتے رہے تھے، شریف الدین پیرزادہ، ایس ایم ظفر، اے کے بروہی، ڈاکٹر خالد رانجھا، احمد رضا قصوری اور نعیم بخاری جیسے کلین شیو نامور قانون دان اور آئینی ماہرین فوجی آمروں (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا چیف ایگزیکٹو) جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کی مونچھ کا بال بنے رہے تھے، جنرل یحییٰ خان چونکہ مونچھیں نہیں رکھتے تھے اس لئے انہیں کسی کلین شیو ماہر آئین و قانون نے ایک عشرہ تک طویل حکمرانی کا گر نہیں بتایا تھا لہٰذا وہ رنگین مزاجی کے باعث تین سال میں اقتدار سے ہاتھ دھونے کے ساتھ ہی ملک بھی توڑ بیٹھے تھے۔

# وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

جو کچھ دیکھتا ہے
سلیم فاروقی
Saleem.farooqi1947@gmail.com

آج ہمارے دوست محسن ترمذی کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر تھے، کسی طرح بھی آپے میں آنے کو تو کیا اپنے آپ میں بھی آنے کو تیار نہ تھے۔ وجہ بھی کوئی ایسی خاص نہ تھی۔ ان کے پسندیدہ لیڈر نے کسی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ اگر پاکستان کو ترقی کرنی ہے تو یہاں کی خواتین کو بھی معاشی نظام میں بھرپور کردار ادا کرنا پڑے گا۔ ہم نے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ تمہارے لیڈر نے سچ ہی کہا ہے، فرمانے لگے خاک صحیح کہا ہے؟ اگر ان عورتوں کے ہاتھ میں معاشی نظام آ گیا تو بالکل ہی بیڑا غرق ہو جائے گا۔ ہم مرد کما کما کر دُہرے ہوئے جاتے ہیں اور ان کی ہوسِ اخراجات ختم ہو کر ہی نہیں دیتی ہے۔

ہم نے کہا کہ اس کا روشن پہلو کیوں نہیں دیکھتے ہو کہ ان کی خواہشات پوری کرنے کے لیئے مردوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اور یوں بالواسطہ طور پر عورتیں اس ملک کی معاشی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ بولے یہ بھی خوب کہا، ارے بابا خواتین مُلک کی ترقی میں اتنا کردار ادا نہیں کرتی ہیں جتنا مِلک کی ترقی میں کردار ادا کرتی ہیں، آپ کماتے جایئے، یہ اپنی زیورات، کپڑے اور سُرخی پوڈر کی مِلکیت میں اضافہ کرتی جائیں گی، اور طُرہ یہ کہ ان سب کے علاوہ اپنے شوہر سے چھپا چھپا کر رقم بھی جمع کرتی جائیں گی جس کا شوہر تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی ادراک نہیں ہوتا۔

ہم نے کہا بھائی یہ تو آپ خود اپنے موقف کے خلاف دلیل دے رہے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر خواتین گھریلو بجٹ کو اس خوبی کے ساتھ چلا سکتی ہیں تو یقیناً ملکی بجٹ کو بھی خوب چلائیں گی۔ ہمارے ملک کا بجٹ کو کہ ہر سال خسارے کا ہوتا ہے وہ اس کو بھی منافع میں بدل دیں گی۔ ملک کے اخراجات بھی پورے کریں گی اور سالانہ بچت الگ ہو گی۔ یہ سن کر وہ ایک دم بھڑک ہی تو

> اس کا روشن پہلو کیوں نہیں دیکھتے ہو کہ ان کی خواہشات پوری کرنے کے لیئے مردوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اور یوں بالواسطہ طور پر عورتیں اس ملک کی معاشی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

اٹھے۔ کہنے لگے، ملکی معاشی نظام میں جب ان کے پاس کوئی شوہر نہیں ہو گا تو وہ رقم چھپائیں گی کس سے؟ اور جب رقم چھپا نہ سکیں گی تو بچت بھی نہیں کر سکیں گی۔ ہم نے کہا بھائی تم نے محاورہ نہیں سنا کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ ان کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ کہنے لگے آدھا محاورہ نہ سناو، ہم نے پوچھا کیا مطلب؟ تو بولے کہ پورا محاورہ اس طرح ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور

ہر نا کام مرد کے پیچھے ایک سے زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ہم نے کہا اچھا کیا کہتے ہو اس بارے میں ایک عظیم شاعر کتنا عظیم مصرع دے گیا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کہنے لگے خدا کا واسطہ اب اردو ادب کی غلط سلط مثالیں مت دو۔ کبھی نامکمل محاورے بولتے ہو اور کبھی غلط مصرعے پڑھتے ہو۔ہم نے پوچھا کیا مطلب؟ تو بولے یہ مصرع دراصل کچھ یوں ہے:

وجودِ ظن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

ملکی معاشی نظام میں جب ان کے پاس کوئی شوہر نہیں ہوگا تو وہ رقم چھپائیں گی کس سے؟ اور جب رقم چھپا نہ سکیں گی تو بچت بھی نہیں کر سکیں گی۔

ہم نے حیرانی سے پوچھا کیا مطلب؟ تو بولے دراصل "ظن" کا مطلب ہوتا ہے "قیاس" یعنی اپنے اندازے لگانا۔انسان اپنے قیاس کی بنیاد پر ہی اندازہ لگاتا ہے کہ مستقبل کیسا ہونا چاہیے اور پھر وہ اس کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے۔تم نے تو سنا ہی ہوگا کہ دنیا کی اکثر ایجادات لٹریچر کے بدن سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔ ہمارے کھلے کے کھلے منہ کو نظر انداز کرتے ہوئے خود ہی وضاحت بھی پیش کر ڈالی کہ انسان نے لٹریچر میں "اڑن کھٹولے" کا تصور دیا اور آج جہاز پر اڑتا پھرتا ہے۔ جامِ جم کو ٹی وی کی صورت میں پالیا،عمرو عیار کی زنبیل انٹرنیٹ پر گوگل کی صورت میں موجود ہے،شہزادے کا جو تیر اپنے شکار کا پیچھا کیا کرتا تھا آج ہم اس کو میزائیل کے نام سے جانتے ہیں۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ "وجودِ ظن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"۔ہم نے کہا محسن بھائی عورتوں سے اتنی بھی ناراضی اچھی نہیں۔اگر دنیا میں عورتیں نہ ہوتیں تو آپ کا وجود بھی ممکن نہ تھا۔

کہنے لگے اپنا ناقص علم اپنے پاس ہی رکھو، میں حضرتِ آدمؑ کو اپنا باوا مانتا ہوں، جن کی پیدائش کسی بھی عورت کی مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ ایک عورت یقیناً ان کی وجہ سے وجود میں آئی۔ہم نے کہا چلیں یونہی سمجھ لیں کہ باوا آدمؑ کی اس دنیا میں آمد ایک عورت کہ وجہ سے

انسان نے لٹریچر میں "اڑن کھٹولے" کا تصور دیا اور آج جہاز پر اڑتا پھرتا ہے۔ جامِ جم کو ٹی وی کی صورت میں پالیا،عمرو عیار کی زنبیل انٹرنیٹ پر گوگل کی صورت میں موجود ہے،شہزادے کا جو تیر اپنے شکار کا پیچھا کیا کرتا تھا آج ہم اس کو میزائیل کے نام سے جانتے ہیں۔

ہوئی، تو گویا آپ کی اس دنیا میں آمد بالواسطہ ایک عورت کی ہی مرہونِ منت ہے۔ بڑبڑا کر کہنے لگے، ہونہہ بطور سزا ہی آمد ہوئی نا! ہم نے پوچھا محسن بھائی کیا آپ کو عورت ہر روپ میں بری لگتی ہے؟ کہنے لگے ہاں ہر روپ میں،بہن، بیٹی، بیوی، ساس، سالی اور حتیٰ کہ افسر کے روپ میں تو زہر لگتی ہے۔ ہمنے پوچھا کیا ماں کے روپ میں بھی؟ ایک دم سے چہرے کے تاثرات بدل گئے، آواز رندھ گئی، آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا اور کہنے لگے بس یہی تو ایک روپ ہے جو مجھ کو صحیح عمر میں مل نہ سکا۔ اگر میرے لڑکپن میں جب انسان کی تربیت کے لیے ماں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس وقت میری ماں اس دنیا سے کوچ کر گئیں اور میں چچی، تائی، ممانی، خالہ، بھابھی اور خدا جانے کن کن رشتوں کے ہاتھوں پلتا رہا اور۔۔۔اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت کو نہ تو تحریر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔صرف اور صرف محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

**سندیسہ**

رضائی کوئی پیٹی سے نکالے
کہ اب سرما بہت سرما گیا ہے
ٹھٹھرتا ہوں مَیں کمبل میں مکمل
"اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے"

**محمد عارفؔ**

**نقطہ**

ایک ہیرا ہے اِک نگینہ ہے
اپنی اپنی جگہ پہ ہر نقطہ
میری رائے سے اختلاف نہ کر
ڈال "مودی" کی "ڈ" پر نقطہ

**محمد عارفؔ**

**پریس کانفرنس**

آپ کہتے تھے سنور جائیں گے حالات جناب!
بیٹھیے آپ ، بہت خوب ، سوال اچھا ہے
میری تم سب سے گزارش ہے گھسیٹو اس کو
جس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

**محمد عارفؔ**

**خوش فہمی**

کڑاہی تلے آگ جلنے لگی ہے
میں سمجھا پکوڑے یہ تلنے لگی ہے
مگر کیا بتاؤں جو لایا تھا بیسن
اسے گھول کر منہ پہ ملنے لگی ہے

**محمد عارفؔ**

### واردات

فون کر کے میں روز ایمو سے
بات کرتا ہوں اپنی چھیمو سے
اپنی وڈیو شیئر میں کرتا ہوں
چھپ کے کمبل میں شب کو ریمو سے

**ڈاکٹر عزیز فیصل**

### لیپ کا سال

سرکاری ڈیوٹی میں بعض اوقات ہمیں
ایک اضافی بوجھ اٹھانا پڑتا ہے
لیپ کے سال میں ہم سرکاری بندوں کو
اک دن زائد آفس جانا پڑتا ہے

**ڈاکٹر عزیز فیصل**

### خانگی مصلحت

اس نے ماشے کو مصلحت کے تحت
صدق دل سے کہا کہ "تولا" ہے
صبح صادق کے وقت "صادق" نے
اپنی بیگم سے جھوٹ بولا ہے

**ڈاکٹر عزیز فیصل**

### صدرِ تقریب

سن کے گھنٹوں سخنوروں کا کلام
آدمی بور ہو بھی سکتا ہے
صدر تقریب دو منٹ کے لئے
اپنے صوفے پہ سو بھی سکتا ہے

**ڈاکٹر عزیز فیصل**

### غلط تشخیص

دیکھ کر اتنی خون کی الٹی
ہم نے ٹی۔بی زدہ انہیں جانا
پان کو وہ چبا کے کہنے لگے
تم نے بھائی غلط ہے پہچانا

**ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی**

### آشوبِ چشم

آبدیدہ خوں چکیدہ تھا فراقِ یار میں
ڈھل گئی تھی آنسوؤں میں ایک عاشق کی صدا
عشق پُر آشوب میں تھا مبتلا لیکن اسے
ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دے دی آنکھوں کی دوا

**ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی**

دل میں اِدھر ہو جوش، اُدھر شانتی بھی ہو اس پالیسی کو قوم مگر مانتی بھی ہو (عبدالباری آسی)

## لڑکھڑاہٹ

آ گیا شوہر ذرا جذبات میں کچھ اس طرح
جو مسائل منہ میں آئے سب سناجی کہہ گیا
اِس قدر جوتے پڑے شوہر کو بیوی سے جناب
بس خطا اِتنی ہوئی کہ اس کو "باجی" کہہ گیا

**سید فہیم الدین**

## UN-جام

گریباں چاک لے کر آ گئے ہیں
وہاں سے خاک لے کر آ گئے ہیں
گئے تھے قرض واپس مانگنے کو
یہ ٹوٹی ناک لے کر آ گئے ہیں

**سید فہیم الدین**

## میٹھا پان

پان والے نے کہا ، منہ کا بتاؤ تم ناپ
"پان" کو اُلٹیں گے تو "ناپ" بنے گا بھائی!
پہلے لڈو کے لئے ناپ ضروری تھا مگر
اب تو پنواڑی بھی گویا ہے بنا حلوائی

**تنویر پھول**

## ساس اور داماد

"ساس" تو ساس رہی، سب نے بہت کوشش کی
اور "داماد" کو اُلٹا بھی تو "داماد" رہا
رہنا ہشیار سدا ورنہ ڈرامے ہوں گے
یہ وہ رشتے ہیں کہ جن کا نہیں سیدھا اُلٹا

**تنویر پھول**



## شیر کی داڑھی

شیرِ مادر پر پلا انساں ، ہُوا آخر ضعیف
مولوی صاحب! کبھی تھے آپ بچے شیر خوار
رفتہ رفتہ "شیر" اُلٹے تو بدل کر "ریش" ہے
گر نہ ہو معروف "ی" تو ہے درندوں میں شمار

**تنویر پھول**

## شکر

بے صبر کیوں ہوا ہے، ادا کر خدا کا شکر
بجلی تو آ گئی ہے بڑی التجا کے بعد
پانی کا اس لیے بھی ابھی کال ہے پڑا
"اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

**محمد ظہیر قندیل**

## الیکشن میں

پھل، غذا، فیس، دوا اور یہ بل، یا اللہ!
"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے"
پر ٹکٹ لیں گے تو "ری ٹرن" عدم کا، کیوں کہ
"مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

محمد ظہیر قندیلؔ

## چھوٹے میاں

صرف نالائق نہیں کچھ
محکمہ ہی ریلوے کا
فیل ہو جاتا ہے انجن
ہاں ہماری ریلوے کا

محمد ظہیر قندیلؔ

## ہمارے ہوٹل

یہ فضیلت ہے ہمارے ہی وطن کو حاصل
اور ملکوں میں کہاں اس کا چلن ہوتا ہے
بھول کر بھی اُسے ہوٹل نہیں کہتے ہیں ہم
کاکروچوں سے تہی جس کا کچن ہوتا ہے

نوید ظفر کیانیؔ



## پی آر

ایک شاعر مجھ سے فرمانے لگے
شعر گوئی آپ پر جچتی نہیں
آپ کو شاعر کوئی کیسے کہے
آپ کی پبلک ریلیشن ہی نہیں

نوید ظفر کیانیؔ

## مشتری ہوشیار باش!

اِک "نارکوٹکی" نے کہا نار، دوٹکی!
کیوں نیو ائر کی رات میں تم بے حجاب ہو
ہم تم کو کر رہے ہیں گرفتار اس لئے
"مستی ہے جسمیں پیار کی، تم وہ شراب ہو"

عبدالحکیم ناصفؔ

## شادی مبارک

اے نواسی! تمھاری شادی میں
"مودی ماموں" کا بھی ہوا آنا
سب چھوارے تنازعات ہوئے
اور تقسیم ہو گئے نانا

عبدالحکیم ناصفؔ

## المیہ

ذات کے مرد ہیں ہم باز نہیں آ سکتے
حُسن کو دیکھ کے فوراً ہی پھسل جاتے ہیں
پھر ہمیں بیوی جب آنے نہیں دیتی گھر میں
جا کے فرزانہ کی باتوں سے بہل جاتے ہیں

**حمّاد حسن**

## امرِ حقیقی

دل کے بہلانے کا وہ سامان ہیں
سب کی محبوبائیں اُن کی شان ہیں
نوے فیصد شوہروں کی رائے میں
بیویاں تو بس بلائے جان ہیں

**حمّاد حسن**

## جیسی کرنی ویسی بھرنی

بہو کی سُن سُن کے بذلہ سنجی
پھر کے کیوں تلملا رہی ہو
ہمیں بھی سب کچھ ہے یاد بیگم
جو تم نے بویا وہ پا رہی ہو

**مرزا عاصؔی اختر**

## حقِ ہمسائیگی

یا خدا کیسے ہیں یہ ہمسائے
دن میں دس بار جن کا آنا ہوا
قرض اخبار سی ڈیاں جھاڑو
ان کو لوٹائے اک زمانہ ہوا

**مرزا عاصؔی اختر**

## نظر لگتا ہے

ایسی اُردو ہے انہیں کا خاصا
جن کو سنتے ہیں تو ڈر لگتا ہے
اور لوگوں کو نظر لگتی ہے
خان صاحب کو نظر لگتا ہے

**روبینہ شاہین بیناؔ**

## خان

خانم آ گئے خان بچھا ہے
جان بچھی ہے آن بچھا ہے
یوں ہے زور و زر کے آگے
جیسے دسترخوان بچھا ہے

**روبینہ شاہین بیناؔ**

نوید ظفر کیانی

# مزاح کے سر پر

**وہ** دور لد گیا جب مشاعروں میں طنز و مزاح کو "سویٹ ڈش" کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ عموماً پورے مشاعرے میں ایک مجہول قسم کا شاعر ہوا کرتا تھا جو اپنے کلام سے اہلِ مشاعرہ کو محظوظ کیا کرتا تھا اور اس محظوظ کرنے کے چکر میں وہ ایسی حرکتوں کا مرتکب ہو جایا کرتا تھا جو دوسروں کے لئے تو تعفنِ طبع کا باعث بن جایا کرتی تھیں لیکن خود اُس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو مجروح کر دیا کرتی تھیں۔

اولاً تو وہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے چکر میں اپنے نام کے ساتھ تخلص کا ایسا دُمچھلا لگا دیا کرتا تھا جو عموماً مزاحیہ اور بعض صورتوں میں مضحکہ خیز ہوا کرتا تھا مثلاً جوکر، احمق، گیدڑ، نامعقول، گھامڑ، آلو وغیرہ۔ ایسا تخلص جو اگرچہ فوری توجہ کا مستحق ہوتا تھا لیکن جسے سُن کر بندہ نہ صرف مسکرانے لگتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں مضحکہ بھی اُڑانے لگتا تھا۔ اب آپ ہی خدا لگتی کہیئے کہ جو بندہ اپنے تئیں نامعقول، گھامڑ یا مسخرہ بن جاتا ہو، اُسے دوسرے لوگ بھی ویسا ہی نہ سمجھیں گے تو کیا سمجھیں گے؟

اسی طرح مشاعرے میں مزاحیہ شعراء کو ایسا بھیس بھی بھرنا پڑتا تھا جسے پہن کر وہ نہ صرف یہ کہ شاعر نظر آئے بلکہ مزاحیہ شاعر بھی دکھائی دے۔ گویا اس ضمن میں وہ "دوھری اذیت کے گرفتار مسافر" ہوا کرتے تھے۔ اپنی مخصوص حیثیت کے مطابق اپنا ظاہری حلیہ مثلاً چولا، ٹوپی، چہرے کی تراش خراش بھی جس میں شامل تھی، یہی ان کی پہچان ہوتی تھی چاہے دیکھنے والوں کی نظروں میں اُن کے لئے وہ احتراماً دوسروں کے لئے ہوا کرتا تھا، نہ رہے۔ بعض شعرا تو ایسا سوانگ بھی بھرا کرتے تھے کہ اُن کی جنس بھی مسئلۂ کشمیر دکھائی دیتی تھی۔ مثلاً ریختی کے شاعر زنانہ گیٹ اپ میں مشاعرے میں شرکت کیا کرتے تھے۔ زنانہ اداؤں اور حرکات و سکنات سے اپنی ریختی پر مبنی کلام سنایا کرتے تھے جو کہ بذاتِ خود زنانہ بلکہ زنانہ ترین ہوا کرتا تھا۔

مزاحیہ شاعری کے مندرجہ بالا لوازمات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو عصرِ حاضر میں طنز و مزاح کے دعویدار شعرا خال خال، بلکہ سرے سے ہی مفقود دکھائی دیتے ہیں۔ اب سید فہیم الدین ہاشمی کو ہی لے لیجئے، ایک تو سید بادشاہ اور اوپر سے فہیم الدین، لگتا ہے کہ کسی سکہ بند نثاخوان کا نام لیا جا رہا ہو، ظاہری شکل و صورت کو دیکھیں تو کسی سرے کُھرے سے ہنسی پیدا کرنے والی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بات کریں تو ایسا متین و فصیح بیان کہ کسی قسم کی چلبلاہٹ کا شائبہ بھی نہیں۔ آواز ایسی مردانہ کہ جس میں گئے دور کے مزاحیہ شاعروں کی لچک مٹک کا نام و نشان بھی نہیں اور اس پر چلے ہیں مزاحیہ شاعری کرنے۔۔۔ اُونہوں۔

خیر اس باب میں سید فہیم الدین ہاشمی کا کیا مذکور، سبھی مزاحیہ

شاعر اس حمام میں ۔۔۔۔ ہیں۔ کس کس کا نام لیجئے؟ خالد عرفان، سید ضمیر جعفری، انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، سرفراز شاہد، ڈاکٹر مظہر حسین رضوی، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی وغیرہ وغیرہ بلکہ ایک مزاحیہ شاعر، خالد مسعود خان تو شعر پڑھتے ہوئے ایسا پکا منہ بنا لیتے ہیں کہ سننے والا تو دوہرا ہو ہو جاتا ہے لیکن مجال ہے کہ ان کے مرین چہرے پر ہنسی کی تحریک تو کجا مسکراہٹ کی لکیر بھی ابھرنے پائے۔

"مزاح کے سرپر" سید فہیم الدین کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے قبل قریباً بارہ سال قبل وہ پہلی اننگ "ہزل در غزل" کی کھیل چکے ہیں اور طنز و مزاح کے خاصے تجربہ کار اور مشاق کھلاڑی بن چکے ہیں، چنانچہ "مزاح کے سرپر" والی اننگ میں ان کے جوہر خاصے کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ موصوف نے آگے بڑھ بڑھ کر چوکے چھکے لگائے ہیں حالانکہ دو تین برس قبل ایک فیس بکی ملاقات میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ؎

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن

لیکن کتاب کے سرِ ورق پر بنی ہوئی اُن کی تصویر سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کس قدر عرق ریزی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔۔۔ افوہ، معاف کیجئے گا، ہوسکتا ہے کہ سرِ ورق پر جو سر دکھایا گیا ہے، وہ اُن کا ذاتی نہ ہو بلکہ کسی سے عاریتاً مانگا گیا ہو لیکن کتاب کے اندر جو مال سجایا گیا ہے اُسے ملاحظہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ اس میں موجود مزاح کی ہر ریسپی نہایت دلجمعی سے تیار کی گئی ہے۔ واللہ العالم۔ ویسے کتاب کے ناشر محمد ممتاز راشد صاحب نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ کتاب کا نام خود فہیم صاحب نے اپنے اس شعر سے اخذ کیا ہے ؎

مزاح کے سر پہ اُسترا سا چلا رہے ہیں مرے لطائف
کہیں سے کوئی بھی ایک بندہ جو مسکرائے تو ہم سے کہنا

سیفؔ الدین سیف نے کبھی کہا تھا ؎

سیفؔ اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

اور یہ ہے بھی حقیقت، ہماری کلاسیکی شاعروں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہمہ اوقات زنان خانے میں گھسے رہتے تھے اسی طرح آج کل کے بعض مزاحیہ شاعروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سسرال میں گھسے رہتے ہیں لیکن آج کے دور میں کامیاب مزاح نگار شعراء وہی ہیں جو طنز و مزاح کے نئے نئے افق ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ یہ افق چاہے اندازِ بیاں کے ہوں یا موضوعات کے۔ اکثر شاعر ایسے بھی ہیں جو زبان و بیان میں نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں اور یوں لفظوں کی بساط پر شاعری کے مہرے چلاتے رہتے ہیں۔ اُنہیں لفظوں کو اُلٹ پلٹ کر اُس سے مزاح کشید کرنا خوب آتا ہے۔

فہیم کا اندازِ بیاں اگرچہ روایت کی دھونی رمائے ہوئے ہے لیکن اُنہوں نے بیشتر مزاحیہ شاعروں کی طرح اپنی مزاح نگاری کو محض سسرال میں گھر داماد بنا کر نہیں رکھا ہے بلکہ عصرِ حاضر کے ہر قابلِ ذکر موضوع سے چھیڑ خانی کی ہے۔ مثلاً

یہ لندن شہر سے یا رو سیاست کے تھیٹوں کا
بنا کر کوئی افسانہ، بلا کھٹکے چلے آنا

یہاں دال ملنا محال ہے، نہ روپے نہ ڈالر و مال ہے
یہاں دال ملنا محال ہے تو بٹے گی جوتوں میں دال کیا

بصد اصرار گاتے ہیں کئی تو پاپ گانے بھی
اگر ہم ہنہناتے ہیں تو دنیا چیخ اُٹھتی ہے

گورے معاشیات میں آگے نکل گئے
اور ہم بھی کا غذات میں آگے نکل گئے

زمانے بھر کے بلیک میلر، صحافیوں دے خدا بچائے
تڑی لگاتے ہیں یہ ڈرا کر، صحافیوں دے خدا بچائے

خانگی زندگی سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور اس سے چٹخارے لینا ہر مزاحیہ شاعر کا پیدائشی استحقاق ہے اور یہ روایت اُردو کے اولین مزاح نگار شاعر جناب جعفر زٹلی سے لے کر خالد عرفان تک ہر شاعر کے گلے پڑی ہوئی ہے، گویا ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

فہیم بھی اس کے تیرِ نظر کا نشانہ ہیں اور بُری طرح گھائل ہیں۔ ان کی تقریباً ہر ہزل میں اس کے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں۔

کیا ہوا شوہر بنے بیوی ملی اور مَنک گئے
جو کبھی تھے آہنی فولاد سب بیمار ہیں

ترے میکے سے آجانے کے دن ہیں
مرے تو کوچ فرمانے کے دن ہیں

ہمارے پلے یہ کیسی بیوی کو تم نے باندھا ہے اے عزیزو!
کہ جس کو آتا نہیں ہے کوئی بھی کام کرنا، پکوڑے تلنا

ساس نے دل کو جلایا مفت میں
اور بیگم نے ستایا مفت میں

فہیم کے مزاج میں اب تک جوانی کی وہی جولانی جھلکتی ہے جو اُس کی ابتدائی ہزلوں کا خاصا رہی ہے۔ گویا اُن کے ہاں عمر کا پہیہ اُلٹا گھوما ہے۔ عمر، تجربات اور وقت نے اُن کی حسِ مزاح کو مزید چلبلاہٹ اور بیساختگی سے روشناس کیا ہے۔

کبھی منگل کو آ جانا کبھی جمعے کو پٹنا ہے
طوافِ گرلز کالج کو کبھی اتوار میں رہنا

اثر کیا پوچھتے ہو اُس پری کا
کہ جادو چل گیا ہے سامری کا

ہمارا دل یہیں پر کھو گیا ہے
تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا

فہیم کی شاعری کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس پر اُس کو پورے نمبر ملنے چاہئیں اور وہ ہے چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی بڑی باتیں کرنا۔ یہ خوبی اُن کی سنجیدہ شاعری میں بھی موجود ہے اور مزاحیہ شاعری میں بھی، اب انہیں شعروں کو دیکھ لیجئے۔

اُن کو مآل کا کیا ہے کھٹکا
فکر جنہیں بس مال کی ہے

میم صاحب ہیں وہ دکانوں میں
اور گھر میں سنبھالنا پردہ

بیگم کرتی ہے ترلے
دال میں کوئی کالا ہے

خوب چین پائے گا
افسروں کی مالش کر

عشق کا بھوت بھاگ جائے گا
تیرے بوتھے پہ ایک لگ جائے

یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی مٹھائی والے نے تازہ تازہ لڈو نکال کر تھال میں سجائے ہوں۔

طنز اور مزاح میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خدا معلوم ان میں چولی کون سی ہے اور دامن کس کا ہے لیکن ان دونوں کے دوھرے پھل نے ظرافت نگاروں کو ایک ایسا ہتھیار مہیا کر دیا ہے جس کو استعمال کر کے وہ خاصے جارحانہ انداز میں تیغ آزمائی کر سکتا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے کہیں کہا تھا کہ بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد اور تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ فہیم کے ہاں معاشرے کی دو عملی پر برہمی ضرور پائی جاتی ہے لیکن اُن کی برہمی میں بھی شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اُنہوں نے طنز کے نشتر کو اس کمال کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ آپریشن بھی کر جاتے ہیں اور مریض کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

اگر اس ملک میں ہم لیڈروں سے خون مانگا تو
ہم اپنے ورکروں کو ملک پر قربان کر دیں گے

فہیم اُن کے لئے جائز ہے سب کچھ
ہمارے واسطے معیوب ہیں گے

پیروڈی کہ جسے نذیر احمد شیخ نے تقلیدِ معکوس سے تعبیر کیا ہے، بعض مزاحیہ شاعروں کی پہچان بن کر رہ گئی ہے۔ بہت سے ایسے مزاحیہ شاعر بھی ہیں جو اس حوالے سے زیادہ جانے جاتے ہیں مثلاً نذیر احمد شیخ، عاشق غوری، مجید لاہوری، محمد عاصی اختر

وغیرہ۔ پیروڈی تنقید کی نہایت لطیف شکل ہے لیکن کارگر عام تنقید سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ظرافت نگار کسی بھی ادبی کاوش کو اُس کی انحرافی لیکن متبادل سمت میں اس قدر رفنکاری سے قلمبند کرتا ہے کہ اُس کاوش کا مفہوم بالکل الٹ جاتا ہے لیکن ادبی نظم و ضبط اُسی کاوش کی تصویر کشی کرتا محسوس ہوتا ہے۔

سید فہیم الدین نے بھی اس میدان میں گھڑسواری کی ہے اور وہ اس میں اپنا ایک جدا انداز رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے شعراء کی پیروڈیاں لکھی ہیں اور نہایت کامیاب وارداتیں کی ہیں۔ مثلاً غالب کی زمین پر ہل چلاتے ہوئے کہتے ہیں:

ہاتھ میں لاٹھی پکڑ کر عشق فرمائیں گے کیا
بابا جی کچھ اور دن بھی آپ جی پائیں گے کیا

شاؔد عارفی سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ترے میکے سے آجانے کے دن ہیں
مرے تو کوچ فرمانے کے دن ہیں
وطن کے دفتروں میں آج کل تو
اِدھر دینے اُدھر پانے کے دن ہیں

انور شعور صاحب کا یہ شعر تو آپ نے سُن رکھا ہوگا۔

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

فہیم کہتے ہیں

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے سُن ہو جاتا ہوں
ایک ہی سگریٹ پی کر میں تو ٹُن ہو جاتا ہوں

وہ جون ایلیا کے ان اشعار کی پیروڈی کی داد تو خود مرحوم شاعر سے بھی وصول کر چکے ہیں۔

ہے خبر میری کوئی ڈان میں کیا
کچھ ملایا تھا تم نے پان میں کیا
"یہ تجھے چین کیوں نہیں پڑتا"
درد حد سے سوا ہے کان میں کیا؟
اپنی زوجہ کے ساتھ اب میری
"عمر گزرے گی امتحان میں کیا؟"
اپنی بیوی کے سامنے چپ ہو
"آبلے پڑ گئے زبان میں کیا؟"

فیض احمد فیض پر یار لوگوں نے خاصے ہاتھ مارے ہیں۔ اُن کا ایک مشہور قطعہ ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے ویرونے میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

اِس قطعہ پر فہیم نے بھی ہاتھ ڈالا ہے اور اس قدر زوردار ہاتھ ڈالا ہے کہ واللہ پڑھ کر لطف آ جاتا ہے۔

رات یوں دل تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے گھر میں کوئی لینے کو ادھار آ جائے
جیسے شادی میں چلا آئے کوئی کی کمیں
جیسے کچرا کوئی لینے کو چمار آ جائے
جیسے بدہضمی معدہ کو بھی مل جائے سکوں
جیسے دو چار برس بعد ڈکار آ جائے
دیکھ کر اُن کی نگاہوں کے کٹوروں میں ذرا
نشہ چھا جائے ہمیں خوب قرار آ جائے
ایسا عالم کہ چونی ہو کسی شیخ کی گم
پہلے یرقان ہو پھر کالا بخار آ جائے
جیسے برتن سے کھڑکنے لگیں گھر میں یکسر
جیسے بُھولا ہوا کنگال سا یار آ جائے
جیسے اِک وجد میں اُس شوخ سے کھا کر تھپڑ
دل کو آرام جوانی کو قرار آ جائے
فیض کی روح کرے جیسے مقدمہ ہم پر
لکھنے والے پہ بھی اللہ کی مار آ جائے

سید فہیم الدین کے نانا اور مشہور شاعر جناب نیاز گلبرگوی نے "ہزل در غزل" میں اُنہیں اُردو ادب کا بانکا شہسوار قرار دیا ہے۔ دعا ہے کہ وہ اس وادیٔ پُرخار میں ابھی اور بہت آگے تک جائیں اور ایسی بہت سی بنسوز کتابیں اُن کی زندگی کا سنگِ میل بنیں۔

سیّد ممتاز علی بخاری

# بے درد سعید

سیّد بدر سعید نے ادب اور صحافت کی دنیاؤں میں تہلکا مچا رکھا ہے۔ شاعری، نثر، طنز و مزاح، فیچر نگاری، انٹرویو۔۔۔غرض ادب و صحافت کی کوئی بھی صنف ان کے "ظالم و جابر" قلم کی "تباہ کاریوں" سے بچ نہ پائی۔ یہ اور بات ہے کہ موصوف قلم کی جگہ پنسل کا استعمال کرتے ہیں۔ایک دور میں موصوف مُردوں کو خوش کرنے کے واسطے گڑھے مردے اکھاڑا کرتے ہیں اور ان کے تعزیت نامے لکھا کرتے تھے۔ بدر سعید ہر مہینے کسی نہ کسی کے "اوپر" جانے کی اطلاع دیا کرتے تھے۔اس شعبے میں ان کی شہرت چار سو پھیل گئی تھی اور انہیں ایک طرف تو تعزیت نامے لکھنے کی روزانہ بیسیوں درخواستیں موصول ہوتی تھی تو دوسری طرف ان کے کئی تعزیت نامے (جو بلا اجازت لکھے گئے تھے) پڑھ کر متذکرہ مرحوم شخصیات دادرسی کے لئے عدالتِ عظمیٰ کی ''سوموٹو ایکشن'' والی ''زنجیرِ عدل'' بھی کھینچتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں بدر کے اس ناروا ظلم سے نجات دلائی جائے۔ایک مرتبہ موصوف کے مرنے کی خبر پر ان کے حلقہ احباب میں خوب کھلبلی مچی تھی لیکن کسی نے ان کا تعزیت نامہ لکھنے کی جسارت نہ کی۔آخر کار یہ سعادت بھی ہمارے نصیب میں آئی لیکن وائے ناکامی کہ اگلے دن انہوں نے اپنے مرنے کی تردید کی اور یوں تعزیت نامے کی تردید ہوگئی۔۔۔

بدر سعید دنیا سے تیز بلکہ تیز تر چلتے اور دوڑتے ہیں اسی لیے تو بائیس سالہ زندگی میں عشق کا ساٹھ سالہ تجربہ حاصل کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں آج کل ایک میگزین میں نوجوان عُشاق کو عشق کے وہ طریقے سکھانا شروع کر رکھے ہیں جو کئی مرتبہ خود ان کی پٹائی کا باعث بھی بنے۔عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص پر تو لوگ مرتے ہیں لیکن چیپ شاہ کے نزدیک بدر سعید کا نام اکثر لوگوں کے لیے آبِ حیات کا سا اثر رکھتا ہے بالخصوص صنفِ نازک کے لیے۔۔۔!! لڑکیاں جوق در جوق ان کی عقیدت مند بنتی جا رہی ہیں اور جہاں بدر سعید تشریف فرما ہوں وہاں کبھی جلوہ کبھی پردہ کے بے شمار مناظر ہر شخص بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ایک مرتبہ ایک جگہ موصوف کے ساتھ ہم چند دوست بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے کہا چانک سامنے موجود بلڈنگ کی تیسری منزل سے ایک کھڑکی کھلی اور ایک آفتاب و ماہتاب چہرہ نمودار ہوا۔دس پندرہ منٹ گزر گئے لیکن محترمہ کی نظر ہم سے ہٹنے ہی نہ پا رہی تھی۔ ہم اس صورت حال سے پریشان ہو گئے اور جلدی جلدی اپنے جیب سے موبائل نکال کر اپنی تصویر کھینچی اور لگے معائنہ کرنے۔۔۔!!

دراصل ہمیں یہ خدشہ لگا کہ دنیا کے عظیم ترین عجوبوں کی تعداد میں کہیں ہماری لاعلمی میں اضافہ نہ ہو گیا ہو اور نیا عجوبہ ہم خود نہ ہوں جو یوں ٹک ٹک دیکھے جا رہی ہیں ہمیں یہ محترمہ۔۔۔خیر جب ہم

ہے میزبانی کا یہ تقاضا کہ آئے مہماں تو مسکرا دو
مگر طبیعت یہ چاہتی ہے گلے ملو اور گلا دبا دو
(سرفراز شاہد)

ان کے اس انداز سے گھورنے کی کوئی وجہ نہ دریافت کر سکے تو ہم نے اپنی تشویش کا اظہار بدر سعید سے کیا تو وہ ہنس پڑے اور ہماری عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہنے لگے: یہ محترمہ آپ کی طرف نہیں بلکہ میری طرف متوجہ ہیں اور میں ان کا فیملی عاشق ہوں۔ "فیملی عاشق" کی یہ اصطلاح آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی بدر سعید نے ہمیں بتانے کی زحمت گوارا کی۔ موصوف کو لڑنے لڑانے کا بہت شوق ہے اس لیے تو عموماً ان کی زبان پر یہ شعر تھرکتا رہتا ہے

ماسٹر جی نے منع کیا تھا "اکھ" لڑانے سے
گویا اس سے "نک" لڑایا جا سکتا ہے

اڑوس پڑوس کی لڑکیوں کو مُفت میں خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بدر سعید آدھے سے زیادہ وقت اپنی طالبات کو اپنی شاعری، مزاح اور دوسرے تخلیقی فن پارے پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر کوئی طالبہ ان کا دیا ہوا سبق یاد نہ کرے تو پھر اُس کی شامت آ جاتی ہے اور اسے سزا کے طور موصوف کی دو تین غزلیں یاد کرنے پر ہی معافی ملتی ہے۔

گرل فرینڈز کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی اور دوسرے کی گرل فرینڈ میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے، سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ جب بھی کہیں سے دعوت ملتی ہے اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اکثر اوقات تو "قبول ہے" کی گردان بھی الاپتے رہتے ہیں لیکن ہنوز کنوارے ہیں۔ موصوف کی منگنی کی افواہیں حکومت کی تبدیلی کی خبروں سے زیادہ پھیلتی ہیں۔ یوں لگتا ہے ان کی شادی پر ان کے مداح عبداللہ کی طرح دیوانے بنے رہیں گے۔ کچھ لوگوں نے پیروں فقیروں کے پاس جا کر اُن کی شادی کے لیے خصوصی دعائیں بھی کروائی ہیں لیکن ابھی تک کسی دعا کی قبولیت کے آثار نظر نہیں آ رہے۔ ان کے مداحوں کو ان سے یہ گلہ رہتا ہے کہ کال ریسیو نہیں کرتے اور میسج کا جواب نہیں دیتے لیکن جب یہ کسی کے گلے پڑ جائیں تو جاب چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بدر سعید فون پر تو موجود نہیں ہوتے۔ ہاں !! سوشل میڈیا پر اکثر دکھائی دیتے ہیں۔

ایک مشاعرے کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کر رہے تھے۔ جب فنا نظامی کی باری آئی تو مہندر سنگھ نے کہا کہ حضرات اب میں ملک کے چوٹی کے شاعر حضرت فنا نظامی کو زحمت کلام دے رہا ہوں۔ فنا صاحب مائک پر آئے سحر کی پگڑی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے: حضور چوٹی کے شاعر تو آپ ہیں میں تو داڑھی کا شاعر ہوں۔

بدر سعید دورِ حاضر کے عظیم فیچر نگار ہیں۔ عموماً اُن کے مسائل میں ہاتھ ڈالتے ہیں جن سے ہر کوئی کتراتا پھرتا ہے۔ اسی لیے تو انہیں خطرناک دھمکیاں بھی ملی ہیں یہاں تک کہ کچھ لوگ انہیں جنت میں بھجوانے کی پیشکشیں بھی کی ہیں۔ پرویز مشرف کی طرح یہ بھی کسی سے ڈرتے ورتے نہیں ہاں رات کو گھر سے باہر نکلتے وقت چھوٹے بھائی کو ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں شاید اسے بھی نڈر رہنے کی ٹریننگ دیتے ہوں ہوں اس طرح ۔۔۔!! بدر ہر کام بلا معاوضہ کرتے ہیں یہاں تک کہ عشق بھی ۔۔۔!! عوام کی بے لوث خدمت کرنے کی خاطر بالکل مُفت میں لکھتے ہیں اور اُن کے مداح اور قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ موصوف کی سٹیل ملیں چل رہی ہیں یا پھر گلبرگ میں پراپرٹی کا کاروبار ہیں۔

ہمارے ذرائع کے مطابق اُن کی دوسری کتاب "مُفت میں" جلد قارئین کو دستیاب ہو گی۔ بدر جہاں بھی جاتے ہیں داستان رقم کر آتے ہیں ہیں۔ ایک روز اسی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر مکتبہ داستان چلے گئے اور تب سے وہاں داستانیں رقم کر رہے ہیں۔ ایک عرصے میں بدر "حکایت" کے انویسٹی گیشن سیل کے انچارج بن گئے ہیں لگتا ہے کہ انسپکٹر محبوب عالم، احمد یار خان، انسپکٹر شجاع کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ "حکایت" میں کتابوں پر تبصرے بھی کر رہے تھے۔ تبصروں سے کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو، ان کی لائبریری نے دن چوگنی رات اٹھنی ترقی کی۔

اعزازی میگزین اتنے آتے ہیں کہ خدا کی پناہ!! جو دا کیہ ان

احمد ندیم قاسمی کی ایک عزیزہ نے اردو ایم اے کا امتحان دیا تو پتا چلا کہ اس کے پرچے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے پاس چیک کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ قاسمی صاحب سفارش کے لیے اس عزیزہ کو ساتھ لے کر صوفی صاحب کے گھر پہنچے۔ صوفی صاحب دعا سلام کے بعد فوراً ہی اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے، جب وہ کافی دیر تک باہر تشریف نہ لائے، تو قاسمی صاحب کو صوفی صاحب کے برتاؤ پر بہت افسوس ہوا کہ چائے پوچھی نہ آنے کا مقصد سنا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اتنے میں صوفی صاحب ایک پرچہ ہاتھ میں لیے باہر آئے اور اسے قاسمی کو دیتے ہوئے پوچھا کہ فرمایئے، اس میں کتنے نمبر دے دوں؟ قاسمی صاحب اس پر بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اس کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اس پر صوفی صاحب بولے "بھئی کل ۲۳ پرچے میرے پاس آئے تھے اور ۱۳ اصحاب اس سے پہلے میرے پاس سفارش کے لیے آچکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اس آخری پرچے کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔"

کے گھر ڈاک دینے آتا ہے وہ بھی آدھا ادیب اور ادب نواز بن گیا ہے۔ موصوف کو ہر ڈاک ایک ہفتہ دیر سے ملتی ہے کیونکہ ڈاکیے کے محلے کے اور لوگ بھی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب تو اکثر اوقات موصوف کی دو تین نئی غزلیں سننے کے بعد ہی اپنی ڈاک ملتی ہے۔ فار مین کرسچن کالج کے ادبی حلقے کے صدر بھی رہ چکے ہیں کسی نے موصوف سے ان سے اس ادبی نام کی وجہ تسمیہ پوچھی تو کہنے لگے: "ہم اہلِ بزم کالج میں آنے والی ہر لڑکی پر نظر رکھتے ہیں اور ہماری سپروائزر اُن طالبات کے مستقبل کی فکر کرتی ہیں یوں ہم بزمِ فکر و نظر کا کام چلا رہے ہیں۔ "

موصوف نے اپنی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام کئی عالمی مشاعرے بھی کروائے جس میں لاہور کے تمام چھوٹے بڑے شعراء کو دعوت دی گئی۔ بدر ان لوگوں میں سے ہیں جو پانی مین رہنے کے باوجود مگرمچھ سے بیر رکھتے ہیں۔ ایف سی کالج کے طالب علم ہوتے ہوتے امریکہ کے ایسے ایسے راز افشا کرتے ہیں جن کا صرف اور صرف CIA کو علم ہوتا ہے اور صدرِ امریکہ سمیت باقی سب لوگ ان سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کی سنجیدہ تحریریں لوگوں کو ہنسانے کا کام دیتی ہیں۔ آپ شاید سمجھ رہے ہوں گے کہ لوگ ان پر یا ان کی تحریروں پر ہنستے ہوں گے۔ ہرگز نہیں لوگ تو اپنے آپ پر ہنستے ہیں جو حکمران طبقے کے سارے کرتوتوں سے واقف ہونے کے باوجود پھر انہی کو ووٹ دیتے ہیں۔

یہ حضرت اپنی تحریروں پر ڈاک ٹکٹ کا خرچہ نہیں کرتے۔ تحریریں رسائل کے دفاتر تک پہنچانے کے لیے موٹر بائیک استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی کو ان کے عظیم لکھاری ہونے پر کوئی شک ہو تو ان کے گھر مہمان بن کر آئیں۔ موصوف آپ کو ضرور اپنے مہمان خانے میں بٹھا کر آپ کی خاطر تواضع کریں گے۔ اس دوران آپ کی نظریں کمرے کا طواف کرتے ہوئے اُس شیشے کی الماری تک جا پہنچیں گی جو ٹرافیوں، شیلڈوں اور ان جیسی دوسری معلوم نامعلوم اشیاء سے بھری پڑی ہو گی۔

یقیناً آپ بھی ہماری طرح مرعوب ہو کر یہ پوچھیں گے کہ کیا یہ سب انعام میں ملی ہیں۔ یہ سوال کچھ بے جا نہیں کیونکہ اکثر ٹرافیاں ایسی خستہ حال ہوں گی کہ یوں لگے گا کہ کسی نے سزا کے طور پر ان کے حوالے کی ہوں۔ بدر سعید سے جب بھی رابطہ ہوتا تو ہم ان سے اُن کی تحقیقاتی کتاب کے بارے استفسار کرتے تو معلوم ہوتا کہ موصوف حسیناؤں کے تعاقب میں ہیں اور کتاب جلد ہی منظر عام پر آ جائے گی۔ ہم سمجھے کہ شاید یہ اپنے عشق کے ساٹھ سالہ تجربات کو زیبِ قرطاس کر رہے ہیں لیکن جب کتاب ہمارے ہاتھوں میں پہنچی تو ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے کیوں کہ وہ تو "خودکش بمبار کے تعاقب میں" تھی۔

سید بدر سعید نے اتنی کم عمری میں جتنا مقام پایا ہے اتنا کوئی بزنس مین کبھی ادب میں نہیں پا سکتا۔ بدر ایک ملی ترانے کی ڈائریکشن اور پروڈیکشن میں حصہ لے کر سلام پاکستان یوتھ ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

---

نہیں آتا ہے ان کو تیرنا چھوٹی سی نیا میں    سمندر کی مگر وہ ناپنے نکلے ہیں گہرائی    (نیاز سواتی)

سید بدر سعید

**امجد** جاوید اگر ناول نگار نہ ہوتے تو ڈبہ پیر ہوتے۔ان کے اندر ایک بابا بستا ہے، وہی بابا جو ہر موڑ پر اشفاق احمد کو مل جایا کرتا تھا۔شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ امجد جاوید میں منٹو کی روح سما گئی ہے۔اب یوں لگتا ہے جیسے منٹو نے تو سوچ ہے کھا لیے ہیں۔ایک دن کہنے لگے میں اور سعید واثق اکٹھے سوتے تھے ۔ہم نے حیرت سے کہا ،آپ ایسے بھی تھے؟ تو شرماتے ہوئے کہنے لگے اکٹھے سونے سے مراد یہ کہ وہ میرے روم میں رہتا رہا ہے یوں آپ اسے میرا روم میٹ کہہ سکتے ہو، امجد جاوید کا شمار ان ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے عشق کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیئے ۔ ایک دن اپنے مشہور ناولوں کا بتاتے ہوئے کہنے لگے پہلے میں نے عشق کا شین لکھا پھر عشق کا قاف لکھا، جو خواتین نے اتنے پسند کیے کہ گھر والوں نے جلد از جلد میری شادی کروا دی ہم نے پوچھا اس کے بعد کیا ہوا کہنے لگے:"ہونا کیا تھا؟ پھر مجھے "تاج محل" لکھنا پڑا"

امجد جاوید کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ ایک مرتبہ حاصل پور کی ایک چھوٹی سی دکان پر کچھ شہری لڑکیاں ان کی کتب خرید رہی تھیں۔ اتنے میں موصوف نیا ناول لکھنے کی غرض سے کاپی پینسل خریدنے چلے آئے ۔دکاندار نے اپنے نمبر بڑھانے کے لیے کہہ دیا "لو جی! امجد جاوید صاحب خود ہی آ گئے۔ لڑکیوں نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑی ان کی کتاب کو دیکھا اور کتاب کاؤنٹر پر پھینکتے ہوئے کہنے لگیں "نہیں جی! ہم وصی شاہ سے کام چلا لیں گی" لڑکیوں کے جانے کے بعد دکاندار نے ان کی طرف دیکھا تو موصوف خالص پنجابی میں بولے:" ہن آرام ای؟"

امجد جاوید اچھے انسان ہی نہیں اچھے شوہر بھی ہیں ۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ کہیں بھی ہوا اپنی بیگم کا فون بہت توجہ اور دھیان سے سنتے ہیں۔اس دوران شکلیں کیسی بناتے ہیں یہ ایک الگ بات ہے ۔انھوں نے آج تک بیگم کی کوئی خواہش نہیں ٹالی۔بس فرق یہ ہے کہ وہ بیگم کسی اور کی ہوتی ہے، ویسے انکار کبھی اپنی بیگم کو بھی نہیں کیا،بس اتنا کہہ دیتے ہیں کہ "بھول گیا تھا" ۔امجد جاوید مساوات کے قائل ہیں، جتنا پیار اپنے بچوں کو کرتے ہیں، اتنا ہی محلے کے باقی بچوں کو بھی کرتے ہیں۔اسی لیے کچھ گھرانے انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں ۔

امجد جاوید کا نظریہ ادب کیا ہے اس بارے ایک گھاگ ادیب نے مجھ سے شرماتے ہوئے کہا کہ وہ کیچڑ سے کنول کا اٹھاتے ہیں پھر اس میں سے عشق حقیقی کی خوشبو کشید کر کے ہمیں تھما دیتے ہیں۔ جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف کنول ہی نہیں ہر قسم کے پھول سے اپنی مرضی کا رس نچوڑ لیتے ہیں اور اپنی مرضی کی خوشبو بانٹ دیتے ہیں۔ یہ خوشبو لینے والے کی قسمت کے وہ کیسی مہک محسوس کرتا ہے۔

آج کل لوگوں کو حوصلہ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں میڈیا نے قوم کو جتنا ڈرا دیا ہے وہ کیا کم ہے؟ اب قوم کو حوصلہ کی ضرورت ہے۔سو جس سے ملیں گے اسے حوصلہ دیتے نظر آتے ہیں ۔پبلشر کسی ادیب کو رائلٹی نہ دے تو اسے حوصلہ دیتے ہیں، کوئی بیمار ہو تو اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں، یہاں تک کہ

ایک دوست کے والد کی فوت ہوئے تو اسے گلے لگا کر بولے: "حوصلہ کر ۔۔۔ اللہ اور دے گا" ایک مرتبہ ایک دوست کے گھر گئے ۔اس کی اکلوتی مرغی پکڑی، ذبح کی، خود ہی پکائی اور کھانے کے بعد کہنے لگے حوصلہ کر، اللہ اور دے گا ۔۔۔

امجد جاوید کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے بچے کی پیدائش پر ان کی ایک کتاب منظر عام پر آئی، پھر دوسرے بچے کی پیدائش پر انہوں نے دوسری کتاب لکھی جبکہ تیسرے بچے کی پیدائش پر تیسری کتاب لکھ ماری۔ اس کے بعد کچھ عرصہ قارئین ان کی اگلی کتاب کا انتظار کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے خود اپنے اگلے ناول کا انتظار ہے لیکن پلاٹ کہیں درمیان میں آ کر الجھ جاتا ہے۔ بلا آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور امجد جاوید نے دھڑا دھڑ کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔ آج ان کے 3 بچے اور 18 کتابیں ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ 18 یعنی ایک اور آٹھ کو جمع کر کے تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ بچوں اور کتابوں کا ایسا کمبی نیشن بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ امجد جاوید ایک عرصہ تک پاکستان کے بڑے اخبارات بشمول جنگ میں صحافتی ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ان دنوں وہ اخبار خواتین کے بیورو آفس کے انچارج تھے۔ ایک مرتبہ انجانے میں باس کے سامنے کسی ماڈل گرل کی تعریف کر بیٹھے جس کی پاداش میں انہیں شوبز کی بیٹ (رپورٹنگ) دے دی گئی۔ شوبز کی صحافت میں آنے کے بعد انہوں نے زیادہ تر کھیاں ماریں۔ کبھی کبھار کوئی بھنورا بھی مار لیتے تھے۔ ایک دن امجد جاوید اپنے آفس میں تشریف فرما تھے کہ ایک بھاری بھرکم خاتون دندناتی ہوئی ان کے آفس میں گھس آئی اور خالص پنجابی سٹائل میں دبکا مارتے ہوئے کہنے لگی "اوئے! تو میری کڑی دی فوٹو کیوں نئیں لاندا؟"

امجد جاوید نے سلطان راہی کے انداز میں کہا "ایہہ لو، لاء دتی" اور سامنے سلیکشن بورڈ سے ایک مشہور ماڈل کی تصویر اکھاڑ کر زمین پر دے ماری، اور اگلے دن باس نے انہیں شوبز کی بیٹ سے ہٹا کر سیاست میں دے مارا۔

امجد جاوید اتنے پرانے ہیں کہ بعض اوقات آثار قدیمہ کی کوئی شے لگتے ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں بات کر لو تو ان سے کوئی نہ کوئی یاد اللہ نکل ہی آئے گی، ورنہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقع ضرور جڑا ہوگا، مثلاً حسن عباسی کا ذکر ہو تو کہیں گے کہ میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ بابا یحیٰی خان کی بات ہو تو ان کی زنبیل میں دو چار واقعات سے نکل آتے ہیں۔ شوبز کے کچھ لوگوں کو اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ کچھ نہیں تھے۔ آج خود کو کہتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ اصل میں انہیں کسی سے بھی ہونے والی پہلی ملاقات بہت یاد رہتی ہے۔ اسی لیے سب سے پہلی ملاقات ہی کرتے ہیں

امجد جاوید زمانہ شناس ہیں یہ الگ بات کہ زمانہ، زمان خان کی بیگم کو کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں ان پر مرتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی خیال لڑکیوں کا ان کے بارے میں ہے۔ موصوف دوسری شادی کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں بیگم سے وعدہ کیا ہے کہ دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا۔ البتہ تیسری ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ سگریٹ دبا کے پیتے ہیں اور اتنے پیتے ہیں کہ اگر ریکارڈ رکھتے تو آج گینز بک ورلڈ ریکارڈ میں ان کا نام ہوتا۔ سگریٹ کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں جبکہ محبوب کو سگریٹ سمجھتے ہیں۔ میں اس وقت حیرت زدہ رہ گیا کہ گل نوخیز اختر جو خود سگریٹ مانگ کر پیتے ہیں، امجد جاوید کو پورا پیکٹ منگوا کر پیش کیا۔ ان کے اکثر ناول عشق اور تصوف کے گرد گھومتے ہیں لوگ سمجھتے ہیں، یہ ناول جس نے لکھے ہیں وہ کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہوگا۔ ہمارے دوست "ب" المعروف شاہ صاحب کا کہنا ہے یہ بندہ ٹوٹا تو کئی دفعہ ہوگا، ہسپتال بھی رہا ہے لیکن اسے آج تک کسی سے پیار نہیں ہوا، یہ صرف دوستی کرتے ہیں، پیار بڑھاپے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ انہیں بڑھاپے میں پیار عطا کرے اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ جس سے انہیں پیار ہو اس کا پوتا ان دونوں کی شادی پر راضی ہو جائے۔

# گدھا

تحریر: سید ظفر کاظمی

**گدھا** ایک متنازع شخصیت ہے۔ کچھ ممالک میں اسے نہایت عقلمند اور کچھ میں نہایت بے وقوف تصور کیا جاتا ہے۔ اور کچھ اس معاملے میں خاموش ہیں کیونکہ وہ ابھی مکمل طور پر گدھے کو سمجھ نہیں پائے۔ گدھا نہایت بردبار ہے، مشرق میں عموماً اسے بردباری کی بناء پر بھی بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

کوئی کچھ سمجھے لیکن گدھے کی اہمیت مسلم ہے اور اب تو جب

سے اسے کھایا جانے لگا ہے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کئی اقوام تو پہلے بھی اس کے گوشت سے مستفید ہو رہی ہیں لیکن اب بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنے والے گدھا قصابیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں عام طور پر مال برداری کے لئے گھروں اور ڈھوکوں پر گدھیاں پالی جاتی ہیں جب کہ ریہڑوں میں گدھے جوتے جاتے ہیں۔ کراچی میں تو ان کی دوڑ کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک زمیندار دوست جو بہت سادہ مزاج اور غصیلے ہیں اپنی گدھی سے ناراض رہتے ہیں کیونکہ وہ اکثر انہیں دولتیاں جھاڑتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے کہ پیر جی اب کسی دن میں اسے اتنی دولتیاں جھاڑوں گا کہ وہ آیندہ ایسا نہیں کرے گی۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ وہ حیوان لوگ ہیں اور آپ انسان، کچھ فرق تو ہونا چاہئے ایک کتا اگر آپ پر بھونکے یا آپ کو کاٹے تو کیا آپ بھی اس پر بھونکیں گے یا اسے کاٹیں گے یا اگر کوئی بیل آپ کو ٹکر مارے تو کیا آپ اس کو ٹکر ماریں گے اسی طرح لاتیں مارنے سے انسان اور گدھے کا فرق ختم ہو جائے گا اور آپ اصولاً گدھا برادری میں شامل ہو جائیں گے۔ بات انکی سمجھ میں آ گئی۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ کوئی غلط قدم اٹھانے کے بجائے آپ یہ گدھی بیچ کر کوئی اور اچھی گدھی لے آئیں۔

اسٹوڈینٹ کے ہاتھوں میں اب کاپی قلم کتاب نہیں
موبائیل پر باتیں کرتے صرف لور ہیں کالج میں
(احمد علوی)

اطباء نے اس کے عجیب فوائد اور نقصانات بیان کئے ہیں.
جالینوس کے مطابق اسکا گوشت دیر ہضم اور خراب خون پیدا کرنے کا باعث ہے اسلئے جو کھائے سواس پر تحقیہ کرتا رہے. ثابت ہوا کہ گدھے اس دور میں بھی کھائے جاتے تھے.
کچھ کے نزدیک اس کا شوربہ گنٹھیا کا علاج ہے. سحر میں اس کے کھر کا چھلا مرگی کو مفید ہے
لیکن ویدوں کے مطابق مزے میں شیریں ہے اور اعضاء کو بے حد قوت دیتا ہے. باتیں تو سب درست ہوں گی لیکن فکر اس بات کی ہے کہ کہیں اس طاقتور گوشت سے راسپوٹین جیسے انسان نہ پیدا ہونے لگیں۔

گدھی کا دودھ بہت سے امراض بالخصوص کالی کھانسی کے لئے بہت مفید ہے لیکن ان معلومات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اب دودھ میں گدھیانہ دودھ کی ملاوٹ شروع ہوجائے۔
ایک دوست فرما رہے تھے کہ خرچہ لفظ بھی خر سے ہے اور خربوزہ بھی گدھے پر لانے کی بنا پر خربوزہ بنا. ہم ماہر لسانیات تو نہیں کہ اس پر کوئی رائے قائم کریں لیکن خرگوش کو دیکھ کر ہم گدھے کی برتری کے قائل ہوگئے ہیں. جس نے اس غریب جانور کی پہچان ہی مٹا کر رکھ دی. واضح ہو کہ ہمارا یہ مضمون نہ گدھوں کے خلاف ہے نہ گدھا خوروں کی حمائت میں ہے۔
دروغ برگردنِ راوی و چناب

# قیامت کا نامہ

تحریر: راشد حمزہ

**چچا** عبدالرحمٰن کی بیوی روٹھ کر میکے گئی تھی، عبدالرحمٰن نے بہت منت ساجت کی لیکن وہ نہ مانی، موصوف میرے دوست "لیاقت" کے چچا ہیں، مجھ کو ایک شرارت سوجھی، فوراً سے پیشتر "لیاقت" سے مشورہ لیا، اسے بھی میری شرارت بے حد پسند آئی، ہمارا مقصد نیک تھا کہ یا تو چاچی جواباً خلع نامے کے لئے عدالت کا سمن بھجوائے گی یا واپس آجائے گی، اس زمانے میں ہم کو طلاق اتنا بڑا سانحہ نہیں لگتا تھا، سو ہم اِس فیصلے پر متفق ہوگئے کہ چاچی کو چاچا کی طرف سے خط لکھ کر پوسٹ کردیتے ہیں، ہم

نے خط کچھ ایسا لکھا تھا:

تسلیمات!

صد ہزار بوسے پڑوسن کے گال گلنار پر
صد ہزار سلوٹیں آپ کے ماتھائے پریشاں پر

گزشتہ روز پیام بر آپ کا نامہ لایا، نامہ ملتے ہی میں فدوی خوشی سے دو من ہوگیا، خوشی اِس بات کی تھی کہ آپ نہ آئی آپ کا نامہ آیا، آپ نہیں جانتیں کہ آپ کے بغیر زندگی کتنی سہل، پُرآسائش اور پُرسکون گزر رہی ہے، خط کھول کر پڑھا تو خوشی دوگنی چوگنی ہوگئی، قریب تھا خوشی سے پاگل ہوجاتا مگر اسی اثنا میں "کمینہ ناصر" آ گیا، اس نے میرا پاگل ہونے کا ارادہ زبردستی کینسل کروایا اور ایک رنگین پیشکش کردی۔

خط میں آپ نے اِس وجہ سے جلد گھر لوٹنے سے معذوری ظاہر کردی ہے کہ میری ساس کے بالوں میں جوؤں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور سر کو خارش کی بیماری لگی ہے، آپ نے انتہائی مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک گھڑی امی کے بالوں سے جوئیں نکالنے میں بیت جاتی ہے تو دوسری گھڑی "دادا" کی کھال کھردری لکڑی سے کھجلانے میں، یعنی آپ کو گھڑیوں کے

معاملے میں خاصی فضول خرچی کرنی پڑتی ہے۔ خیر، یقین کیجئے میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اپنے سسر، ساس اور آپ کیلئے یہ دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ سسر کی خارش ساس کے بالوں کی جوئیں اور آپ کی مصروفیات میں یونہی دن دوگنی رات چوگنی ترقی ترقی فرمائے۔

دو شنبے کو ناصر نے پڑوسن ''صغراں'' کے ساتھ ایک ملاقات طے کر رکھی ہے، ملاقات جناح باغ میں شہتوت کے بڑے درخت کے نیچے شام ڈھلے ہوگی، ملاقات کا مقصد ''صغراں'' کو محبت کے اسرار و رموز سکھانا اور درِ عشق سے آشنا کرانا ہے، کمینے ناصر کے بارے میں پریشان یا مشکوک ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، وہ اِتنا بھی کمینہ نہیں کہ آپ کی بھابھی کو ہی دھوکہ دینے پر تُل جائے، میرے ضمن میں تو آپ ویسے بھی انتہائی شکی واقع ہوئی ہیں، سو اس وقوعۂ وصال پر شک ترقی کر کے یقین میں بدل بھی گیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ملاقات کا سپانسر میں ہوں، حالانکہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں، وہ تو ناصر نے الماری میں آپ کا پرس دیکھا، ہم نے اسے نکالا، اس وقت میری پریشانی کی انتہا نہ رہی جب دیکھا پرس کو بھی کوڈز کے ذریعے لاک کیا گیا ہے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، ناصر کا تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ سدا کا کمینہ ہے اور ساتھ ایول جینئس قسم کا میکینک بھی، ظالم نے چاقو کی مدد سے آپ کے پرس کی پیٹ چیر کر کے اس میں سے میرے پچھلے مہینے کی تنخواہ جو آپ نے اغوا کر رکھی تھی برآمد کر دی۔

جناح باغ میں صغراں کو عشق محبت کے اسرار رموز سکھانے پر گھنٹہ صرف کرنے کے بعد تینوں چڑیا گھر چلے جائیں گے، وہاں جانے کا مقصد کمینے کی بیوی، آپ کی، اور میری ساس اور سسر غیر محترم کے شبیہوں کی زیارت کر کے اُن پر لعن طعن کرنا ہے، زیارت سے فارغ ہو کر مال روڈ پر مٹر گشت کرنے نکلیں گے، وہاں شاپنگ مالز سے ''صغراں'' کیلئے کچھ اشیائے ضروریہ و خصوصیہ خریدیں گے، رات گئے تک یہ خرمستیاں اور مٹر گشت جاری رہے گی، پھر المشہور لاہور ہوٹل کھانا کھانے جائیں گے، صغراں کی کب سے خواہش ہے کہ وہاں ایک دن کھانا کھا آئیں۔

میرے لئے پریشان مت ہویئے گا، آپ نے قربانی کا جو گوشت اگلے سال تک کے لئے سوکھا کر رکھا تھا ہم اس کے علاوہ کچھ اور کھاتے ہی نہیں، ''ناصر کمینے'' کی تو پسندیدہ غذا ہی گوشت ہے، آپ کو یاد تو ہوگا جب سکول کے زمانے میں ہم نے اسے بلی کھلائی تھی اور اُس نے اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ وہ گوشت پر جان تک دے سکتا ہے اوپر سے بھابھی کے ہاتھوں بنے دیسی چٹخارے دار مصالحے لگانے سے گوشت ایسا ذائقہ لاتا ہے جس کو نام دینا مشکل ہے۔ وہ گھر سے وہی چٹخارے دار مصالحے لاتا ہے اور طرح طرح کے کھانے پکاتا ہے، ''کمینے'' کی ایک یہی خوبی مجھے بے حد پسند ہے کہ ظالم آپ کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کھانے پکاتا ہے کہ دل بے اختیار اُس کے حق میں دعائیں کرنے کو چاہتا ہے آپ کے واپس نہ آنے کے لئے، میری اور آپ کی دوری میں ''کمینے'' کے ہاتھوں بنے کھانے، بھابھی کے ہاتھوں بنے مصالحے کا بہت زیادہ ہاتھ ہے، اب آپ اس ''کمینے'' کو اپنی سوکن سمجھیں یا کچھ اور یہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

''کمینے ناصر'' نے آپ کو ایک عدد دھمکی دی ہے کہ اگر اپنی بھابھی سے میری شکایت لگا دی، تو ''حمزے'' کا ''سمبلاں'' سے شادی کر کے رہوں گا، صغریٰ کے بارے میں اس نے محتاط رویہ اپنا رکھا ہے، کہتا ہے جب کوئی رشتہ نہ ہو تو پھر رشتے ٹوٹنے کا کیا سوال، اِسی لئے ''صغراں'' سے ہمارا تعلق پڑوسیوں والا رہے گا، بس آخری دعا کے ساتھ لکھنا ختم کر رہا ہوں، صغراں کی کال آ رہی ہے۔

آخر میں ڈھیر سارا پیار اور آپ کی پڑوسن کے لئے یہ دعا کہ خدا تعالیٰ آپ کی پڑوسن کو یونہی مہوش، گلرخ، گلنار، مہ کامل، کومل اور کنول رکھے اور آپ کو جوئیں نکالنے اور اور سسر جی کے کھال کھجانے میں مصروف رکھے۔۔۔آمین۔

آپ کا شوہر نامدار، صغراں و ناصر کا یار

اس خط کے بعد چاچی خونبار آنکھوں اور اژدھے کی طرح

شعلہ دہن کے ساتھ واپس آ کر چاچا کی جو حالت بنائی تھی وہ بیان کرنے کے قابل نہیں، وہ پانچ دن تک نماز چارپائی میں اشاروں سے پڑھتے تھے، اس وقت تک کی زندگی میں ہم نے ایسا پُر لطف منظر نہیں دیکھا تھا، "لیاقت" کی چاچا سے نہیں بنتی تھی جب تک وہ بمع طعام چارپائی پر قیام پذیر رہے، لیاقت خوب خوش باش رہا۔

# اور گالیاں دو!

تحریر: وسیم گل

**ہم** پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے اور ہمارے انگلش کے استادِ محترم اشرف صاحب ہوا کرتے تھے۔۔۔ اللہ بخشے۔۔۔ اس دور کے اساتذہ کی طرح سخت محنت پر یقین رکھنے والے تھے۔۔۔ ہمارے علاقے کے کئی لڑکے اسی مضمون انگریزی کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا کرتے تھے 'جو رہ جاتے وہ بھی تنگ ہی رہا کرتے۔ سلیم یعنی "مونو" بھی اُنہی لڑکوں میں سے ایک تھا جو ہم سے ایک 'دو جماعتیں آگے تھا۔

ایک روز کیا ہوا کہ مونو نے ہمارے ایک ہم جماعت الیاس سے گپ شپ لگاتے ہوئے اشرف صاحب کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

حسب توقع اگلے روز انگریزی کی کلاس میں الیاس کھڑا ہوا اور اشرف صاحب کو بتایا کہ:

"استاد جی! مونو آپ کو گالیاں دے رہا تھا۔۔۔"

اشرف صاحب نے کہا اچھا؟؟؟ وہ چلتے ہوئے کلاس کے آخری بینچ تک آئے۔۔۔ الیاس کے چہرے پر کچھ پا لینے یعنی اپنے استاد کی قربت پا لینے کی خوشی کا تاثرات واضح تھے، واضح رہے کہ میں اکثر کلاس کے کسی آخری کونے میں بیٹھنے کو پسند کرتا تھا اور الیاس بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا کرتا تھا۔۔۔ خیر اشرف صاحب ہمارے بینچ کے پاس آئے اور ہمارے ہی بینچ کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ نکالی جو اکثر ہم چار یا پانچ لوگ اڑا کر رکھتے تھے اور اکثر جب کوئی دوست اپنے خیالوں میں مگن ہوتا تو وہ ٹانگ نیچے سے کھینچ کر اسے گرا دیتے تھے، اشرف صاحب نے جب ٹانگ نکالی تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ اور پھر۔۔۔

اشرف صاحب نے بینچ کی ٹانگ، جو کم و بیش ہم دوستوں کی ٹانگ جتنی ہی موٹی تھی۔۔۔ اس سے الیاس کے "پلستر پٹ" دیے۔ الیاس کی فریادیں شاید ساتویں آسمان تک جا رہی ہوں گی۔۔۔ جب استاد جی نے "رج" کے الیاس کی دھلائی کر لی تو بینچ کی ٹانگ پھینکتے ہوئے بڑے سکون فرمایا۔

"مونو کو کہنا... اور گالیاں دے۔۔۔"

# کھوتی

تحریر: عامر راہداری

آج کل ہمارے ملک میں کھوتی کا خوب چرچا ہے کھوتی اتنی مشہور ہوچکی ہے کہ ٹیلی ویژن پر اتنا نام سیاست دانوں کا نہیں چلتا جتنا کھوتی کا چلتا ہے یقین نہیں آتا تو کوئی بھی چینل لگا کر دیکھ لیں۔ اس مشہوری کی وجہ کھوتی کا غذاؤں میں استعمال ہونا ہے ویسے تو کھوتی بریانی بھی کافی مشہور ہے لیکن زیادہ تر کھوتیاں قیمے والے نانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کھوتی پکڑنا ایک محنت طلب اور مشکل کام ہے لیکن محترمہ عائشہ ممتاز نے پکڑ پکڑ کے کھوتی اور "کھوتوں" کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ کھوتی پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھوتی ہی ہیں۔ کھوتی کو اردو میں گدھی اور انگلش میں ڈنکی اور پشاور میں بہت کچھ کہتے ہیں۔ کھوتی کی دولتیاں لگنے سے کافی چوٹ لگتی ہے۔ شاید اسی لئے "ڈنکے کی چوٹ" والا محاورہ معرض وجود میں آیا۔ کھوتی دنیا کا سب سے مظلوم جانور ہے۔ جتنا کام کھوتی سے لیا جاتا ہے اگر اتنا کام سیاستدان کرتے تو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا۔ کھوتی دیہاتوں کا قومی جانور ہے۔ دیہات میں اگر کھوتی نہ ہوتی تو دیہات نہ ہوتے۔ کھوتی سے مختلف کام لئے جاتے ہیں، بلکہ صرف کام ہی لئے جاتے ہیں۔ کھوتی کے اہم کاموں میں ریڑھی کھینچنا، چارا، لانا، آٹا پسوانا وغیرہ شامل ہیں۔ کھوتی کی پیداوار پاکستان میں باقی ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اگر پاکستان صرف کھوتی کی برآمد شروع کردے تو ملک دن دگنی رات چگنی ترقی کرسکتا ہے۔ کھوتی اور جمہوریت میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے، فرق ہے تو بس اتنا کہ کھوتی ڈنڈا لگنے پر چل پڑتی ہے۔ کھوتی کا واحد سودمند استعمال گالی میں کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ میاں کھوتی پیدا نہ کرتے تو دنیا ایک قیمتی گالی سے محروم رہ جاتی۔ کھوتی کافی ڈھیٹ ہوتی ہے کھوتی کی "ڈھیٹ نیس" کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے کہ کھوتی ہمارے سیاستدانوں سے صرف 10 فیصد کم ڈھیٹ ہوتی ہے۔ کھوتی کے پاس واحد ہتھیار دولتی ہوتی ہے، کھوتی اپنی دولتی کا استعمال خوب سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کھوتی کی دو آنکھیں پیچھے کی طرف بھی ہوتی ہیں کیونکہ کھوتی اپنی دولتی مرد کے "انڈر گراونڈ سسٹم" پر ایسے مارتی ہے کہ بغیر دیکھے ایسا نشانہ ناممکن ہے۔ کھوتی کی کھال بہت مضبوط ہوتی ہے لیکن لوگ صرف ضد کی وجہ سے کھال کا کچھ نہیں بناتے۔

# رودادِ محبت کیا کہئیے

تحریر: طاہر محمود

پیارے سنگی محمد شفیق احمد

تم حیران تو ہو رہے ہو گے، کہ میرے جگہ کالج میں خط پہنچ گیا؟ بھائی بات یہ ہے کہ ایک پاؤ ہلدی جملہ اندرونی و بیرونی زخموں پہ لگا کے کالج آنا بہت مشکل تھا. وہ کیا ہے کہ وقارالنسا کالج والی سمجھی کہ شاید اس کی مہندی ہے اور ہمارے عشق کی دورانِ سفر رحلت ہو جاتی؛ اب سنو کہ مجھ غریب کے ساتھ ہوا کیا۔۔۔

پچھلی اتوار کو دن، لگ بھگ گیارہ بجے، میں چھت پر چٹائی بچھائے، سردیوں کی دھوپ سینک رہا تھا، اور کینوؤں کے رس سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ دفعتاً کیا ہوا کہ وہ حسینۂ دلنواز نمودار ہوئی، آتے ہی اپنی زلفوں سے رس کی بوندیں جھٹک کر، انھیں سکھانے لگی؛ قیام، رکوع، قیام؛ پھر رکوع؛ قیامت۔ زمیں گردش میں آ گئی. میں لڑھک کر ریلنگ پہ آ گیا، کہنیوں ٹکا کر کھڑا ہو رہا تھا کہ ایسے میں، اس کی نگہ مجھ پہ پڑی، کیا دل نواز مسکراہٹ تھی؛ اُس نے یکبارگی بالوں کو گول گھمایا اور میرے دل کو لٹو بنا کر چلی گئی۔ سنگیا، ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دل کو کاغذ پر منتقل کر دیا؛

"نہ جھٹکو زلف سے پانی یہ موتی ٹوٹ جائیں گے"

پھر یہ "اے پھولوں کی رانی بہاروں کی ملکہ"

اور بھی بہت کچھ جس کی تفصیل یہاں مناسب نہیں، اس کے بعد، اس محبت نامے کو، ایک چھوٹے سے پتھر پر لپیٹ کر اس کو ہوا کے سپرد کر دیا۔ اس لمحے جب اس محبت کے سکائے لیب نے لینڈ کرنا تھا، ایک زوردار ٹن کی آواز آئی، ہمارا خط اس کی چھت پر پڑی آٹا گوندھنے والی ترامی (پرات) میں لینڈ کر چکا تھا۔۔۔ وقت تھم گیا، اس ٹھہرے ہوئے وقت میں دیکھا، نیلے امبر پر لہراتی ہوئی پتنگیں ہیں، پتنگوں کے پیچ لڑاتے ہوئے، بچوں کا غوغا، اس فتنہ گر کی چھت پر ہمارے روحانی باپ بلکہ یوں کہو "متوقع

سسر" یوں ظاہر ہوئے، جیسے کوئی ان کی پتنگ چینگ کر کے لے اڑا ہے اور وہ پتنگ واپس لینے آئے ہیں۔ میاں ہم انجان بنے آسمان پہ ڈولتی پتنگوں کو تکنے لگے، گویا ہمارا دل بنا کسی سہارے کے ڈول رہا ہے۔ کانوں میں گٹ مٹ مکالمہ، بڈھا پرندے کے امکان کو مسترد کر رہا تھا؛ میں فوراً بھاگ کر نیچے گیا کہ یہ منحوس بڈھا ترس کھائے گا یا اباجی کو بتائے گا۔ وہ تو شکر ہے، اباجان گھر پر نہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھاک بڈھا تمھارا تصنیف شدہ پریم پتر، بمع پتھر، ہمارے دروارد ہوا۔

بھابھی، باؤ رؤف کدھر ہیں؟

امی جان نے پوچھا۔۔۔خیریت؟

انہاں نال کم سی. آخر تے ماں دسیو! (ان سے کام ہے،

حسیات جاگیں؛ نانی اماں کی آواز آرہی تھی, رؤف اپنڑا اپتر اای کہ منگی کہ آنداای؟ (کیوں رؤف، اپنا ہی بیٹا ہے یا مانگ کر لائے ہو؟) اور تمام کائنات میں ہلدی کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی؛

اب اور نہیں لکھا جاتا کہ ڈکار بھی ہلدی کے آرہے ہیں؛
کل چکر لگانا کالج کے بعد, آئے ہائے۔

خیر اندیش طاہر

# دانشور

تحریر: اعظم نصر

پہلے تو صرف مجھے اندازہ ہی تھا کہ دانشور اُن پڑھے لکھے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ڈکشنری کی مدد سے بڑے بڑے لوگوں کی مشکل مشکل لفظوں والی گہری گہری باتوں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں، پھر ڈکشنری کی مدد سے ہی اِن مشکل مشکل لفظوں والی باتوں کو آسان آسان لفظوں میں دوبارہ لکھ دیتے ہیں تا کہ اِن مشکل باتوں کو وہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکیں جن کے پاس ڈکشنری نہیں ہوتی، دانشور مل جل کر کام کرتے ہیں اور کسی بھی شخصیت کا انتخاب کر کے اس کی باتوں میں خوبیاں اور خامیاں تلاش کرنے کا کام آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔کام کے پکے ہوتے ہیں۔کسی بھی کام میں کوئی بھی خامی یا خوبی تلاش کر لیں تو اپنے موقف پر یوں ڈٹ جاتے ہیں کہ تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔کبھی کبھی تو ایک کتاب کو سمجھانے کے لئے چار چار پانچ پانچ کتابیں بھی لکھ دیتے ہیں۔یہ کتابیں کالجوں اور یونیورسٹی کے طالبعلموں کو کی بکس کے طور پر الگ سے پڑھنا پڑھتی ہیں۔ امتحانات کی تیاری کے لئے تیار کئے جانے والے نوٹس بھی اصل میں اُنہیں کتابوں کا خلاصہ ہوتے ہیں۔گمانِ غالب ہے کہ ان کتابوں کی وجہ سے پروفیسر حضرات کی ڈیوٹی بھی کافی آسان ہو جاتی ہے۔مگر اب تو مجھے مکمل یقین ہو چکا ہے کہ دانشور وہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں جو بڑے بڑے لوگوں کی گہری گہری باتوں کی تہہ تک پہنچ کر عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آنے والی اُن باتوں کا مطلب نکالتے ہیں تا کہ عام لوگوں کو بھی ان گہری گہری باتوں کا مطلب سمجھ میں آسکے۔اب تو میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ اگرچہ سبھی دانشور بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں مگر مطلب اپنی اپنی مرضی کا ہی نکال کر لاتے ہیں اور اپنی اپنی مرضی کے لوگوں کو ہی سمجھاتے ہیں۔کچھ دانشور تو ایسے محنتی بھی ہوتے ہیں کہ بات کی تہہ تک پہنچ کر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور تہہ میں پہنچ کر بھی مزید کھدائی شروع کر دیتے ہیں تا کہ مزید گہرائی میں جا کر کوئی ایسا مطلب نکالا جا سکے جو پہلے کسی نے نہ نکالا ہو، عام طور پر اسی قسم کے لوگوں کو "نان ڈاکٹر" بھی کہا جاتا ہے۔

اتوار کے دن لاہور میں ایک ادبی حلقے کی طرف سے اقبال کی شخصیت پر بات چیت کے لئے منعقدی ایک اجلاس میں شرکت کا اتفاق ہوا، بڑے بڑے نامور لوگ موجود تھے۔سب سے پہلے ایک معروف دانشور نے اقبال کی خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔زیادہ تر وہی باتیں تھیں جو پہلے بھی کئی بار سُن چکے تھے، مگر تقریر کے آخر میں کچھ خوبیاں ایسی بھی بیان ہوئیں جو پہلی بار سنائی دیں۔انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ موصوف کو بھی ان خوبیوں کا اندازہ کسی تحقیق کے نتیجے میں اسی سال دو چار دن پہلے ہوا ہے۔بات ختم ہوتے ہی ایک اور معروف شخصیت کو اقبال کی خامیاں یاد آگئیں۔ساری کی ساری باتیں نئی تھیں کہ ہم نے سکول کے زمانے میں بھی ان کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی۔خیر باری باری سبھی دانشور اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے اور ہم یہ سوچ کر بیٹھے رہے کہ دانشور لوگ ہیں تھوڑی دیر ایک دوسرے سے بحث کے بعد کسی ایک بات پر متفق ہو ہی جائیں گے مگر شائد اجلاس کا وقت ہی ختم ہو گیا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ دانشور بھی ہوں اور کسی بات پر یکساں رائے بھی قائم نہ کر سکیں۔

# پاکستان اور امریکہ

تحریر:
محمد خلیل الرحمٰن

**پاکستان** دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو نقشے پر کچھ اور ہے، کتابوں میں کچھ اور، حقیقت میں کچھ اور۔ جس کے رہنے والوں میں پاکستانی بہت کم اور سندھی بلوچی پٹھان پنجابی اور مہاجر بہت زیادہ ہیں۔ بعینہٖ پاک امریکہ تعلقات نقشے پر کچھ اور ہیں، اخباری بیانات میں کچھ اور ہیں، پس پردہ کچھ اور۔ پاکستان کی برآمدات: پاکستان کی برآمدات میں جہادی، کپاس، چاول اور گندم بہت نمایاں ہیں۔ دوسرے درجے کی برآمدات میں غیر قانونی تارکین، سوتی کپڑے کی مصنوعات اور چمڑا شامل ہیں۔ دنیا کے بہت سے ممالک نے پاکستان کی مصنوعات پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن پاکستانی جہادی اور غیر قانونی تارکین کی اسمگلنگ ہر وقت جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی دنیا کے ہر خطے میں نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں امریکہ کو سب سے زیادہ خطرہ میکسیکنز اور پاکستانیوں سے ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر امریکہ میں داخلے کے لیے پابندیاں ختم کر دی جائیں تو پاکستان اور میکسیکو ایک گھنٹے کے اندر اندر خالی ہو جائیں گے۔ پاکستانی درآمدات: مشہور پاکستانی درآمدات میں امریکن ڈالر، امریکن سنڈی، یو ایس ایڈ، ریمنڈ ڈیوس اور بلیک واٹر شامل ہیں پاکستانی شہری: پاکستانی شہریوں کی بڑی تعداد مسلمان ہے جن کی دلی خواہش جنت اور امریکن ویزے کا حصول ہے۔ پاکستان کا ہر شہری امریکہ جانے کا خواہش مند ہے۔ ہر دوسرے شہری نے امریکن ویزے کے حصول کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ ہر پانچواں شہری امریکہ کا دورہ کر چکا ہے اور ہر دسویں شہری کے عزیز و اقارب امریکہ میں رہتے ہیں۔ پاکستانی حکومت: امریکن ویزے کا حصول ہمارے سیاسی رہنماؤں کی مجبوری ہے اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں امریکہ کی مخالفت ان کی سیاسی ضرورت، جبکہ اپنے بچوں کو امریکن یونیورسٹیوں سے پڑھوانا، وقت کی ضرورت ہے۔ باہر کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر ان کے بچے غریب پاکستانی عوام کی مجبوریوں کو سمجھنے اور اپنے والد کی پارٹی میں ان کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہم امریکہ سے سخت نفرت کرتے ہیں لیکن امریکن پالیسیوں کی حمایت ہمارا فرضِ عین اور یو ایس ایڈ وصول کرنا فرضِ کفایہ ہے۔ حکمرانوں کی جانب سے یہ ایڈ ہڑپ کر جانے سے یہ فرض سب عوام کی جانب سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔ پاکستان امریکن تعلقات: دنیا کے بیشتر سامراجی ممالک میں امریکہ نے اپنی فوجیں اتاری ہیں لیکن پاکستان کے لیے اس کے ڈرون اور 'ڈو مور' کی دھمکیاں ہی کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے حکمران امریکی آشیرباد محسوس کرتے ہوئے حکمرانی کے جوہر دکھاتے ہیں جبکہ مخالف پارٹیاں اسی کے اشارے پر دھرنے، دھونس اور ریلا ریلی کی پالیسی اپناتی ہیں۔ مخالف اکثر اسے خفیہ پیغامات بھیج رہے ہوتے ہیں کہ ہر تیرگی میں تو نے اتاری ہے اپنی فوج یاں بھی اتر کے آ، کہ سیہ تر ہے یہ بساط یہ رشتہ کیا کہلاتا ہے؟: پاکستانی امریکہ سے محبت/نفرت کرتے ہیں جبکہ امریکن پاکستان سے محبت/نفرت کرتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا یہ رشتہ ہی ان دونوں ممالک کے لازوال تعلق کی بنیاد اور وجہِ تسلسل ہے۔ جب تک امریکہ کی 'عوام دوست' پالیسی موجود ہے امریکہ ہم سے محبت کرتا رہے گا اور جب تک یو ایس ایڈ اور امریکن ویزے موجود ہیں ہم امریکہ سے محبت کرتے رہیں گے۔

# خواب اور انسان کی اوقات

تحریر:
پرنس زریاب شیخ

**انسان** کب اپنی اوقات بھول جائے یہ پتا ہی نہیں لگتا اور جب پتا لگتا ہے تو لگ پتا جاتا ہے، آج کل شادیاں بھی اسی لئے ناکام ہوتی ہیں کیونکہ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد بیوی بولنے لگ جاتی ہے کہ میں تو جس شہزادے کو خوابوں میں دیکھتی تھی آپ ویسے نہیں ہیں اور بس اس شہزادے کے چکر میں لڑ جھگڑ کر بات علیحدگی تک جا پہنچتی ہے، انسان جب سوتا ہے تب بھی اوقات بھول جاتا ہے کیونکہ خوابوں میں ہر غریب کسی نہ کسی ملک کا بادشاہ بن جاتا ہے یا ڈان بن جاتا ہے اور اپنی ساری خواہشیں پوری کر لیتا ہے ایک بار میرے ساتھ بھی ایسا ہوا، کچھ دن پہلے گھر سے دفتر گاڑی میں جاتے ہوئے میرے دل میں تھوڑا سا تکبر آ گیا شاید یہ بات اللہ کو بری لگی اور گاڑی پنکچر ہو گئی، پہلے پہل تو سوچا کہ ڈرائیور پر غصہ اتاروں کیونکہ وہ کھڈوں پر بھی بے دھیانی سے چلاتا ہے جیسے اس کے ابا جی کی گاڑی ہو خیر وہ پہیہ تبدیل کرنے میں لگ گیا اور میں کھڑکی سے باہر کی دنیا دیکھنے میں مگن ہو گیا جب موٹر سائیکل اور پیدل چلنے والوں کو دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ افسوس بے چارے میری طرح شاہانہ انداز میں سفر نہیں کر سکتے ایک نوجوان کو دیکھا وہ سڑک کے ساتھ بنی گرین بیلٹ میں گھاس پر ننگے پیر چل رہا تھا ایک دم سے آنسو نکل آئے کہ کاش میرے پاس جوتے ہوتے تو اس کو دے دیتا ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا تو دیکھا کہ نوجوان تو باغ میں جاگنگ کرنے آیا ہے اور شبنم کی گیلی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پیر چل کر شبنم کے مزے لے رہا ہے اور میں کچھ اور سمجھ بیٹھا تھا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ پہلی نظر میں ہونے والی محبت کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، پھر میری نظر بس سٹاپ پر کھڑی ایک لڑکی پر پڑی، خیالوں میں کھونے ہی والا تھا کہ کانوں میں آواز گونجی "سنیئے" میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی پتہ نہیں ایسا کیا ہوا ہے کہ شادی کے بعد جب بھی کسی نامحرم لڑکی پر اچانک نظر پڑ کر ٹکنے لگتی ہے تو کانوں میں "سنیئے" کی آواز گونجتی ہے جو مجھے دوسری نظر پڑنے نہیں دیتی، اُنہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ڈرائیور نے ٹائر بدل دیا اور دفتر کی جانب سفر شروع ہوا، میں ہمیشہ دفتر لیٹ پہنچتا تھا اور کبھی شرمندگی محسوس نہیں کی لیکن آج میرا ضمیر ملامت کر رہا تھا کیونکہ میں وقت سے پہلے پہنچنے والا تھا وہاں جا کر جب سب مجھے حیرت سے دیکھیں گے تو کتنی سبکی ہو گی یہ سوچ کر ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، میں بچپن سے ہی ماں باپ کا بہت فرمانبردار تھا وہ جو کہتے تھے میں ہمیشہ اس کا الٹ ہی کرتا تھا وہ میری حرکتیں دیکھ کر کہا کرتے تھے یہ تو نکما ہے کچھ بھی نہیں کر سکے گا لیکن میں نے اس کے الٹ کیا اور اس قابل ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ کر کے زندگی گزار سکوں اچانک گاڑی نے بریک لگائیں اور کنڈکٹر بولا سمن آباد والے اتر جائیں اور میں وہاں سے اتر کر اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔

اور تو ان سے کچھ نہیں ہوتا   شادیاں چار چار کرتے ہیں   (اسد جعفری)

# یہ نامے

قہقہے ہی قہقہے ہیں ہر طرف
آ گیا ہے ارمغان ابتسام

پڑ گئے ہیں پیٹ میں بل، ظلم یہ
ڈھا گیا ہے ارمغان ابتسام

جب پڑی پہلی نظر اس پر مری
بھا گیا ہے ارمغان ابتسام

ہے تری ہی جانفشانی یہ نوید
چھا گیا ہے ارمغان ابتسام

**انجینئر عتیق الرحمٰن**

آپ کے پیشِ نظر ہے ارمغانِ ابتسام
کرتا ہے سب کو ہنسانے کا جو اس میں اہتمام

کھیل بچوں کا نہیں ہے اس زمانے میں ہنسی
مستحق ہیں داد کے وہ کر رہے ہیں جو یہ کام

آپ بھی این زیڈ کیانی کو مبارکباد دیں
ہنستے ہنستے دے رہے ہیں سرخوشی کا جو پیام

کر رہی ہیں روح کو سرشار اُن کی کاوشیں
شائع کرنا اِک رسالہ ہے بہت دشوار کام

ایک لمحے کی ہنسی اس دور میں انمول ہے
آج عصری کرب سے ہے نیند لوگوں کی حرام

**احمد علی برقی اعظمی**

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ